اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کے نظام معاشی کا مکمل خاکہ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کے تمام
اقتصادی و معاشی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے
سرمایہ و محنت کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے

تالیف

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

ترتیب جدید، تسہیل، تبویب، تخریج

پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

سابق استاذ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
سابق ممبر قومی اسمبلی

شیخ الہند اکیڈمی کراچی

0321-9297268

فہرست مضامین

باب ــــ ⑤ ۲۲۷

اجتماعی معاشی نظام ۲۲۷

باب ــــ ⑦ ۳۲۴

وسائلِ معیشت کی توسیع ۳۲۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم الکتاب

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین، محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین.

"اسلام کا اقتصادی نظام" کا نام آتے ہی انسان کا ذہن فوراً ان معاشی مسائل اور پریشانیوں کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے جنہوں نے اس ناتواں انسان کو روزِ اول سے ہی گھیرا ہوا ہے۔ جن کا حل اور علاج سوچتے اور کرتے اس کی زندگی گزر گئی، اور باقی گزر رہی ہے۔ مگر معاشی مسائل کی گتھی سلجھی نہیں مزید الجھی ضرور ہے یہ معاشی ناہمواریاں، دولت اور وسائلِ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، طبقاتی معاشی کشمکش، غربت اور امارت کا غیر فطرتی تفاوت وغیرہا کے حل اور دنیا کو پرامن جگہ بنانے کے لیے انسانی کاوش نے مثبت طرق (Positive Means) کے ساتھ ساتھ بارہا منفی ذرائع (Negative Ways) مثلاً لوٹ مار، جنگ و جدل اور نتیجۃً خونی انقلابات کا راستہ بھی اختیار کیا، مگر معاشی مسائل کی گھمبیرتا ہر بار پہلے سے زیادہ بھیانک صورت میں سامنے آئی۔ اور معاشی مسائل کے حل کی جدوجہد نے معاشی دہشت گردی کا روپ دھار لیا جس کی واضح مثال کارل مارکس (۱۸۱۸ء ـــــ ۱۸۸۳ء) کا نظریہ کمیونزم کی عملی شکل میں سامنے آئی جو اپنے غیر فطرتی وجود کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور اپنی موت مر گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام معاشی استحصال کا ایک ذریعہ تھا جس نے معاشی عدم مساوات، معاشی دست و برد، دولت اور ذرائع دولت کے ارتکاز، معاشی وسائل کے اکتناز، تجارتی اور پیداواری سرگرمیوں کے احتکار کی حوصلہ افزائی کی، طبقاتی کشمکش کو پروان چڑھایا، اور دنیا کو واضح طور پر امیر اور غریب دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ جہاں امیر ظالم، غریبوں کا ناحق خون کرنے والا، منافق اور معاشی ڈاکو ہو کر بھی قابلِ احترام و اکرام اور لائق وقار و اقتدار ہے، اور غریب اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود مظلوم و

مقہور اور محکوم و ذلیل ہے۔ لہذا طبقاتی نفرت (Class Hatred) کا بیج اگ کر تناور گھنا درخت بن گیا ہے۔ جو اپنی نحوست کے ساتھ پوری دنیا پر سایہ فگن ہے۔ غریب، کمزور اور محنت کش طبقہ کی معاشی مشکلات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور امیر طبقہ کی آسائشات تعیشات کا مقام لے چکی ہیں، معاشی ناہمواریوں کا یہ عالم کہ ایک طرف زرق برق قیمتی لباس اور دوسری طرف پیوند زدہ پیرہن، ایک طرف پر تعیش رنگا رنگ ماکولات و مشروبات اور دوسری طرف آتش شکم کی آنچ ٹھنڈی کرنے کا سامان تک میسر نہیں، ایک طرف جدید ترین ماڈل کی قیمتی گاڑیاں اور دوسری طرف فٹ پاتھ پر پیدل چلتے ہوئے بھی دھکے، ایک طرف یونین کونسل سے لے کر سینٹ (Senate) تک دولت مندوں کا حق نمائندگی اور انہی وڈیروں کا راج (Plutocracy) اور دوسری طرف انہی چنیدہ (Elected) وڈیروں کے ڈیروں میں غریب ووٹران (Voters) کی ذلت و رسوائی، ایک طرف اسلام آباد، لاہور، کراچی جیسے شہروں کے پوش علاقوں میں کئی کئی ایکڑ پر مشتمل کوٹھیاں اور بنگلے اور دوسری طرف غرباء کی آبادیوں (Slums) میں دس بارہ افراد کے کنبہ کا ایک چھوٹا سا مکان، جس کی چار دیواری میں سو سو خم، ایک طرف بنکوں میں پڑے فاضل سرمایہ کے مصرف (Consumption) کا وقت نہیں آتا، اور دوسری طرف جوان بیٹی کے لیے رشتہ نہیں ملتا کہ غریب والدین کے پاس اس غریب کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے روپیہ نہیں، اور تعلیم کے متوالے غریب لڑکے کے لیے فیس کی رقم نہیں۔ ایک طرف وڈیروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اراضی سینکڑوں مربعوں پر محیط اور دوسری طرف غریب کسان کو اپنے کنبہ کی کفالت کے لیے مزارعت پر بھی ٹکڑا زمین میسر نہیں۔ ایک طرف غریب کسانوں کی پیدا کردہ روئی سے سرمایہ دار کی ٹیکسٹائل ملز (Textile Mills) میں کپڑوں کے تھانوں کا انبار اور دوسری طرف اس غریب کی بیٹی کا دوپٹہ تار تار۔ ایک طرف وڈیروں کے گھر پر اناج اور نقد آور فصل کی پیداوار کا ڈھیر، اور دوسری طرف غریب کسان کے کھیت میں بھوک اور مفلسی اُگے۔ ستم ہے کہ غلہ اگانے والا غلہ کا محتاج ہے۔ روئی اگا کر ملوں کو

چلانے والا لباس کو ترسے، شاہرائیں بنانے والا شاہراہ پر اپنی ٹوٹی سائیکل چلانے یا آزادانہ پیدل چلنے کی آرزو بھی پوری نہ کر سکے۔

شاہرائیں اس واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان سے دیش کی جنتا سسک کے مرے؟
زمین نے اس کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک کے مرے
ملیں اس لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں؟
چمن کو اس لیے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں؟

درحقیقت یہ ساری معاشی ناانصافیاں، معاشی استحصال، معاشی طبقاتی کشمکش، اور معاشی محرومیاں سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی ناجائز و نافرمانبر دار اولاد ہیں، جنہوں نے پوری دنیا کا معاشی فلاح کا خواب چکنا چور کر کے انسانوں کی غالب اکثریت (Overwhelming Majority) کو افلاس اور محتاجی کے منحوس چکر (Vicious Circle of Poverty and Need) میں پھنسا دیا ہے، جس سے نکلنے کا راستہ سرمایہ دارانہ نظام کے پاس نہیں ہے جس کا منہ بولتا ثبوت (Unequivocal Proof) موجودہ عالمی معاشی بحران ہے جس نے امریکہ ایسی نام نہاد سپر پاور کی معیشت کی بھی چولیں ہلا دی ہیں۔

"اسلام کا اقتصادی نظام" کی بنیاد ہی اللہ کریم کے رب (Provision Supplier) ہونے کے اعلان پر رکھی گئی، اللہ کریم نے اپنے پروردگار (Sustainer) ہونے کا اعلان اپنی نازل فرمودہ آخری کتاب قرآن کریم کی پہلی سورہ (Part) کی پہلی ہی آیت (Verse) میں یوں فرمایا:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝۲﴾[۱]

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کریم کو زیبا ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

پھر اپنی ربوبیت کو پر امن زندگی عنایت کرنے کے اعلان کے ساتھ جوڑا ہے کہ روزی بھی ملے گی اور امن بھی۔ روزی کے حصول کے بدلے ذلت ورسوائی اور ظلم وستم نہیں ہو گا، مگر شرط ایک ہی ہوگی اور وہ بھی بہت ہی سادہ اور آسان کہ اس کریم رزاق کو اپنا الہ حقیقی مان کر اس کی عبادت کرتے رہیے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۝۳ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ۝۴﴾[۲]

ترجمہ: بس ان (انسانوں) کو چاہیے کہ وہ اس گھر (بیت اللہ، خانہ کعبہ) کے مالک (اللہ کریم) کی عبادت کرتے رہیں، جس نے انہیں بھوک کے وقت روزی عنایت فرمائی اور خطرہ و ڈر کے وقت امن عطا فرمایا۔

انسانوں کو تلقین فرمادی کہ جو ان کی ضرورت سے زائد ہو وہ اپنے معاشی دکھوں کے مارے بھائیوں کو دے دیا کریں تاکہ وہ بھوک و محتاجی کا شکار ہو کر زندگی کی دوڑ میں ان (اغنیاء) سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ﴾[۳]

ترجمہ: وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ سمجھا دیجیے جو (ان کی اپنی) ضرورت سے زائد ہو۔

---

(۱) سورہ الفاتحہ: آیت ۲

(۲) سورۃ ایلاف: (۱۰۴): ۳، ٤

(۳) سورۃ البقرہ: (۲): ۲۱۹

گو بعض مفسرین نے اس حکم کو زکاۃ کی ادائیگی سے مشروط کیا ہے، مگر حکم کی روح زکاۃ کے علاوہ بھی محروم المعیشت (Destitutes) انسانوں کی کفالت کے لیے خرچ کرنے کا تقاضہ کرتی ہے۔

غریبوں محتاجوں کی کفالت نہ کرنے والے اصحابِ ثروت کو سخت وعید بھی سنائی ہے۔ لیجئے پڑھیے:

الاغنیاء وکلائی، والفقراء عیالی فاذا بخل وکلائی علی عیالی اذقتهم وبالی ولا ابالی.

ترجمہ: ثروت والے (تقسیم مال اور محتاجوں پر خرچ کرنے میں) میرے وکیل (Agents) ہیں جبکہ فقراء میرے عیال (Family) ہیں۔ اگر یہ میرے وکلاء (یعنی امراء) میرے عیال (خاندان) پر خرچ کرنے میں کنجوسی سے کام لیں گے تو میں انہیں اپنا عذاب چکھاؤں گا پھر میں ان (مالداروں کے دکھوں) کی پرواہ بھی نہیں کروں گا۔

اسلام کے عادلانہ اور رحیمانہ نظام ربوبیت جسے اقتصادی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ کی عملی شکل (Practicle Form) اور ترویج (Introduction) اللہ کریم کے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل (Verbal & Preactice) دونوں طریقوں سے کر کے دکھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نبی کریم ہیں جن کی فطرت کی اٹھان ہی معاشی دکھوں کے ماروں کی کفالت، مظلوموں کی داد رسی اور مشکلات میں پھنسے ہوؤں کو بچانے پر رکھی گئی۔ آئیے میرے ساتھ مل کر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ شہادت (Testimony) پڑھ لیں جو آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی لانے والے فرشتہ جبرائیل امین علیہ السلام کے اچانک آنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچ کر وحی کی تلاوت کرانے کی وجہ سے اپنی زندگی کو خطرہ اور قوم قریش کے تمسخرانہ انکار کے ڈر کی وجہ سے پریشانی ہوئی اُسے زائل کرنے کے لیے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مربیانہ، رحیمانہ اور

کریمانہ خصوصیات کے بارے میں دی، جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں جبرائیل علیہ السلام کے پہلی وحی لانے پر گھبرا کر گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمبل اوڑھانے (زمّلونی، زمّلونی) کا ارشاد فرمایا اور گھبراہٹ سے افاقہ پر اپنی محرمِ راز باوفا، عاقلہ زوجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فرمایا: مجھے اپنی زندگی کا خطرہ اور قوم سے رسوائی کا ڈر ہے۔ اس سادہ شعار خاتون رضی اللہ تعالیٰ عنہا ـــــ جس نے سوشلزم کا غیر معقول نعرہ سنا تھا نہ سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں کا مطالعہ کیا تھا ـــــ نے عرض کیا:

كلا، ابشر، فوالله ما يخزيك الله أبدا، إنك لتصل الرحم، وتصدق الحديث، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق.[1]

ترجمہ: ہرگز نہیں۔ خوش رہیے! اللہ عظیم و جلیل کی قسم! اللہ کریم آپ کو کبھی ہلکا نہیں کریں گے (نہ ہی کرنے دیں گے) کیونکہ آپ تو (وہ ستودہ صفات انسان ہیں جو) صلہ رحمی (رشتہ داروں کی کفالت) کرتے ہیں (بلا خوف و خطر) سچی بات کہتے ہیں، (محتاجوں، اپنے ہوں یا پرائے کی معاشی) ذمہ داری اٹھاتے ہیں، جس کا (یا جسے) کوئی کمانے والا نہ ہو اُسے کما کر دیتے (اور کھلاتے) ہیں (واقف اور اجنبی دونوں قسم کے) مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق (و انصاف) کے مواقع پر دستگیری فرماتے ہیں (بھلا ان کریمانہ صفات والے شخص کو قدر دان کریم اللہ کبھی ہلکا ہونے دے گا؟ ہرگز نہیں)۔

ذرا میرے ساتھ مل کر اُس وفا شعار زوجہ محترمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اپنے کریم النفس، علو المرتبت، غریبوں کے حامی، محتاجوں کے کارساز، صادق و امین خاوند صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے شہادت کو دوبارہ بلکہ بار بار پڑھیئے اور پھر بتائیے کہ فقراء

(۱) في البخاری و مسلم، باب بدء الوحی

اور معاشی دکھوں کے ماروں کی مدد اور بحالی کا کونسا ذریعہ ووسیلہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ میں موجود نہ ہو؟ اور کریمانہ شان کا اندازہ کیجئے کہ یہ شہادت بقاعدہ منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کی آپ کی سیرت مطہرہ کے بارے میں ہے۔

آپ تھوڑا سا وقت نکالیں میں آپ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب (اللہ کریم قیامت کے روز ان سے آسانی کا معاملہ فرمائے) کی وہ شہادت بھی پڑھ کر سنادوں جو انہوں نے عرش کے کریم سلطان سے ابرِ رحمت کا سوال کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفارشی بنا کر بیت اللہ شریف کی دیوار کے سائے میں لا کھڑا کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر ابرِ رحمت کے کھل کر برسنے اور اہلِ مکہ مکرمہ کی معاشی خوشحالی کا ذریعہ بن جانے کے بعد خوش ہو کر ایک قصیدہ میں پیش کی، پڑھیئے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ
ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

ترجمہ: وہ روشن چہرے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کے وسیلہ سے باران رحمت کی درخواست کی جا سکتی ہے آپ یتیموں کے ملجا و ماویٰ، بیوگان کی عصمت وعفت کے پاسبان ہیں۔[1]

آیئے آخر میں آپ کو مصر کے شہرۂ آفاق شاعر احمد شوقی رحمہ اللہ (۱۸۶۸ ـــــ ۱۹۳۲ء) کے مشہور قصیدہ "الھمزیۃ النبویۃ" کے دو اشعار سنادوں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے اسی معاشی پہلو پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالتے ہیں، چلیے سن لیجئے۔

انصفت اھل الفقر من اھل الغنی   فکل فی حق الحیاۃ سواء

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ج ۱ شعر ابی طالب فی مفاداۃ خصومہ

لــو أن إنســانا تخيـر ملــة   مــا اختــارو إلا دينــك الفقــراء

ترجمہ: (اے کریم النفس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ نے اہل ثروت سے انصاف کے ساتھ (نہ کہ کمیونزم کے خونی طریقہ سے) محتاجوں کو (ان کا حصہ) دلوایا، یوں تمام انسان (قطع نظر رنگ ونسل و مذہب کے) زندگی کے حق (معاش) میں برابر ہو گئے (لہذا) اگر انسانوں کو (اپنی مرضی اور پسند سے بھی کوئی) مسلک اپنانے کا اختیار دے دیا جاتا تو (معاشی دکھوں کے مارے) محتاج لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا دین پسند کرتے ہیں (کیونکہ اس میں انسانوں کو حقِ معیشت میں برابری اور انصاف کے ساتھ اغنیاء سے حصہ دلوانے کا وعدہ ہے)۔

"اسلام کا اقتصادی نظام" کے انہی کریمانہ، منصفانہ، جامع اور ہر دور میں قابلِ عمل پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے اسلام کے مخلص اور درد مند علماء نے کتب تصنیف کی ہیں، جن کی تعداد آج تک سینکڑوں سے تجاوز کرتی ہے۔ مگر ایک کتاب کو اردو زبان میں "اولین کوشش" کا مقام حاصل ہے، جو صرف اولین ہی نہیں، بہترین اور مفید ترین بھی ہے، جسے میں مرتب (Edit) کرنے کی سعادت پا رہا ہوں۔ یہ میرے کریم کا کرم ہے جو مجھ ایسے نالائق، گنہگار انسان سے بھی محض اپنی توفیق سے کوئی کام لے لیتا ہے "ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء" آیئے اس زندہ کتاب کے تعارف اور تحریر (Edit) کرنے کی وجوہ کی طرف۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے یہ مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاروی رحمہ اللہ (۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۱ء ــــ ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) کی "اسلام کا اقتصادی نظام" ہے اس کتاب سے میرا تعارف اور تعلق ۱۹۶۹ء ــــ ۱۹۷۰ء کا ہے۔ جب میں ایم، اے اسلامیات کے ایک اختیاری پرچہ "اسلام کا معاشی نظام" کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ کتاب مجھے امیر مجلس تحفظ ختم نبوت حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ نے اپنے مرکزی دفتر ملتان کی لائبریری سے لاہور لا کر دی تھی میں نے اس کتاب کا

مطالعہ اپنے ایم، اے کے امتحان کے لیے شروع کیا، مگر اس سے تعلق وہ بنا کہ زندگی بھر کا ساتھ بن گیا۔ میرے ایم، اے معاشیات، پھر ڈاکٹریٹ اسلامی معاشیات، پھر تدریس اسلامی معاشیات، تحقیق و تصنیف اسلامی معاشیات، غرض یہ کتاب ہر مقام و ہر منزل پر میری رہنما بن کر رہی اور الحمد للہ آج بھی ہے اور جب تک حیات مستعار کا سلسلہ روز و شب باقی ہے یہ کتاب میری رہنما اور ساتھی ہے بلکہ سچی بات ہے کہ محسن ہے۔ میں نے اسلام کے اقتصادی نظام کے متعلق جو کچھ جانا اور لکھا اس کی اساس یہی کتاب ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۷ء اور مصنف رحمہ اللہ کی زندگی میں چوتھا اور آخری ایڈیشن ۱۳۷۰ھ (مطابق 1951ء) میں شائع ہوا۔ مصنف رحمہ اللہ کی وفات کے بعد پاک وہند سے اس کے متواتر اور متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے مگر وہ ۱۹۵۱ء والے ایڈیشن کی نقل ہیں اگر نقل بھی بمطابق اصل —— طبع ثالث جو مصنف رحمہ اللہ کی نگرانی میں ۱۳۶۵ھ (مطابق ۱۹۴۳ء) شائع ہوا —— کی جاتی تو پھر بھی اس ''زندہ کتاب'' اور اس کے قارئین کرام کے ساتھ انصاف ہوتا اور علم کی خدمت ہوتی مگر پبلشرز حضرات ایسا کرنے میں ناکام رہے۔

اس محسن کتاب کے بارے میں میری ذاتی رائے —— جو محض معتقدانہ نہیں بلکہ مُحقّقانہ اور غیر جانبدارانہ ہے —— یہ ہے کہ ''اسلام کے اقتصادی نظام'' پر —— نظریہ اور فکر کی حد تک —— اس سے بہتر کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اردو، عربی اور انگلش تینوں زبانوں کے اس موضوع پر لٹریچر میں اس جیسی کتاب مجھے نہیں ملی۔ میں نے اس موضوع پر مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ، جناب ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ، سید قطب رحمہ اللہ، علامہ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر انس زرقاء، باقر الصدر، شیخ ابو زہراء کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ ان علماء کی بلند پایہ تصانیف اور ان کے علمی مقام سے ہرگز انکار نہیں مگر مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

رحمہ اللہ نے جس طرح "اسلام کا اقتصادی نظام" لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے نہیں کہ یہ کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" پر نقش اولین کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے فاضل مصنف کو اس قلمی اور علمی جہاد میں قائد ہونے کا شرف حاصل ہے، گو یہ بھی وجہ انتخاب و پسندیدگی کا بہت بڑا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اور صرف اس لیے بھی نہیں کہ اس کتاب کا مصنف علماء کرام کے اس صدق و وفا کا ایک ہمراہی تھا جس نے خاک و خون کے سمندر عبور کر کے اللہ کریم کے دین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی طریقوں کو زندہ رکھا، جو خود تو قربان گاہ کے گھاٹ اتر گئے مگر پرچم اسلام کو سرنگوں نہ ہونے دیا اگرچہ یہ بھی انتخاب کی بڑی وجہ بن سکتی ہے کیونکہ ایسے قافلہ کا کوئی اہل قلم لالچ، خیانت اور احساسِ کمتری (Inferiority Complexe) کا شکار ہو کر اسلامی تعلیمات کی غلط تعبیر و تشریح نہیں کرے گا جو اسلام کے کسی موضوع پر کسی کتاب کی اولین خوبی ہونی چاہیے۔ اور اس لیے بھی نہیں کہ اس کا مصنف ایک متوسط درجہ کا انسان تھا جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے خوب خوب کام لے کر اللہ کریم کے فضل سے سیاست، قیادت، اور ہر علم و فضل میں وہ مقام پا لیا جس کے عشر عشیر کو بھی نام نہاد "رواجی بڑے" ترستے ہیں وہ ملتِ اسلامیانِ ہند کا نامور سیاسی قائد، پارلیمنٹ میں ان کا نمائندہ پرجوش خطیب، ماہر و تجربہ کار معلم، مشّاق مصنف اور صاحب قلم تھا۔

بلکہ اس لیے کہ:

❶ اس کتاب کا مصنف رحمہ اللہ مستند عالم دین محدث، مفسر، مؤرخ، مصنف، عربی، اردو اور فارسی زبانوں کا ماہر، معیشت، معاشرت اور سیاست کے گرم و سرد چشیدہ، مسلمانان عالم اور بالخصوص مسلمانان برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی معاشی حالتِ زار کے رازدان، انگریز کے سرمایہ دارانہ تسلط و جبر اور اس کے رد عمل میں انسانوں کے معاشی دکھوں کی کوکھ سے جنم لینے والا غیر فطرتی نظام سوشلزم اور کمیونزم (Socialism & Communism) کے چشم دید گواہ اور اسلام کے رحیمانہ اور

عادلانہ نظام معیشت سے خود آگاہ، تجربہ کی بھٹی سے کندن بن کر نکلنے والا جامع انسان تھا۔ جس کا سیال (Flucid) قلم "اسلام کا اقتصادی نظام" کی بہتر سے بہتر تعبیر و تشریح کر گیا۔

۲ یہ کتاب چونکہ "اسلام کے اقتصادی نظام" پر نقش اولین ہے، لہذا کسی کی نقل نہیں بلکہ اصل (Original) ہے جسے اسلام کے بنیادی مصادر اور امہات الکتب کے منبع صافی سے تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب بنیادی مصادر (Original Sources) کے حوالہ جات (References) سے بھری نظر آتی ہے۔ جس کی مثال اس موضوع پر کسی اور کتاب میں نہیں ملتی۔

۳ مصنف رحمہ اللہ کی جس ماحول میں تربیت ہوئی، جن صلحاء کے زیر سایہ وہ پروان چڑھے، جن راسخ العقیدہ علماء عظام سے انہوں نے سیکھا، پڑھا اور جس قافلہ کے وہ رفیق سفر بنے، اس نے ان کے مزاج میں اسلام کی حقانیت، عملیّت پر، ہر ماحول اور ہر معاشرہ کے معاشی مسائل حل کرنے کی صلاحیت، اور اس کے وحی الٰہی ہونے پر مکمل ایمان، اعتماد اور یقین پیدا کر دیا تھا، لہذا انہوں نے اسلام کے اقتصادی نظام پر قلم اٹھایا تو بغیر کسی تردد و شک، بلا کسی ذہنی مرعوبیت و تحفظ (Reservation) کے لکھا جس کی مثال اس موضوع پر لکھنے والے کسی اور مصنف کے ہاں کم ہی ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمہ قسم کے علمی تعصب، سیاسی بُعد اور مسلکانہ تنگ نظری کے باوجود پاکستان و ہندوستان کی تمام جامعات میں "اسلام کا معاشی نظام" کے اختیاری مضمون خواہ وہ ایم اے معاشیات کا ہو یا ایم اے اسلامیات کا دونوں کے لیے اس زندہ کتاب کی سفارش کی جاتی ہے۔ اور میری مخلصانہ رائے ہے کہ اسلامی معاشیات کی بنیادی سوجھ بوجھ (Basic Understanding) سے لے کر اعلیٰ درجہ تک تحقیق کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ نہایت ضروری ہو گا۔ اس کی یہی خصوصیت اسے زندہ کتابوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مخلص اہل علم مجھے اصرار کے ساتھ مشورہ دیتے رہے کہ اس کتاب کو

اگر جدید قالب دیا جائے تو اسلامی علوم (Islamic Lores) کی بڑی خدمت اور اللہ کریم کی رضا کا مؤثر ذریعہ ہو گا اسی اور بالخصوص مؤخر الذکر "مؤثر ذریعہ" کے لیے میں نے اس عظیم کتاب کی تجدید کا ارادہ کیا۔

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی علمی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا —— جدید عربی علماء و مصنفین کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا —— کہ اردو زبان میں اسلام کے معاشی نظام پر غالباً یہ کتاب اولین کوشش کا درجہ رکھتی ہے اس کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سی مفید کتب منصہ شہود پر آئی ہیں مگر اولیت کا سہرا کتاب کے مصنف کے سر ہے جس کا ذکر مصنف رحمہ اللہ نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اگرچہ علماء اسلام اور فقہاء کرام نے اسلام کے معاشی نظام پر گرانقدر تصانیف چھوڑی ہیں مثلاً نظام محصولات، سرکاری خزانہ، ریاست کے مصارف اور آمدن پر "کتاب الخراج" سے نام سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ (۱۱۳ھ —— ۱۸۲ھ) اور یحییٰ بن آدم القرشی (م ۲۰۳ھ) کی تصانیف، مالیاتی پالیسی، بین الاقوامی تجارت اور معاشی تعلقات پر "کتاب الاموال" کے عنوان سے حمید بن زنجویہ رحمہ اللہ اور ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ (م ۲۲۴ھ) کی نگارشات اور تجارتی کاروبار، قرض اور دیگر معاشی سرگرمیوں کے لیے "الاحکام السلطانیہ" کے نام سے ابو یعلی محمد بن حسین الفراء (م ۴۵۸ھ) اور علی بن حبیب الماوردی رحمہ اللہ کی کتب نہایت اہم ہیں، علاوہ ازیں فقہاء کرام نے اپنی کتب فقہ میں "معاملات مالیہ"، زکاۃ، نفقات وغیرہا کے عنوانات سے اسلامی معاشیات پر بہت بڑا علمی ذخیرہ مرتب کیا ہے۔ مگر "اسلام کا اقتصادی نظام" کے عنوان سے کوئی مستقل کتاب ہمارے اسلاف (Forefathers) نے نہیں لکھی، غالباً انہوں نے رزق، معاش کا کفیل اللہ کریم کو مان کر معاش کے موضوع کو چھیڑنا پسند نہیں کیا کہ یہ اس رزاق کریم کا معاملہ ہے البتہ اپنی ذمہ داری اشاعتِ اسلام جان کر وہ اپنے تمام ممکنہ وسائل اور بہترین صلاحیتوں کے ساتھ اس میں لگے رہے، مگر جب مسلمانوں نے اپنا اصل کام چھوڑ دیا

اور فکر معاش کو اوڑھنا بچھونا بنالیا اور غیر مسلموں کے درمیان بلکہ اُن کے تسلط میں رہنے پر مجبور ہوئے تو دردِ دل والے علماء اسلام نے اُن کی رہنمائی کے لیے اسلام کے معاشی نظام پر تصنیف و تالیف کا کام کیا اور یہ کتاب اس مخلصانہ کاوش کا ثمرہ ہے۔

مجھ پر اس کتاب کا بڑا احسان ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ لہذا اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے میں نے اس کتاب کو نئے سرے سے مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ ایسا کرنے میں میرے سامنے چند وجوہ اور مقاصد تھے۔

❶ اس زندہ کتاب کی عمر تقریباً ایک صدی پر محیط ہے، گو اس کی علمی اہمیت و افادیت کم نہیں ہوئی مگر زمانہ کی کہنگی، گردش اور اس کے بدلتے مطالبات، علمی تعصب، اپنوں کی عدم توجہی اور بیگانوں کی مؤثر مخالفت نے اسے گہنا دیا ہے، ضرورت ہے کہ اس مفید کتاب کا احیاء کیا جائے۔

❷ کتاب کی زبان ۷۵ سال پرانی ہے، عمرانیات کا اصول کہ ہر دور کے لیے اپنی زبان اور نظریہ ہوتا ہے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کتاب کی زبان کو جدید بنایا جائے۔ مگر میں اس اصول پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کتاب کا نظریہ "اسلام کا اقتصادی نظام" ابدی ہے جس کی تشریح اور تطبیق (Explaination & Implementaition) میں تبدیلی اور اختلاف کی گنجائش ہے مگر بنیاد (Base) پر نہیں، جبکہ یہ کتاب تو بنیادی تعلیمات (Basic Teachings) پر ہی ہے، رہا مسئلہ زبان کا تو میں کتاب کی اصل زبان کو چھیڑ نہیں سکتا البتہ جہاں ضرورت محسوس کی گئی قوسین (Brackets) کے اندر متبادل انگریزی لفظ یا ترجمہ لکھ دیا ہے۔

❸ مصنف رحمہ اللہ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ اور مؤرخ تھے انہوں نے کتاب میں فقیہانہ، محدثانہ اور مفسرانہ زبان اور مصطلحات و رموز (Terminologies & Nomenclatures) استعمال کی ہیں۔ جو عام گریجویٹ (Graduate) کو بھی نامانوس (Uunfamilar) لگتی ہیں، لہذا میں نے کوشش کی ہے کہ ایسے تمام اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی میں کرتے جاؤں۔

اس طرح ترجمہ کی اہمیت کا احساس حضرت مصنف رحمہ اللہ کو بھی تھا انہوں نے بعض مقامات پر معاشی اصطلاحات اور معیشت دانوں کے ناموں کو انگلش میں لکھا ہے، اگرچہ ان کی کتابت (Composing) اکثر غلط ہے، میں نے اللہ کریم کی بخشی ہوئی توفیق سے انہیں درست کرنے کی پوری سعی کی ہے۔

❹ بعض مقامات پر متن (Text) کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے مثلاً کئی احادیث بغیر راوی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام کے ہیں، حدیث کے متن میں راوی کا نام اور ہے اردو ترجمہ میں اور ہے، ترجمہ اور عربی متن میں سہو ہو گیا ہے، عربی متن بغیر ترقیم (Punctuation) کے عدم سلیقگی کی شکایت کرتا نظر آتا ہے غالباً یہ سارے کا سارا کمال مصحح (Proof Reader) کا ہے، مگر الزام بے گناہ مصنف پر ہی آتا ہے، اس اہم کتاب کو اس نکتہ نظر سے بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ بعض مقامات پر عجلت اور اختصار سے کام لیا گیا ہے، مثلاً حصہ دوم کے معاشی مضامین وغیرہ۔ ایسے مقامات پر حاشیہ میں اضافہ درج کر دیا گیا ہے۔

❺ کتاب کے حوالہ جات کو مسلمہ مروجہ بین الاقوامی معیار پر لانے کی ضرورت غالباً تمام ضرورتوں سے اہم ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے اس دور کے رواج کے مطابق یا قارئین کرام کو بھی علوم اسلامیہ کا واقف خیال کر کے حوالہ جات کو اکثر و بیشتر مقامات پر محض اشارہ تک محدود رکھا ہے۔ مثلاً بخاری شریف سے نقل کردہ روایت میں انہوں نے صرف "رواہ بخاری" (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) لکھا ہے جبکہ معیاری طریقہ مطالبہ کرتا ہے کہ بخاری شریف کے مصنف رحمہ اللہ کا پورا نام (ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری) پھر بخاری کی جلد پھر اس کی کتاب، پھر باب اور پھر حدیث کا حوالہ درج کیا جائے، مگر حضرت مصنف رحمہ اللہ نے غالباً اپنی پوری کتاب میں اس کا التزام نہیں فرمایا۔ اس پہلو کو معیاری بنانے کے لیے حوالہ جات کی تخریج (Docomentation) کا نہایت کٹھن کام مکمل کیا گیا ہے تمام کتب اصلیہ اور مصادر (Original Books & Sourses) کو تلاش کر کے مصنف رحمہ اللہ کے حوالہ

جات کا اصل کتب کی عبارات سے موازنہ کر کے جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اصلاح کر دی گئی ہے۔ بعض کتب مثلاً ''اشھر مشاھیر الاسلام'' مجھے تلاش کے باوجود نہیں مل سکی مگر جن جن مصادر (مثلاً طبری، کتاب الخراج، البدایۃ والنہایۃ وغیرہا) سے نہ ملنے والی کتاب میں حوالہ جات لیے گئے، اُن سے حوالہ جات نقل کر کے تکمیل کر لی گئی۔

❻ بعض مقامات پر کتاب کے مصنف کا نام ہے مگر کتاب کا نام نہیں مثلاً ایک مقام پر ''ابن متین رحمہ اللہ'' کا قول درج ہے مگر کتاب وغیرہ کا ذکر نہیں، ایک کتاب ''اشھر مشاھیر الاسلام'' کے کئی حوالہ جات درج کیے گئے ہیں مگر مصنف رحمہ اللہ کا کہیں ذکر نہیں، اس طرح کا معاملہ کتاب ''سعیدیات'' کا ہے اس کے حوالہ جات کئی مقامات پر دیئے گئے ہیں مگر مصنف رحمہ اللہ کا نام نہیں لکھا، نہ کتاب کا مطبع اور سن طباعت کا ذکر ہے۔ اسی طرح کا سلوک ''مختار الکونین'' کے ساتھ کیا گیا ہے۔

❼ یہ ایک معتدل ضخامت کی کتاب ہے مگر حضرت مصنف رحمہ اللہ نے مواد کی ابواب بندی (Classification) نہیں کی، جس سے مواد کی ترتیب و تقسیم مزید بہتر ہو سکتی تھی۔ میں نے اس بلند مرتبہ کتاب کو ابواب میں تقسیم کرنے کی ضرورت کو سمجھا ہے، لہٰذا چودہ (۱۴) چھوٹے بڑے ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ان کے عنوانات مقرر کیے ہیں۔

❽ کتاب میں جن محدثین، مفسرین، فقہاء، معیشت دانوں اور دیگر عظماء امت مثلاً صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسماء گرامی آئے ہیں ان کا مختصر تعارفی خاکہ حاشیہ میں درج کیا گیا ہے البتہ جن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے عام اہلِ علم واقف ہیں مثلاً خلفاء اَربعۃ ـــــ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ـــــ کے حالات درج نہیں کیے۔ بعض ایسے حضرات کے اسماء گرامی بھی ہیں جن کے حالات تحقیق نہیں ہو سکے، وہ رہ

گئے ہیں البتہ آئمہ حدیث ـــــ مؤلفین صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث کے مؤلفین جن کا نام کتاب میں آیا ہے ـــــ کے تعارف کے لیے کتاب کے آخر میں ایک ''ضمیمہ'' درج کر دیا ہے علاوہ ازیں، ایک دوسرا ''ضمیمہ'' مختلف اموالِ زکاۃ کے نصاب پر اور ایک تیسرا ''ضمیمہ'' اسلامی اوزان و پیمانے کے عنوان سے درج کیا ہے۔

❾ کتاب کے متن میں دو تین مقامات پر معمولی اضافہ بھی کیا گیا ہے، اُسے حضرت مصنف رحمہ اللہ کے متن سے ممیز کرنے کے لئے قوسین (Brackets) کے اندر لایا گیا ہے۔

ان تمام مقاصد حسنہ کی تکمیل کے لیے اور اس علمی ذخیرہ کو سہل بنانے کے لیے چار کام کیے گئے ہیں۔

(الف) مواد کی تبویب و تہذیب (Classification & Edification)

(ب) ترتیب و تخریج (Editing & Doucmentaiton)

(ج) ترمیم و ترقیم (Modification & Punctuation)

(د) ترجمہ (Translation)

مصنف رحمہ اللہ نے مختلف معاشی موضوعات پر مسلم معیشت دانوں اور مفکرین مثلاً امام ابو یوسف، شاہ ولی اللہ دہلوی، امام ابن تیمیہ، امام غزالی، امام رازی، حافظ ابن قیم جوزیہ، امام ابن حزم اندلسی رحمہم اللہ کے طویل اقتباسات نقل کیے، جن سے معاشیات کے خشک موضوع کو تھکا دینے والا بننے کا خطرہ تھا۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان طویل اقتباسات کو ضمنی عنوانات (Sub Headings) میں تقسیم کر کے اکتاہٹ اور الجھن کے احساس کو کم کیا جائے۔

تخریج حوالہ جات (Documentation) کے لیے مجھے صبر آزما اور طویل جدوجہد کرنا پڑی۔ آج کل میرا اکثر وقت اپنے گاؤں میں اپنے حلقہ کے عوام میں رہ کر گزرتا ہے جہاں تحقیقی کام کرنے کا ماحول ہے نہ لائبریری کی سہولیات، نہ اہل علم و فضل کی مشاورت، نہ علمی خدمت کی حوصلہ افزائی۔ مگر مجھے جہاں کسی کتاب یا حوالہ کا

پتہ چلا وہاں کا سفر اختیار کیا۔ اللہ کریم کی رحمت ہو مولانا جلیل احمد اخون صاحب شیخ الحدیث و مہتمم جامع العلوم بہاولنگر پر جنہوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے مجھے استفادہ کا پورا پورا موقع عنایت فرمایا، جناب فیاض احمد رانجھا لائبریرین اور سید نصیب شاہ حسن زئی (دونوں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے منسلک ہیں) کا شکر گزار ہوں جنہوں نے حوالہ جات کی تلاش میں میرا تعاون کیا۔ اسی طرح دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے نگران حافظ سعد اللہ صاحب نے لائبریری کی کتب تک میری رسائی کو آسان بنایا۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بہاولنگر کی لائبریری کے انچارج اور عملہ نے بھی مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں اللہ کریم انہیں اپنے اجر و ثواب سے نوازے۔ (آمین)

آخر میں میں اپنے عظیم و جلیل و حلیم و کریم پروردگار کا سائل ہوں کہ وہ کریم ذات محض اپنا کرم و فضل فرما کر میری اس حقیر خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس کی قدر دانی کے طور پر مجھے مزید کی توفیق سے نوازے۔ اور میری حیات مستعار کے جو دن اور لمحات باقی ہیں انہیں اپنے دین کی سربلندی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی بھلائی اور اللہ کریم کے بندوں کی خدمت کے لیے قبول کرے۔

''ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم'' (آمین)

ع با کریماں کارہا دشوار نیست

واسال اللہ جلت عظمته ان یمن علینا بالقبول والتوفیق والسداد، والنجاح فی اعمال الدنیا والآخرة، انه سمیع مجیب الدعا. رب صل وسلم وبارك علی سیدنا محمد وعلی اله وصحبه واتباعه واحبابه الی یوم الدین. والحمد لله رب العالمین.

اسلام کا ناکارہ خادم

نور محمد غفاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

دیباچہ طبع اول

بعد حمد و صلوٰۃ، موجودہ زمانہ مادیت کی ترقی کا زمانہ ہے، یعنی اس زمانے میں روحانی (مذہبی) جذبات سرد پڑ رہے ہیں اور لادینی خیالات آہستہ آہستہ ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں، ایسے زمانہ میں مذہب کے نام سے کسی چیز کا پیش کرنا خصوصاً اس کے نام سے کسی "اقتصادی نظام" کی ہمہ گیری کا دعویٰ کرنا اور اس کو محنت و سرمایہ کی موجودہ کشاکش کا بہترین عمل بتانا بہت بڑی جرأت اور حیرت انگیز جسارت سمجھا جائے گا، مگر قدرت نے جنہیں چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے اور جن کو مشکوٰۃِ نبوت کے فیضان سے حصہ وافر ملا ہے وہ بحمد اللہ آج بھی اس مادی ترقی کے مسموم اثرات یعنی مذہب سے بے اعتنائی برتنے اس کی تعلیمات سے تمسخر کرنے اور اس کو نظر حقارت سے دیکھنے کو "ذہنی غلامی" اور "دماغی پستی" یقین کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے موجودہ انقلابی ہنگاموں میں بھی صحیح راہ وہی ہے جو اسلام کی ہمہ رس دعوت انقلاب نے ہم کو بتائی ہے اور امن عالم کے لیے آج بھی یہی نسخہ "نسخۂ کیمیا" ہے اور بس!

تاہم یہ قول چونکہ قول کی حد تک صرف ایک مقلدانہ خوش اعتقادی پر محمول کیا جاتا ہے، بنابریں ضرورت تھی کہ اقتصادی ہلچل اور یورپین نظریوں کی کورانہ تقلید اور اتباع کے اس دور میں جرأت و ہمت اور صداقت و اعتدال کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی نقشہ پیش کیا جائے تاکہ انصاف پسند اور حق نگاہ اصحاب کو غور کرنے کا موقع ملے کہ دنیا کے موجودہ نظامہائے اقتصادی میں اقتصادی مشکلوں کے حل کے لیے کون سی راہ مفید، خس و خاشاک سے پاک اور قابلِ عمل ہے۔

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ﴾ (۱)

ترجمہ: کہہ دیجیے کیا نابینا و بینا مساوی ہو سکتے ہیں اور کیا تاریکی اور روشنی برابر ہیں؟

نیز میری یہ "صدا" ان درد مند انسانوں کے لیے ہے جو غریبوں، مفلسوں اور عام بد حال انسانوں کی فاقہ مستیوں اور ان کے مقابلہ میں خود غرض، عیش پسند، متکبر و مغرور اور قارونی خصلتوں سے متصف سرمایہ داروں کو دیکھتے اور اس خود ساختہ اور غیر فطری تفاوت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو حیرت و اضطراب سے پکار اٹھتے ہیں کہ سوسائٹی کا یہ بے رحمانہ طبقاتی نظام کیا خدا ہی نے اپنے بندوں کے درمیان قائم کر دیا ہے، یا چند انسان نمادرندوں نے محض جبر و قہر سے سوسائٹی کا یہ نقشہ تیار کر کے اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنی اغراض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے، اور پھر اپنی نادانی و بے علمی سے کبھی سوشلزم (Socialism) و کمیونزم (Communism) کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور کبھی نیشنلزم (Nationalism) کی پناہ لیتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ اس عذاب سے نجات کی صرف یہی راہیں ہیں۔ میری یہ کتاب ایسے زخمی دلوں کے لیے مرہم اور ایسے مصیبت زدہ قلوب کے لیے آبِ حیات ہے، کیونکہ اسلام کی نگاہ میں مدارج معیشت (Economic Gradations) کا فرق اسی حد تک جائز اور فطری ہے کہ کسی حال میں بھی "اجتماعی زندگی" انفرادیت کے تیشہ سے گھائل نہ ہونے پائے اور عوام کی فلاح و بہبود کسی صورت میں بھی چند افراد کی اغراض پر قربان ہو کر نہ رہ جائے۔

رزق کی وسعت و تنگی کا دامن بلاشبہ خالقِ کردگار کے ید قدرت کی گرفت میں ہے لیکن اسی کے قولِ فیصل (قرآن عزیز) نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ دنیا کے اربابِ

(۱) سورۃ الرعد (۱۳):۱۶

دولت کی دولت کا راز اجتماعی مفاد ہی سے وابستہ ہے اور کار زار ہستی میں کسی کا فاقہ و مستی اور تنگدستی سے مجبور و مقہور رہنا خود اس نظام کا "ناقابل معافی" جرم ہے جس میں وہ آباد ہے اور ایسے نظام کا پہلی فرصت میں تباہ ہو جانا ضروری ہے، لہٰذا فرعون سامان اور فاقہ کش دو طبقوں میں انسانوں کی تقسیم کر کے جو کوئی اس ظالمانہ نظام کی نسبت خدا کی طرف کرتا ہے شاید وہ اس کے اس ظلم شکن اعلان اور پاداشِ عمل کے قانون سے ناآشنا اور بے خبر ہے۔

﴿ظَهَرَ ٱلْفَسَادُ فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِى ٱلنَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ ٱلَّذِى عَمِلُوا۟ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾﴾ [1]

ترجمہ: خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے کرتوتوں سے ان کو اپنے کرتوں کا مزہ کچھ چکھنا چاہیے تا کہ وہ باز آجائیں۔

بہرحال میری اس نگارش میں نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو دستِ غیب کا کوئی نسخہ ہاتھ آسکتا ہے اور نہ ان مذہب نما انسانوں کے لیے کوئی پیغامِ جانفزاء دستیاب ہو سکتا ہے جن کے نزدیک دنیا کے یہ موجودہ ظالمانہ نظام ہی خدا کی مرضی اور اس کا منشاء ہیں۔

میری یہ محنت صرف ان ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیے ہے جو موجودہ ظالمانہ نظام کی دستبرد سے مایوس ہو کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اور کسی عادلانہ نظام کے بروئے کار آنے کا انتظار کر رہے ہیں اور میری یہ پکار مذہب سے ناآشنا اور یورپ کے انقلاب سے مرعوب ان نوجوانوں کے لیے ہے جو "الحاد" کے جھوٹے مگر چمکتے ہوئے نگینوں کو جوہر و گوہر جانتے اور دنیا کے اس ظالمانہ کردار کا ردِ عمل کبھی ہیگل [2] اور کارل مارکس [1] کے فلسفہ سوشلزم اور کمیونزم میں سمجھتے ہیں اور کبھی نیشنلزم اور

---

(۱) سورۃ الروم (۳۰): ۴۱

(۲) ہیگل، جورج ولہلم فیڈرک (Hegel, Georg Wilhelm Friedrick) مشہور جرمن فلسفی ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوئے ۱۸۳۱ء میں وفات پائی۔ منطق جدلی ہیگلی (Hegelian Theory of Dialectical Process) کے بانی ہیں۔ جس

یورپ کی ڈیمو کریسی (جمہوریت) کو کعبۂ مقصود یقین کرنے لگتے ہیں۔

وہ دیکھیں اور غور و انصاف کی راہ سے دیکھیں کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے بتائے اور سکھائے ہوئے نظام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ظالمانہ نظام کے خلاف محنت و سرمایہ کی کشمکش اور طبقاتی جنگ سے نجات دلاتا ہے اور جس سے انسانوں کی آزادی اور عام خوش حالی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔

﴿قَدْ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ يَهْدِى بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضْوَٰنَهُۥ سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾﴾ (۲)

ترجمہ: اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی اور ایسی کتاب نازل ہو چکی جو اپنی ہدایات میں نہایت روشن کتاب ہے خدا نے اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو ہوائے نفس کی جگہ خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں، سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے یعنی اپنے مقررہ قانون کے بموجب انہیں تاریکیوں سے نکالتا روشنی میں لاتا اور کامیابی و سعادت کی راہ پر لگا دیتا ہے۔

میری اس پیشکش میں بھٹکے ہوئے انسانوں کے لیے تسکین کا سامان اور ان کی حیات اجتماعی کے لیے روح پرور پیغام ہے بشرطیکہ ان کو حق کی تلاش ہو اور ان کا دل

کی رو سے کسی نظریہ نظام کی بقاء یا رواج پذیری صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس کے چاہنے والے نہ چاہنے والوں سے لڑنے میں طاقت ور ہوں کہ اپنے نظام کو رواج دینے کے لیے پہلے نظام کے ماننے والوں سے لڑ کر انہیں شکست دیں اور اپنی پسند کا نظام جاری کریں۔

(۱) کارل مارکس (Karl Marx) کا تعارف باب (۱) کے حاشیہ میں آرہا ہے۔

(۲) سورۃ المائدہ (۵): ۱۵، ۱۶

خدا اور اس کی بتائی ہوئی راہ ہدایت اور روشن کیے ہوئے آفتاب رسالت سے باغی اور جان بوجھ کر نافرمانی و سرکشی کے لیے جری و بے باک نہ ہو۔

﴿وما اسئلکم عَلَیہِ مِنْ أجرِ انّ أجرِی الا علی اللّٰہ﴾[1]

ترجمہ: میں تم سے اس پر اجرت کا خواہش مند نہیں ہوں، میری (اس خدمت کی) اُجرت صرف اللہ کے پاس ہے۔

اس تصنیف کے متعلق "مقصد کی وضاحت کے بعد" اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں مخلصانہ گزارش ہے کہ براہ کرم وہ میری اس محنت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا شکار نہ بنائیں اور تنقید کرتے وقت اسی حیثیت سے نظر ڈالیں جس کے لیے وہ معرضِ تحریر میں آئی ہے۔ اہلِ علم حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ "اسلام کے اقتصادی نظام" کا یہ نقشہ موجودہ اقتصادی نظریوں اور ان کے پروگراموں کی طرح کسی کتاب کی صورت میں مدون و مرتب نہیں ہے اور نہ اس کے نظام عمل کا کوئی خاکہ اس جدید طرز و طریق پر اب تک شائع ہوا ہے بلکہ یہ اسلام کے بتائے ہوئے اصول اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی اس عملی حیات کے نظامِ عمل سے ماخوذ ہے جو زمانۂ نبوت اور دورِ خلافت میں بروئے کار آئے اور جس کو دنیا کے تمام اقتصادی و سیاسی نظامہائے عمل کے مقابلہ میں مساوات، امن و اطمینان اور عام رفاہیت کے پیشِ نظر تاریخی برتری حاصل ہے۔

تاہم اس کی تفصیل و تشریح اور ترتیب و جمع میں ایک خاص طرزِ نگارش کی وجہ سے جو اسلامی لٹریچر میں اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک نئے انداز کا حامل ہے۔ میری یہ سعی و کاوش بہت ممکن ہے کہ خامیوں اور لغزشوں سے خالی نہ ہو اور جو مطالب کہ اپنی توضیحات میں ضخیم جلدوں اور دقیق نکتہ سنجیوں کے محتاج ہیں میری لغزشِ

---

(۱) سورۃ الشعراء (۶۲): ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰

قلم کی وجہ سے وہ صحیح طور پر ادا نہ ہو سکے ہوں۔

اس لیے یہ بھی التماس ہے کہ مجھ کو ہدفِ ملامت بنانے کی بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کی جائے، خدا نے چاہا تو میں دوسرے ایڈیشن میں اس کی تلافی کی کوشش کروں گا۔

خادم ملت ——— محمد حفظ الرحمٰن

۱۸ر رجب المرجب ۱۳۵۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُخن گفتنی

دیباچہ طبع ثانی

الحمد للّٰہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ، اما بعد!

مصنف نے جب "اسلام کا اقتصادی نظام" لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کی اس محنت کی ملک کے اہلِ قلم، اہلِ علم اور اہلِ فکر کی نظروں میں اس قدر اہمیت ہوگی جس کا احساس نہیں، بلکہ مشاہدہ کتاب کی اشاعت کے بعد ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایسے بحرانی دور میں جبکہ حق و صداقت بھی شخصی عداوتوں کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، اس کتاب کو شرفِ قبولیت بخشا اور ندوۃ المصنفین کی اس خدمتِ علمی و مذہبی کو جدید اور قدیم دونوں حلقوں میں "سعی مشکور" بنایا۔

مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں جہاں کتاب کی نوعیت کے اعتبار سے اس کو اسلام کے علمی ذخیرہ میں ایک جدید اضافہ ظاہر کیا تھا، وہاں اپنی خامی اور نقشِ اولین کی حیثیت سے کتاب میں اضافہ اور ترمیم کی گنجائش کا بھی اعتراف تھا اور اربابِ علم و بصیرت اور اصحابِ قلم سے مخلصانہ درخواست کی تھی کہ وہ مصنف کے سیاسی رجحانات سے اختلاف کے باوجود بھی دیانت کے ساتھ صرف کتاب پر تبصرہ اور ریویو (Review) کی زحمت گوارا فرمائیں اور بے لاگ تنقید کر کے مصنف کی راہنمائی کریں۔

مصنف اس سلسلے میں ان اربابِ علم و اصحابِ قلم حضرات کا شکر گزار ہے۔ جنہوں نے اس اصولی نقطہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب پر تنقید بھی کی اور تقریظ بھی لکھی اور سب نے باتفاق یہ تسلیم کیا کہ بلاشبہ یہ کتاب وقت کی پکار کا اسلام کی جانب سے

بہترین جواب ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ علمی ذخیرہ میں پہلی کتاب اور بیش بہا ذخیرہ اسلامی کی حامل ہے۔

مصنف ساتھ ہی ان بعض اہلِ قلم کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے اصولِ تنقید سے گریز کرتے ہوئے کتاب کی جگہ مصنف کے سیاسی مسلک کو ہدفِ طعن بنایا اور اس کی جماعت کو غیر مہذب الفاظ میں یاد کرنا ضروری سمجھا اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ معاصرانہ حسد اور بغض و عناد ادعاءِ امامت و قیادت اور ادعاءِ تقویٰ و طہارت کے باوجود پستیٔ اخلاق کے کس عمیق غار میں لے جا کر گرا دیتا ہے، مگر مصنف ان کا بھی اس لیے شکر گزار ہے کہ ان کی اس غیر سنجیدہ روش نے کتاب کو ملک میں بہت زیادہ مقبول بنا دیا اور اربابِ ذوق نے اس پر زیادہ سے زیادہ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس کا اندازہ ندوۃ المصنفین کے دفتر میں آئے ہوئے ان خطوط سے ہوسکتا ہے جو کتاب کے متعلق ملک کے مختلف گوشوں سے اظہارِ خیال اور کتاب کی خریداری کے متعلق آئے، یا اس کا صحیح اندازہ علومِ جدیدہ کے ان اہلِ قلم کے تحریری تقاضوں سے ہو سکتا ہے جو جدید کے ساتھ قدیم کا بھی ذوقِ کامل رکھتے ہوئے مُصِر ہیں کہ ہمیں اس کتاب کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کی اجازت دی جائے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اگرچہ ہاتھوں ہاتھ نکل چکا تھا اور ان تھوڑے سے نسخوں کے علاوہ جو دفتر میں اصولِ تجارت کی بنا پر روک لیے جاتے ہیں، کتاب کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا تاہم بعض دیگر تصنیفی مشاغل نے فوراً دوسرے ایڈیشن کی ترتیب کی جانب متوجہ نہ ہونے دیا۔ مگر اربابِ ذوق کے پیہم تقاضوں اور وقتی ضرورت کے احساس نے مہمیز کا کام دیا اور بحمد اللہ دوسرا ایڈیشن بھی منصۂ شہود پر آ گیا۔

اس ایڈیشن میں "نقشِ اولین" کو "نقشِ ثانی" بنانے کی پوری سعی کی گئی ہے اور جدید اضافات اور ترمیم و اصلاحات نے نیز تقطیع اور ضخامت کی زیادت نے گویا کتاب کو بالکل نیا جنم دے دیا ہے اور اس طرح وہ پہلے ایڈیشن سے الگ نئی اور مستقل

کتاب بن گئی ہے۔

مصنف ایک مرتبہ پھر اربابِ علم اور اصحابِ قلم کی خدمت میں مخلصانہ ملتمس ہے کہ وہ مسئلہ کی اہمیت، زیر بحث مسئلہ میں اسلامی نظریوں کی وضاحت، معاشیات میں اس کے عملی نظام اور اجتماعی احکام کے پیشِ نظر مصنف کی محنت و کاوش پر آزادانہ مگر دیانتدارانہ تنقید یا تقریظ کے لیے قلم اٹھائیں۔

اور ان چند آخری صفحات پر بھی ''جو کہ ضمنی طور پر ہندوستان میں معاشی مسئلہ کے متعلق زیر قلم آ گئے ہیں۔'' اگر کچھ لکھا جائے تو انصاف اور اسلامی اخلاق کی متانت کی روشنی میں معرضِ تحریر میں آئے تاکہ زیر بحث مسائل میں قارئینِ کرام کو فیصلہ کرنے میں مدد ملے، ''وما توفیقی الا باللّٰہ''.

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہ)

۲/ربیع الاول ۱۳۶۱ھ

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثالث

کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' اپنی ارتقائی منزلوں سے گزر کر اب تیسرے ایڈیشن کی صورت میں پیش ہے، اس ایڈیشن میں حذف و اضافہ دونوں سے کام لیا گیا ہے مگر حذف بہت کم اور اضافہ غیر معمولی ہے، اس لیے اس ایڈیشن میں خصوصیت کے ساتھ اسلامی معاشیات کے مفکرین شاہ ولی اللہ دہلوی، حافظ ابن قیم جوزی، امام رازی، امام غزالی اور ابن حزم اندلسی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ان نظریات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جو انہوں نے قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں خالص معاشی نقطۂ نگاہ سے پیش فرمائے ہیں۔

ان نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ معاشی مسائل کے حل میں مذہب سے آزاد یا مخالف ہو کر جن مفکرین نے کاوشیں کی ہیں اور نظری و عملی پہلوؤں کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے، ان کے مقابلہ میں اسلام کے ان مفکرین نے دینِ حق کی روشنی میں اس خوبی سے اس کا حل کیا ہے کہ ایک طرف لادینیت، طبقاتی جنگ و جدل اور انتقامی خام کاریوں سے تحفظ ہو جاتا ہے اور دوسری جانب وہ پوری افادیت موجود رہتی ہے، جو لادینی مفکرین کے معاشی نظام کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

اس مرتبہ یہ بھی سعی کی گئی ہے کہ مسئلہ سود (ربوا) پر بھی سیر حاصل بحث کی جائے کیونکہ موجودہ دور کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے ''سود'' کو اس طرح تجارت کا جزو بنا دیا ہے کہ آج اگر سود اور سودی تجارت کے خلاف کچھ کہا یا لکھا جائے تو وقت کے اہلِ نظر (معاشیین) اس کو تعجب و حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ''حرمتِ سود'' اور معاشی سسٹم میں عدمِ جوازِ سود پر دلائل کا

ذخیرہ ایک روحانی نظریہ یا ایک اچھے دفاع (Defence) سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اور یہ تو وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی معاشرہ میں سودی کاروبار ایک لغو اور باطل سسٹم ہے اور یہ کہ موجودہ ماہرین اقتصادیات کی ایک قابلِ ذکر جماعت کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ زمانہ قریب آرہا ہے کہ معاشیین کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ''سود'' کے لیے معاشی نظام میں کوئی دخل نہیں اور شرح سود کو صفر تک پہنچا دینا ہی معاشی حل کی کلید ہے۔

چنانچہ موجودہ ایڈیشن میں ''ربوا'' اور صحیح تجارتی لین دین کے درمیان تفاوت ظاہر کرتے ہوئے اسلامی نقطۂ نگاہ سے عدمِ جوازِ سود پر ایسے معاشی دلائل پیش کیے گئے ہیں جو مسئلہ کو دفاعی نقطۂ نظر سے آگے بڑھا کر ایک صحیح حل کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

''مسئلہ اراضی اور ہندوستان میں معاشی مشکلات کا حل'' کے عنوانات میں بھی جدید ترتیب کے ساتھ مزید اضافات زیر قلم لائے گئے ہیں جنہوں نے کتاب کی افادیت کو اور زیادہ وزنی بنا دیا ہے۔

غرض نقشِ ثالث ''ثانی اور اول'' کے مقابلہ میں مسئلہ ارتقاء کے بقاء اصلح کا آئینہ دار ہے اور اصحابِ فکر و نظر کے عمیق مطالعہ کا داعی۔ والی اللہ المرجع والمآب.

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہ)

۲۰ر جمادی الاخری ۱۳۶۵ھ

☆☆☆

دیباچہ طبع چہارم

کتاب کا چوتھا ایڈیشن بڑے ہی نازک زمانے میں پیش کیا جارہا ہے ایسا نازک زمانہ کہ چشمِ فلک نے نہ سہی، کم سے کم ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی قیامت خیزیوں کے بعد ابھی تک پورا ملک بے اطمینانی کی تاریک لہروں میں گھرا ہوا ہے اور کہیں دور دور بھی روشنی کی کرن نظر نہیں آتی۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے خود اس کے بولنے والے اس کو دیس نکالا دینے کی فکر کر رہے ہیں پھر جہاں تک ندوۃ المصنفین کا تعلق ہے ستمبر ۱۹۴۷ء کی بربادی کے بعد اس کے ارادوں کی بساط الٹ کر رہ گئی اور اب اس کا وجود ہی کرشمۂ قدرت سے کم نہیں ہے۔

موجودہ انقلاب نے مؤلف گرامی قدر کی مشغولیتوں کا نقشہ بھی یک قلم تبدیل کر دیا ہے وہ رہ رہ کر تصنیف و تالیف کی پرسکون وادی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں لیکن وقت کی شورشیں ان کے قدم کھینچ لیتی ہیں اور ان کو اس خدمت کا موقع نہیں دیتیں، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں اس کتاب کا جو ایڈیشن نکلا تھا، زیر نظر ایڈیشن ٹھیک اس کی نقل ہے اور اس میں ایک سطر کا بھی رد و بدل نہیں ہو سکا، مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے اگرچہ تیسرا ایڈیشن ہر حیثیت سے مکمل تھا اور اس میں کسی قابلِ ذکر اضافے کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی تھی، تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ اگر مصنف کو نظر ثانی کا موقع مل جاتا تو اس کی نوعیت کیا ہوتی۔

کاغذ کی کمیابی اور ہوشربا گرانی کے باوجود اس دفعہ کاغذ پہلے سے دبیز بھی ہے اور عمدہ بھی، یقین رکھنا چاہیے کہ پانچواں ایڈیشن فاضل مؤلف کی نظر ثانی کے بعد جلد ہی وجود میں آسکے گا اور گزشتہ چند سال میں بحث و نظر اور تعبیر و بیاں کے جدید گوشے سامنے آگئے ہیں ان کو بھی سامنے رکھا جا سکے گا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین

(۱۲ر شوال المکرم ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۵۱ء)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

باب ― ①

اقتصاد اور علم الاقتصاد کے مختلف نظریات کا تعارف

(Introduction to Economics and its Different Theories)

اقتصاد:

لغت کی زبان میں قصد و اقتصاد[1] "میانہ روی" اور "اچھے چلن" کا نام ہے، مگر علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی "دریافت" کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت و

---

(۱) اقتصاد ― میانہ روی، اعتدال، درمیانی راہ ― اسلام کے معتدل مزاج میں اس قدر اہم اور قابلِ ستائش ہے کہ اسے پیغمبرانہ خصائل واطوار کا حصہ قرار دیا گیا ہے اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

❶ عن عبداللّٰه بن سرجس رضی اللّٰه عنه ان النبی الکریم صلی اللّٰه علیه وسلم قال: السمت الحسن والتؤدة والاقتصاد جزء من أربع وعشرین جزء من النبوة (رواه الترمذی بحواله مشکوة المصابیح، باب الحذر والتأنی)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن سرجس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا طریقہ، احتیاط اور اقتصاد (میانہ روی) نبوت کا چوبیسواں (۲۴واں) حصہ ہیں۔

❷ عن عبداللّٰه بن عباس رضی اللّٰه عنهما ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: ان الهدی الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمس وعشرین جزء من النبوة. (رواه ابوداؤد، بحواله مشکوة المصابیح، باب الحذر والتأنی)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اچھی سیرت، اچھا برتاؤ اور اقتصاد (میانہ روی) نبوت کے پچیس حصوں میں سے ایک حصہ ہیں۔

بربادی کے ”حقیقی اسباب“ بتا سکیں۔

علم الاقتصاد (Economics):

اس لیے ”علم الاقتصاد“ اس علم کا نام ہے جو ان وسائل سے بحث کرتا ہے اور ان کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہے۔

”علم الاقتصاد“ اس معنی کے اعتبار سے دو حصوں پر منقسم ہے، ایک اجتماعی (Collective Or Social) اور دوسرا انفرادی (Individual) یا ”منزلی“ (Domestic)۔ ہماری بحث کا نقطۂ نظر ”اقتصادِ اجتماعی“ (Social Economics) ہے اس لیے کہ یہی زندگی کی اصل بنیاد ہے اور ”انفرادی و منزلی“ اقتصاد کے لیے دلیلِ راہ (Guide)۔

مختلف اقتصادی نظریات:

علمی دنیا کے قدیم و جدید مفکرین (Thinkers) اور علماء مبصرین (Scholars) نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک اس سعی کا سلسلہ جاری ہے۔ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون (Plato) نے بھی اپنی کتاب ”جمہوریہ“ (Republic) میں اس مسئلہ کے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ بیان کیا ہے، اور علماءِ جدید میں کیسل (Cassel)، مل (Mill)، [1] سمتھ (Smith)، [2] ریکارڈو (Ricardo) [3] اور جون (John) [4] نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی بنانے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ

---

(۱) جان اسٹورٹ مل (John Staurt Mill) (۱۸۷۳-۱۸۰۶) مشہور برطانوی معیشت دان جو فرد کی معاشی آزادی کے علم بردار تھے۔

(۲) آدم سمتھ (Adam Smith) (۱۷۹۰-۱۷۲۳) کلاسیکل نظریہ معاشیات (Classical Theory of Economics) کے بانی سمجھے جاتے ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب ”دولت اقوام (Wealth of Nations) لکھ کر اس نظریہ کی بنیاد رکھی، یہ کتاب ۱۷۷۶ء میں چھپی۔

(۳) ڈیوڈ ریکارڈو (Devid Ricardo) (۱۸۲۳-۱۷۷۲) بعض مؤرخین انہیں کلاسیکی معاشی مکتب فکر (Classical Economic School of Thought) کا مؤسس (Founder) کہتے ہیں وہ لگان کے کلاسیکل نظریہ (Classical Theory of Rent) کے بانی ہیں جسے انہوں نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے جو ۱۸۱۷ میں چھپی۔

(۴) جون مینارڈ کینز (Lord John Maynord Keyns) (۱۹۴۶ - ۱۸۸۳) نامور برطانوی معیشت دان، جنہوں نے پہلی بار کلی معاشیات (Macro Economics) کا تعارف کرایا۔ دراصل ۱۹۳۶ تک معاشیات کا تمام لٹریچر

ان کی تصانیف اور ان کے نظریوں سے واضح ہے، اور آخر میں کارل مارکس (Karl Marx)[1] نے نظریہ اشتراکیت (Socialism) اور اس کے ''عملی پروگرام'' کے ذریعہ سے یورپ میں جو انقلاب پیدا کیا اس سے علمی فکر و نظر، عملی نظام اور طرزِ حکومت پر جو اثر پڑا ہے وہ موافقت و مخالفت کے رنگ میں نہ صرف یورپ کو متاثر کر رہا ہے بلکہ ایشیا اور مشرق و مغرب کے تمام گوشوں میں زبردست ہیجان برپا کیے ہوئے ہیں اور روس جو کہ آج کل اشتراکیت کا عملی میدان بنا ہوا ہے، دوسروں کو بھی اس نظام میں منسلک کرنے کے لیے پیہم جدوجہد کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔[2]

جزوی معاشیات (Micro Economics) پر مشتمل تھا۔ انہوں نے ۱۹۴۰ - ۱۹۲۹ کے عالمی معاشی بحران کے بھیانک نقصانات سے متاثر ہو کر اپنی کتاب روز گار، سود اور زر کا عام نظریہ (The General Theory of Employment Intrest and Money) لکھی جو ۱۹۳۶ میں شائع ہوئی اور انؒ سے کلی معاشیات کی بنیاد پڑی۔ کلی معاشیات کے معیشت دان آج تک کینز ہی کے نظریہ کے پیروکار چلے آرہے ہیں۔ کچھ مزید بحث آگے آرہی ہے۔

(۱) کارل مارکس (Karl Marx) (۱۸۸۳ - ۱۸۱۸) مشہور جرمن فلسفی اور معیشت دان تھے۔ ان کی مشہور عالم کتاب سرمایہ (اصل زر) (Das Kapital) ہے جس نے عالمی معیشت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ کتاب (۱۸۶۷، ۱۸۹۵) کے درمیان شائع ہوتی رہی۔

(۲) یہ اُس دور یعنی ۱۹۳۶ کی بات ہے جب حضرت مصنف رحمہ اللہ اپنی کتاب لکھ رہے تھے۔ روس اشتراکیت کا داعی بن کر تقریباً ایک صدی تک اپنا کردار ادا کرتا رہا جس کی بدولت پوری دنیا کی معیشت و سیاست دو واضح بلاکوں (Blocks) میں منقسم رہی ہے یعنی اشتراکی یا روسی بلاک (Socialist or Russian Block) اور سرمایہ داری یا امریکی بلاک (Capitalist or American Block)۔ تمام اسلامی ممالک بھی سوائے ایک دو کے ان دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تھے جن میں اشتراکی بلاک سے منسلک ممالک مثلاً مصر، شام، الجزائر وغیرہ میں سوشلزم کا پرچار کیا جاتا تھا، خواہ اسے وہاں کامیابی ہوئی یا جزوی کامیابی ہو یا مکمل ناکامی ہو۔ اسی طرح جو اسلامی ممالک سرمایہ داری بلاک سے وابستہ تھے مثلاً پاکستان، افغانستان، ایران، مالیزیا، اردن وغیرہ ان میں نظام سرمایہ داری مروج رہا۔ پاکستان میں ۱۹۷۱ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے سوشلزم کا نعرہ لگایا، عوام نے ان کے نعرہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، ان کی پارٹی نے الیکشن بھی جیتا، مگر حکومت میں آنے کے بعد عملاً وہ بھی سرمایہ دارانہ نظام چلاتے رہے۔ غالباً اس کی وجہ ان کی جماعت میں پنجاب اور سندھ کے وڈیروں، مخدوموں، قریشیوں، بلوچ سرداروں، بڑے بڑے گدی نشینوں اور جاگیرداروں کی شمولیت تھی۔ ۱۹۸۶ء میں روس میں میخائیل گورباچیف (Mikhail Gorbo Chif) نے اشتراکی پالیسیوں پر گرفت ڈھیلی کر دی، وہ مصلحتاً یا بین الاقوامی سیاسی حالات کے پیش نظر آزاد حیثیت (Free Economy) کے حامی بن کر سرمایہ دارانہ بلاک کے

لیکن دنیا کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قدیم و جدید تمام نظامہائے حکومت میں ایک بھی ایسا نظام نہیں بتایا جاسکتا جس کے نظام اقتصادی نے انسانی دنیا کے اندر رفاہیت و خوش عیشی اور عدل و انصاف دونوں کو باہم ملا کر امن و سلامتی کا علم بلند کیا ہو، اور یہ تو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ ان کے پیش کردہ نظریوں اور عملی تجربوں نے دنیوی سربلندیوں کے ساتھ ساتھ انسانی حیات کے مقصدِ وحید (Sole Aim) یعنی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیانی رشتہ کو مضبوط کرنے اور اخلاقِ کریمانہ کی رفعتوں تک پہنچانے کی خدمت انجام دی ہو۔

افلاطون کا نظریہ اقتصاد (Palatonic Theory of Economics):[1]

افلاطون اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''جمہوریہ'' میں اقتصادی حیثیت سے انسانوں کے آزاد اور غلام دو طبقے ضروری قرار دیتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی آقائی کی جگہ بندوں کی آقائی کی دعوت دیتا ہے اور زیر دستوں پر زبردستوں کی قہرمانیت (Tyronny) کے لیے دروازہ کھولتا ہے اور صنفی تعلقات میں انارکی (Anarchy) پیدا کر کے معاشرتی نظام کو برباد کر دینے کے علاوہ معاشیات میں عوام و خواص کی تقسیم کو بڑی حد تک

قریب ہو گئے، انہوں نے سوویت یونین کی نئی اقتصادی شیرازہ بندی (Prestroika) اور کشادگی (Glasnost) متعارف کرایا، جس کا نتیجہ بالآخر اشتراکیت کا روس میں کمزوری میں نکلا۔ رہی سہی کسر روسی قیادت کی اس حماقت نے پوری کر دی جو اس نے دسمبر ۱۹۷۹ کو افغانستان پر یلغار کر کے کی۔ افغان اور دیگر مسلم مجاہدین نے روس کے سپر پاور کے خواب کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ۵ فروری ۱۹۸۹ میں روس نے ذلیل ہو کر افغانستان سے پسپائی اختیار کی۔ اس کے ساتھ ہی سوویت اشتراکی جمہوریاؤں کا اتحاد (USSR- Union of Soviet Socialist Republics) یعنی روسی وحدت کا خاتمہ اور عالمی سطح پر صرف امریکہ کے نام نہاد سپر پاور کی صورت میں ظاہر ہوا، میں نے نام نہاد سپر پاور (Super Power) اس لیے کہا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ دراصل سپر پاور اللہ کریم کی ذات کریم ہے اور ہم اس کے پرچارک بھی ہیں۔

(۱) افلاطون (Plato) (۴۲۸-۳۴۷ ق، م) مشہور یونانی فلسفی، دانشور اور مصلح مانے جاتے تھے۔ یہ سقراط (Socrates) (۴۷۰-۳۹۹ ق م) کے شاگرد تھے۔ سقراط اور ان کے دونوں شاگردوں افلاطون اور ارسطو (Aristotle) (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) کو جدید مغربی تہذیب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' (The Republic) کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔

=

باقی رکھتا ہے، یورپ کی جمہوریت کا نظام بھی اسی دیو استبداد کی قبا اوڑھے ہوئے ہے اور عام رفاہیت (Commonweal) و خوش عیشی کی بجائے مخصوص مالدار طبقوں کی کفالت کرتا نظر آتا ہے، اور اس لیے عدل و انصاف کے حقیقی معنیٰ کو بھی مسخ کر دیا گیا ہے اور ظلم و استبداد کو عدل و انصاف کا نام دیا جارہا ہے اور حقیقت بین نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ نہ صرف معاشی نظام بلکہ پورا نظامِ حکومت محض ایک چھوٹی سی جماعت کے اغراض کو پورا کرتا ہے اور جمہور کو ان مقاصد کے لیے آلہ کار بناتا اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کا نام جمہوریت (Democracy) رکھتا ہے۔

روم اور فارس کا نظام:

روما اور فارس کا پرشوکت تمدن اور اس کی خوش آئند حضارت (Civilization) دنیائے انسانی کو مطمئن تو کیا کرتے خود اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب افراد کے لیے بھی دعوتِ حق اور پیغامِ رفاہیت نہ دے سکے اور جو کچھ بھی کیا وہ سب طبقۂ امراء و سلاطین ہی تک محدود رہا خصوصاً فارس کا وہ نظام تو قابلِ ذکر بھی نہیں جو مزدک [1] کی تعلیم

---

(۱) مزدک مشہور فارسی فلسفی ۴۸۷ م میں پیدا ہوا۔ اس کا فلسفہ تھا کہ تمام انسان برابر پیدا ہوئے اور تمام اشیاء بالخصوص مال اور عورت میں وہ برابر کے شریک ہیں، لہٰذا تمام قسم کے اموال اور نساء (عورتوں) انسانوں کا مشترکہ سرمایہ اور ناطہ ہیں، لہٰذا نہ کسی نکاح کی ضرورت ہے نہ مال کی حفاظت کی۔ نامور مصنف اور مؤرخ علامہ شہرستانی لکھتے ہیں: ''احل النساء وأباح الاموال وجعل الناس شركة فيها كاشترا كهم في الماء والنار والكلاء'' (علامه شهرستاني: الملل والنحل: ج ۱ (بر حاشيه ابن حزم) ۱۳۴۴ھ، ۱۳۴۸ھ ص: ۸۶) ترجمہ: اس نے عورتوں کو (تمام انسانوں کے لیے) حلال کر دیا، اور اموال (Properties) کو مباح (Permissible) ٹھہرا دیا اور تمام انسانوں کو اس میں اس طرح شریک ٹھہرایا جیسے وہ پانی، آگ اور گھاس میں برابر کے شریک ہیں۔) اس کے فلسفہ کو نوجوانوں، مالداروں اور وڈیروں میں زیادہ پذیرائی ملی۔ اس کے دور کے حکمران قباذ ــــ جو ابتداءً بہت اچھا اور مقبول بادشاہ سمجھا جاتا تھا ــــ اس کے فلسفہ کا پیروکار اور حامی بن گیا اور حال یہ ہو گیا کہ سرکاری اہلکار کسی شہری کے گھر میں داخل ہو کر اس کے مال اور عورتوں پر قابو حاصل کر لیتے اور کوئی انکار یا رکاوٹ کرنے والا نہ تھا۔ عورتوں اور مردوں کے بے قید اختلاط (میل جول) کی وجہ سے ایک ایسی نسل تیار ہو گئی جہاں اولاد کے باپ کا پتہ تھا نہ باپ کی اولاد کا۔ علامہ طبری رحمہ اللہ کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں ''حتى صاروا لا يعرف الرجل ولده ولا المولود اباه'' (تاریخ طبری: ۲/۸۸) ترجمہ: یہاں تک کہ لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ کوئی شخص اپنے بیٹا کو پہچانتا نہ بیٹا اپنے

سے بہرہ اندوز ہوا، موجودہ ڈکیٹر شپ بھی امن و سلامتی کی جگہ قہر و غلبہ کی اور عام رفاہیت کی جگہ دنیائے انسانی کو محکوم بنانے کی ہنگامہ آرائیوں کے سوائے دنیا کو کچھ نہ دے سکی۔

اشتراکیت اور اشتمالیت (Socialism & Communism):

اشتراکیت اور اشتمالیت نے اگرچہ عام خوشحالی اور رفاہیت کا پیغامبر بننے کی بہت کوشش کی مگر ایک طرف خدا سے بغاوت کر کے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان انارکی (Anarchy) کا باعث بنی اور دوسری جانب طبقاتی جنگ (Class Struggle) کے مراحل میں الجھ کر رہ گئی اور عالمگیر پیامِ امن بننے کے بجائے وہ بھی ایک طبقہ کی مخصوص حکمرانی کی قائل نظر آنے لگی، فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ سرمایہ داروں (Bourgeoisie) کا نہیں مزدوروں کا طبقہ (Proletariats) ہے۔

صالح معاشی نظریے کی ضرورت:

بہرحال دنیا کے تمام نظامہائے حکومت اور دنیا والوں کی ہر قسم کی جد و جہد ہمیشہ اس مرحلہ میں ناکام رہی اور آج کی ہولناک جنگِ یورپ اس ناکامی کو اس طرح بر سر عام لا رہی ہے کہ تہذیب نو سے مرعوب ہونے والے انسان سرنگوں اور حیران نظر آرہے ہیں اور ان کو کوئی تاویل بن نہیں آتی۔

پس اب دو ہی مرحلے باقی ہیں یا دنیا ان ہلاکت آفرینیوں کا شکار ہو کر یکسر شر ہی شر بن کر رہ جائے اور یا پھر خیر اور حقیقی امن و سلامتی کی وہ دنیا بن جائے جس کا مظاہرہ اسلام آج سے چودہ سو سال قبل مکمل طور پر دور نبوت صلی اللہ علیہ وسلم، دور صدیقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دور فاروقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں کر چکا ہے۔

﴿فَأَمَّا ٱلزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِي

والد کو پہچانتا، اس طرح سارا ایران معاشی بحران، سماجی نراج اور شہوت رانی کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ (برائے تفصیل دیکھیے: ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، باب ۱ تذکرۃ ایران والحرکات الھدامۃ فیھا)

ٱلۡأَرۡضِۚ ﴾[1]

ترجمہ: سو جھاگ تو سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے وہ زمین میں باقی رہتا ہے۔

لہٰذا آج کی صحبت میں ہم اسلامی نظامِ حکومت کے اس شعبہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو ''اقتصادی نظام'' سے معنون ہے اور جس نے اپنے وجود کے حقیقی زمانہ میں دنیا کی تاریخ کے لیے یہ مواد بہم پہنچایا کہ اس نظام میں اگرچہ دفتری اقتدار کی وہ جگمگاہٹ موجود نہیں ہے جو آج انسانوں کو سادہ راحت و آرام اور قلبی اطمینان و سکون بخشنے کی بجائے ان کی مشکلات و مصائب میں دن بدن اضافہ کا سبب بن رہا ہے اور جس کی بدولت حکومتوں کا اربوں روپیہ غریبوں اور مفلوک الحال انسانوں کی فلاح و بہبود کی جگہ جنگ کے استحکامات (Strengthings of War) پر صرف ہو رہا ہے لیکن اپنی عملی جدوجہد میں وہ علم المعیشت کے حقیقی مقصد کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس کی تمام تر روح انسانوں کی خدمت، فارغ البالی (Well being) اور قلبی سکون و اطمینان کا باعث بنتی رہی ہے اس لیے اس میں نہ طبقاتی جنگ کی گنجائش ہے اور نہ اونچ نیچ (Inequality) کا وہ غیر فطری (Unnatural) فرق ہی موجود ہے جس سے ایک جماعت بے قید سرمایہ دولت کی مالک بن جائے اور دوسری اس کے سامنے دستِ سوال پھیلا کر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرے اور اس کے دستِ تظلم کا شکار بنے۔

صالح معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات:

قابلِ عمل اور مفید ہو:

الحاصل یہاں ایسے نظریئے (Theories) زیر بحث نہیں لائے جائیں گے جو اپنے منطقی استدلالات (Arguments) اور عقلی کاوشوں (Intellectual Gossips) کے اعتبار سے تو بہت بلند نظر آتے ہوں، لیکن ان کی عملی افادیت (Practical

---

(۱) القرآن سورۃ الرعد (۱۳): ۱۷

(Importance) یا تو صفر ہو یا پھر تمدن کے فاسد کرنے میں تیز گام، بلکہ یہاں ایک ایسے نظام سے بحث ہے جو کائنات ہست و بود کی دنیوی ضروریات اور عملی معیشت کے لیے بہترین نظامِ عمل (پروگرام) رکھتا ہو اور تجرباتی زندگی میں اس بات کا ثبوت دے چکا ہو کہ وہ انسانوں کا ان کے حقیقی آقا "خدا تعالیٰ" کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے اور ان کے اخلاق (کیرکٹر) کو بلند اور مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ ہر کہ ومہہ (All and Sundry) کے لیے یکساں معیشت کا کفیل رہا ہے اور انفرادی اور اجتماعی حیات کا ضامن اور طبقاتی جنگ کی جگہ عالمگیر اخوت کا پیغامبر ہے۔

ہمہ گیر عملی قدر و قیمت رکھتا ہو:

کسی نظریہ کے ساتھ اس کی "عملی قیمت (Practial Value) کا لحاظ' اس لیے ضروری ہے کہ بعض نظریئے اپنے منطقی دلائل کے اعتبار سے اگرچہ بہت زیادہ جاذبِ نظر اور دلکش معلوم ہوتے ہیں اور "علم المعیشت" کے مباحث میں ان کی بہت زیادہ اہمیت نظر آتی ہے، لیکن جب وہ عمل کی ترازو میں تولے جاتے اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں، تو ان کی قدر و قیمت بہت کم رہ جاتی ہے۔

مثلاً محنت (Labour) کا مفید مفہوم یہ ہے "وہ کام جس کا کچھ مادی معاوضہ ہاتھ آئے لیکن محنت کی علمی بحث میں" والدین کی خدمت اولاد کے لیے، عشاق کی ناز برداری اپنے محبوب کے لیے اور شوقین لوگوں کے لیے مشاغل تفریح طبع کے لیے یہ سب محنت میں شمار کیے جاتے ہیں اور محنت کے وسیع نظریہ کے پیشِ نظر زیر بحث لائے جاتے ہیں، تاہم علمائے اقتصادیات اس علمی نظریہ پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں:

یہاں وہ اصلی بحث سے متعلق نہیں ہیں، محض علمی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں ان کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوا ہے۔[1]

اس کے برعکس بعض نظریئے نئی اصطلاحوں، جدید تعبیروں اور مخصوص ماحول

(۱) علم المعیشت: ص ۶۸

کے اثرات کے پیشِ نظر اگرچہ پہلے نظریوں کے مقابلے میں ظاہری چمک دمک نہیں رکھتے لیکن عملی تجربہ میں ان کی افادیت بہت زیادہ ان کی پذیرائی بہت وقیع اور نظامِ معیشت میں ان کی درست کاری بے حد موزوں ثابت ہوتی ہے۔

لہٰذا کسی "عملی نظام" میں وہی نظریئے قابلِ قدر جگہ پانے کے مستحق ہیں جو تعبیری (Illustrative) نقطۂ نظر سے اگرچہ انقلاب آفرین اور مسحور کن نظر نہ آتے ہوں مگر عملی دائرہ میں اس قدر مفید اور ہمہ گیر ہوں کہ اگر ان کو دلیل راہ بنایا جائے تو بلاشبہ وہ ایک "صالح معاشی نظام" اور "امن عالم" کے کفیل ہو سکتے ہیں اور تمام انسانوں کی خوش حالی اور امن و عافیت کے راہنما بن سکتے ہیں۔

محکم و مضبوط بنیاد رکھتا ہو مگر لچکدار بھی ہو:

نیز ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو کہ جہاں وہ ایک طرف ایسی محکم بنیاد اور مضبوط اساس رکھتے ہوں کہ زمانے کے ہزاروں انقلابات اور بے شمار تاثرات اور ذہنی رجحانات کے باوجود ان کی اساس و بنیاد کا ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکے وہیں ان میں ایک ایسی لچک (Flexibility) پائی جاتی ہو کہ وہ وقتی تاثرات، ذہنی انقلابات و رجحانات اور نت نئے حوادثات کے لیے اپنی جزوی تفصیلات اور فروعی جزئیات میں وقت کی صحیح راہنمائی انجام دے سکیں۔ اور موجودہ دور کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ دنیا کے لیے بھی اسی طرح مشعلِ ہدایت کا کام دیں جس طرح گذشتہ دنیا کی عام فلاح و طمانیت کے لیے کامیاب ثابت ہو چکے ہیں اور یہ صرف وہی اصول ہیں جن کی روشنی میں اسلام کا معاشی نظام اپنے حقیقی دور میں ایک زرّیں تاریخ پیش کر چکا ہے اور جس کے لیے دوست اور دشمن دونوں نے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

الغرض، مذکورہ بالا تفصیلات کے پیشِ نظر یہ مناسب ہے کہ "اسلامی نظامِ معیشت" کو موضوعِ بحث بناتے وقت دنیا کے مختلف نظامہائے معاشی کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ عدل و انصاف کی روشنی میں یہ موازنہ ہو سکے کہ دنیا کے باقی نظامہائے اقتصادی میں اور اسلام کے نظامِ اقتصادی میں کیا فرق ہے اور یہ کہ

درحقیقت معاشی نظام کے حقیقی مقصد کو کون پورا کر سکتا ہے اور ان ہلاکت آفرین نظام ہائے حکومت سے نجات دلا سکتا ہے، جنھوں نے ''اقتصادی ترقی'' کے نام پر حیاتِ انسانی کو خس و خاشاک سے بھی زیادہ بے وقعت بنا دیا ہے اور جس انسان کی خوش حالی کے لیے یہ ڈھونگ رچایا گیا آہستہ آہستہ اسی کی تباہی و بربادی کا سامان مہیا کر دیا۔

ایک شبہ کا جواب:

آئندہ اوراق میں جس اسلوب کے ساتھ ''اسلام کے اقتصادی نظام'' کو پیش کیا جارہا ہے اس کے مطالعہ کے بعد سطحی نظر میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ موجودہ دور میں مختلف جماعتوں کے نام سے جس طرح منضبط نظریوں (Arranged Theories) مدون نظامِ عمل (Compiled System For Practice) اور مخصوص عنوانوں کے ساتھ معنون (Captioned) ''معاشی نظام'' ضخیم کتابوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور مستقل علم وفن (Science & Art) کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں، اس طرح ''اسلام کا معاشی نظام'' ایک جدا اور مستقل تدوین کی شکل و صورت میں مدون مخصوص نظریوں میں محدود اور خصوصی عنوانات سے معنون نظر نہیں آتا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے دورِ حاضر کی طرح یہ نہیں کیا کہ اول ''اقتصادی نظام'' کے نام سے ایک عنوان قائم کرتا اور اس کے تحت میں ایک خاص نظریہ یا چند مخصوص نظریئے بیان کرتا اور پھر ان نظریوں کے پیشِ نظر مختلف فصول و ابواب میں اس کے نظامِ علمی و عملی پر بحث کر کے کسی مخصوص نام کے ساتھ اس کو موسوم کرتا، لیکن اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ صرف اس لیے کہ موجودہ دنیا کے جس قدر بھی نظامہائے اقتصادی ہیں وہ عموماً انسانوں کے خود ساختہ اور ایسے فلسفہ پر مبنی ہیں جن میں روحانیت اور مذہب کو یا سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یا اس کی نہاد (Base) روحانیت اور مذہب کی مخالفت پر قائم کر کے اس کو فلسفیانہ رنگ میں ڈھال دیا ہے۔

اسلام کا صالح معاشی نظام:

اجمالی تعارف:

اس کے برعکس ''اسلام کا معاشی نظام'' ایک ایسے ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جس کا نام ''اسلام'' ہے جو عالمگیر دعوت اور ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے اور دنیائے انسانی کی ''صرف معاشی صلاح و فلاح'' کا ہی خواہش مند نہیں ہے بلکہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی معاشرتی اور معاشی، غرض ہر قسم کی دینی و دنیوی فلاح و بہبود اور رشد و ہدایت کا علمبردار ہے اور اس طرح ایک وسیع اور مکمل نظامِ کائنات کا مدعی ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کا منتہائے مقصد صرف دنیوی ترقی و کمال ہی نہیں ہے بلکہ سعادتِ ابدی اور رضائے الٰہی اس کی حیات کا کعبۂ مقصود ہے اس لیے وہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے ''ایک صالح نظامِ اجتماعی'' کا طالب ہے اور ان ہی شعبہ ہائے زندگی کا ایک شعبہ ''صالح نظام معاش''[1] (Righteous Economic System) بھی ہے۔ نیز اس کا دعوی

---

(۱) صالح: مؤلف رحمہ اللہ کی استعمال کردہ عربی اصطلاح (Term) ''صالح'' ایک کثیر المعانی Mulit Meanings اور کثیر الجہت Multi Diminisional ہے۔ اس کے لیے انگلش لغت (Dictionary) میں مترادفات اور متبادلات کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔ مثلاً Just (عادل) Beneficient (مخیر)، Generous (سخی، کریم) Rrformed (اصلاح شدہ) Well Being (رفاہی) Pure (پاکیزہ) (Practicable) (قابل عمل، عربی میں صالح للعمل) وغیرہا۔ مذکورہ مترادفات میں سے کسی ایک کو ''معاشی نظام'' کا لاحقہ کے طور پر لائیں آپ کو بامعنی نام مل جائے گا۔ مثلاً ''عادلانہ معاشی نظام''، ''مخیر معاشی نظام'' ''رفاہی معاشی نظام'' وغیرہا۔ مگر میری محدود سوچ کے مطابق صفت Righteous (صالح) اسلام کے اقتصادی نظام کے مفہوم اور روح کے قریب تر ہے یعنی اسلام ایسا صالح نظام اقتصاد دینا چاہتا ہے جو

❶ عادلانہ (Just) ہو، معاشی دست و برد (Economic Enploitation) سے پاک ہو جہاں طاقتور کمزور کا استحصال نہ کر سکے بلکہ معاشی نظام اس ظالم طاقت ور کا احتساب یقینی بنائے۔

❷ مخیر (Beneficient) ہو کہ محتاج کی کفالت کرنے والا ہو۔

❸ کریمانہ (Generous) ہو کہ محتاج کی محتاجی کا خود خیال کرے اور اس کی کفالت کر کے احسان نہ جتلانے والا ہو۔

❹ رفاہی (Well- Being- Welfare Oriented) ہو کہ فرد، معاشرہ، ریاست بلکہ پوری انسانیت کو فلاح کا راستہ دکھائے۔

=

❺ پاکیزہ ہو کہ ہمہ قسم کی معاشی آلائشوں مثلاً سود، جوا (Gambling)، سٹہ بازی، حرام کا کاروبار (مثلاً قحبہ گری (Prostitution) وغیرہ) کی کمائی، ناجائز ذرائع (مثلاً چوری، چکاری، ڈاکہ زنی، دھوکہ دہی، ملاوٹ وغیرہا) کی آمدن سے پاک ہو۔

❻ قابل عمل (صالح للعمل) (Practicable) ہو کہ ہر دور اور ہر معاشرہ کے انسان کی معاشی معاملات میں رہنمائی کر سکے، معاشی مشکلات کو حل کر سکے (اسلام کے معاشی نظام کے صالح للعمل) (Practicable) ہونے کی آج کی دلیل سود کے معاشی نقصانات کا اقرار اور اس کے خاتمہ کی کوشش کرنا ہے۔ آج (۸/اکتوبر ۲۰۰۸) کے امریکہ اور یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کو معاشی کساد بازاری (Economic Depression) نے آن گھیرا ہے ان تمام ممالک کے معاشی ماہرین (Economists) اور پالیسی سازوں (Policy Makers) نے اس کساد بازاری سے بچاؤ کے لیے جو اصلاحی تدابیر (Corrective Measures) استعمال کرنا شروع کی ہیں، ان میں سے پہلی تدبیر شرح سود کو کم کرنا ہے۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۸ کو فیڈرل امریکن ریزرو بنک (American Reserve Bank) نے شرح سود 5% کم کر دی تاکہ جاری معاشی بحران پر قابو پایا جاسکے، اس طریقہ کی سود کو قابل عمل اور مفید جان کر یورپی یونین کے ممالک، سوئٹزرلینڈ، جاپان وغیرہ نے اپنے بنکوں کو $2\frac{1}{2}$% شرح سود کم کرنے کی ہدایات جاری کر دیں (حوالہ بی بی سی، لندن اور وائس آف امریکا "ریڈیو آپ کی دنیا" اور دیگر عالمی میڈیاز (Medias) کی ۸/اکتوبر ۲۰۰۸ کی نشریاتی رپورٹس) پھر ۱۷ دسمبر ۲۰۰۸ کو امریکی مرکزی بنک نے شرح سود ۰۲۵% کر دی۔ کاش بحرانوں کا یہ الٰہی تازیانہ دنیا میں شرح سود کو صفر تک لے آئے جواب بالکل قریب ہے۔ کیا یہ اسلام کے صالح معاشی نظام کے نظریہ حرمت سود (Prohibition of interast) کے جبری اقرار کی دلیل نہیں ہے؟ میں نے اپنی محدود فہم کے مطابق "صالح" کا ترجمہ یا متبادل (Righteaous) کو اس لیے بھی ترجیح دی ہے کہ ہو سکتا ہے اس خطہ ارض پر رواج میں رہنے والے تمام معاشی نظاموں —— خواہ وہ کسی بھی نام سے رواج میں رہ چکے ہوں یا رواج پذیر ہوں —— میں سے کسی نے بھی کبھی یہ نہیں بتایا کہ فلاں معاشی سرگرمی (Economic Activity) یا فلاں معاشی طریقہ (Method - Mode) یا ذریعہ (Tool - Mean) دینی، اخلاقی یا معاشرتی طور پر حلال (Permitted - Lawful) ہے یا حرام (Illicit - Prohibited) ہے۔ ان تمام نظاموں کا لٹریچر اس قسم کی مفید تعلیمات سے بالکل خالی ہے۔ مگر اسلام چونکہ دنیا و آخرت دونوں کی فلاح (Welfare) اور کامیابی کا مذہب ہے جیسا کہ اس کے صالح معاشی نظام کے اولین ماخذ (Primary Source) کتاب اللہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنۡيَا حَسَنَةً وَفِي ٱلۡأٓخِرَةِ حَسَنَةً ﴿٢٠١﴾﴾ (البقرہ: ۲۰۱) ترجمہ: ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں خیر عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی سے نواز۔

لہٰذا اسلام کا صالح معاشی نظام وہ ہے جو اس قسم کی معاشی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتا جو اس کے پیروکاروں (Followers) کو دنیا و آخرت میں ناکام کرے، شاید دنیا میں چند روزہ خوشحالی مل جائے مگر کہیں آخرت کی ابدی رسوائی کا موجب نہ بنے۔

الحاصل "صالح" کا ترجمہ (Righteous) نہ صرف اس کے دیگر عام تراجم کا جامع ہے بلکہ حلال و حرام اور پاک و ناپاک کی حدود بھی متعین کر دیتا ہے۔ (واللہ اعلم)

ہے کہ "انسان" دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ حاکم مطلق (اللہ) کی نگرانی میں ایک ایسی حکومت برپا کرے جو "خلافت حقہ" کہلا سکے اور جس کا واضع قوانین (Law Giver) انسان نہیں بلکہ خود احکم الحاکمین ہو اور ان قوانین کی تنفیذ (Implementation) اس کے نائب "خلیفہ" کے ہاتھ میں ہو، اور یہ حکومت اگر ایک جانب خالص روحانی اور اخلاقی برتری کی معلم ہو تو دوسری جانب عالم و کائنات کی سیاسی، مدنی اور معاشی ترقی و کمال کی حامل بھی ہو۔

غرض ایسے "صالح نظام" کی حامل ہو کہ جس کی بدولت ساری کائنات نسل و قوم اور ملک و وطن کے محدود دائروں سے آزاد ہو کر یکساں طور پر عدل و نصفت (Equity) امن و طمانیت اور خوش حالی و معاشی رفاہیت سے مالا مال ہو کر اس اعتراف پر مجبور ہو جائے کہ وہ ابدی سعادت کے حصول میں بھی اس کو اپنا راہنما اور قائد تسلیم کرنے لگے، گویا اس کا "معاشی نظام" اس حیثیت سے ایک فلسفیانہ علم و فن نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی کاوشوں اور علمی و عملی موشگافیوں میں الجھا کر اصل مقصد سے محروم کر دے، بلکہ یہ "معاشی نظام" شعبہ ہے ایک مکمل نظام کا اور آلہ کار اور وسیلہ ہے مقصدِ حقیقی کے حصول کی آسانی راہ کا۔

بہرحال جبکہ اسلام کی دعوت اور اس کا پیغام کائنات کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی اور اس کا طریق کار ہمہ گیر اور عالمگیر وحدتِ اجتماعی کا مبلغ ہے اور اس لیے اس کی رشد و ہدایت نہ صرف دنیوی زندگی تک محدود ہے بلکہ "سعادتِ دارین" سے وابستہ اور قائم ہے اور دنیوی زندگی کی سعادت ابدی سعادت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ ہے تو بلاشبہ اس کے لیے کسی طرح یہ موزوں نہیں تھا کہ وہ زندگی کے اس مخصوص شعبہ (معاشی نظام) کو اپنے مکمل نظام سے علیحدہ کر کے ایک خاص محدود نظریہ اور خاص عنوان کے ساتھ ایک علیحدہ نظام کی حیثیت دیتا۔

بے شبہ وہ ایک "صالح معاشی نظام" کا مالک ہے، مگر وہ نظام بھی تمام دوسرے نظامہائے زندگی کے اصول و آئینِ اساسی کی طرح ایک مکمل نظامِ قانون (قرآن عزیز)

کا جز ہے اور اس سے علیحدہ اپنی مستقل زندگی نہیں رکھتا۔

دنیا کو اسلام کے صالح معاشی نظام کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے:

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (۱) نے اپنی مشہور کتاب حجۃ

(۱) شاہ ولی اللہ، قطب الدین احمد بن عبدالرحیم مشہور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ بروز بدھ ۴/ شوال ۱۱۱۴ھ بمطابق ۲/ فروری ۱۷۰۳ء دہلی میں پیدا ہوئے سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شیخ الحرم حضرت ابو طاہر مدنی رحمہ اللہ سے اکتساب علم و فضل کیا۔ آپ کو اللہ کریم نے گوناگوں خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا۔ آپ بیک وقت محدث، مفسر، فقیہ، مدرس، فلسفی اور سیاست دان تھے۔ آپ نے پاک وہند کے مسلمانوں کے کے لیے تبلیغی، تدریسی، تصنیفی، تحقیقی، روحانی، علمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی گویا ہر میدان میں کام کیا پھر آپ کے صاحبزادگان حضرت مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا عبدالعزیز، مولانا رفیع الدین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام کو آگے بڑھایا۔ مولانا شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کا پہلا اردو ترجمہ کیا اور اتنا عمدہ اور تحت اللفظی کہ علماء اسلام کی رائے میں کہ اگر قرآن اردو میں اترتا تو اس طرح ہوتا۔ یہ آج تک مقبول عام و خاص ہے۔ میرے خیال میں برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کا کوئی دینی اور علمی گھرانا ایسا نہیں ہوگا، جس پر آپ رحمہ اللہ اور آپ کی اولاد کے دینی و علمی احسانات نہ ہوں اور آپ کے شجرہ طوبیٰ سے فیض یاب نہ ہو۔ آپ نے اپنی تحریک کا آغاز اس وقت کیا جب مسلمانوں پر ہر طرف سے ادبار چھایا ہوا تھا اور مزید کے لیے گھنگھور گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔ آپ نے اہلیانِ ہند کی قابل رحم حالت پر ترس کھاتے ہوئے بیرون ہند کئی مقامات کا دورہ کیا مختلف حکمرانوں جن میں نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی ایسے اشخاص شامل ہیں سے رابطہ کیا اور انہیں ہندوستان کے مصیبت زدہ مسلمانوں کی مدد کے لیے پکارا۔ آپ نے مسلمانوں کو جہاد کرنے کا درس دیا اور انہیں اسلامی فوج تیار کرنے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کیا۔

آپ رحمہ اللہ نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد رکھی جس نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد، معاشرتی برائیوں اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف جہاد کیا اور اسی سلسلہ کو آگے بڑھا کر آپ رحمہ اللہ کے بعد علماء اسلام نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جو آزادی ہند کا نقیب اور منبع و مرکز بنا اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کا موجب بھی۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی دینی خدمات و تصنیفات ہیں جو تمام عالم اسلام میں مقبولیت اور سند کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر میں فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن، تفسیر فتح الخبیر اور الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، حدیث نبوی میں، موطا امام مالک رحمہ اللہ کی عربی اور فارسی شرح بنام المسوی اور المصفّی، فلسفہ اسلام میں ”حجۃ اللہ البالغہ“ جو اپنی جامعیت میں عقائد، عبادات، فقہ، حدیث، معاش، معاشرت اور سیاست، تاریخ وغیرہا سب کو شامل ہے، تصوف میں فیوض الحرمین، فقہ اور اصول فقہ میں عقد الجید فی احکام الاجتہاد =

اللہ البالغہ میں ''صالح اقتصادی نظام کی ضرورت پر'' بحث کرتے ہوئے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ اسلام میں ''اقتصادی نظام'' کا اخلاقی اور مذہبی نظام کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہے؟ فرماتے ہیں۔

پارسیوں اور رومیوں کی معاشی بے اعتدالیاں:

جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انھوں نے اپنی زندگی بنالیا اور آخرت تک کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان کا ہر شخص سرمایہ داری اور تموّل پر فخر کرنے اور اترانے لگا، یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بے جا عیش پسندوں کو دادِ عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول و منہمک رہنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہو سکتے اور کس طرح ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا ان کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں اور صبح و شام رقص و سرور کی محفلیں سرگرم ہوں اور جام سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں

والتقلید اور الانصاف فی بیان سبب الاختلاف فی الاحکام الفقہیۃ تاریخ میں ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء وغیرہا مشہور ہیں۔

آپ نے ۱۱۷۶ھ میں دہلی وفات پائی (تفصیل کے لیے دیکھئے: موطا امام محمد رحمہ اللہ، مطبوعہ پاک و ہند کا مقدمہ، ص ۲۵ اور دیگر کتب تاریخ ہند)

جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصۂ طولانی کے مرادف ہے۔

مذکورہ معاشی بے اعتدالیوں کے مہلک اثرات:

گمراہ کن عیش اور مضر معاشی تصرفات:

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے "معاشی نظام" کا اصل الاصول بن گیا تھا، اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا اور عوام و خواص سب میں یہی جذبۂ فاسد پایا جاتا اور ان کے "معاشی نظام" کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔

امن و سکون کی بربادی اور معاشی دست و برد کا آغاز:

نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا، نا امیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی، اس لیے کہ ایسی مفرطانہ (Extravagant) عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی البتہ اس کے لیے بادشاہ اور نو امراء اور حکام نے معاشی دستبرد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کار پردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر اُن کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں، خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔

فاسد معاشی نظام کی بنیاد:

اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اُخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ بندگی جوڑنے کے لیے بھی مہلت نہ ملتی تھی اور اس ”فاسد معاشی نظام“ (Daterriorative / Corrupt Economic Order) کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظامِ عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر یک قلم متروک ہو گئیں اور امراء و رؤسا کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ (Profession) شمار ہونے لگا، اور جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی۔ اور ان میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا، مثلاً ایک طبقہ جہاد کیے بغیر باپ دادا کے نام پر مجاہدین کے نام سے وظیفہ خواری کر رہا ہے، تو دوسرا مدبرین (Advisors) مملکت کے نام سے پل رہا ہے، کوئی بادشاہ اور امراء کی خوشامد میں قصہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ (Grant) پا رہا ہے تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے زمرہ میں مالی استحصال کر رہا ہے۔

کسب معاش کے باوقار طریقوں کا فقدان:

خلاصہ یہ کہ کسبِ معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور درباری داری کو ذریعۂ معاش بنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشو و نما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست وارزل زندگی (Lowest Standard of Life) پر قانع کر دیا تھا۔

پس جب یہ فاسد مادہ وباء کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو اُن کے نفوس دنائت و خست (Meanness) سے بھر گئے اور ان کی طبائع اخلاق صالح سے نفرت کرنے لگیں اور ان کے تمام اخلاقِ کریمانہ کو گھن لگ گیا اور یہ سب اس ”فاسد معاشی نظام“ کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما

تھا۔

بعثت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) فاسد معاشی نظام کا خاتمہ اور صالح معاشی نظام کا آغاز:

آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے، اس نے ایک نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا، وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظام میں فارس و روم کے فاسد (Deteriorative / Corrupt) نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی دستبرد کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیاتِ دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں مثلاً مردوں کے لیے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا (Silky) کے نازک کپڑوں کا استعمال اور تمام انسانی نفوس کے لیے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالی شان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں۔

بہرحال خدا تعالیٰ نے اس ہستی کو اخلاقِ کریمانہ اور نیک نہادی کے لیے معیار اور طاہر و پاک امور کے لیے میزان بنا دیا۔ (۱)

اسی طرح ''ارتفاقات'' پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ، مطبع منیریہ، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ، ج ۱، باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم، ص ۱۰۴

''یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اگرچہ بالذات عبادت الٰہی سے متعلق ہے مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسومِ فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے، اسی لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق [1]

ترجمہ: میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کروں۔

اور اسی لیے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں ''رہبانیت'' کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے، لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو۔

پس اس مقام پر دو متعارض قیاس (Contradictory Analogies) کام کر رہے ہیں، ایک یہ کہ نظامِ معیشت میں دولت و ثروت ایک محبوب و محمود (Appreciated) شے ہے اس لیے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا اور اس سے ان کے اخلاقِ کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو اس لیے کہ بکیسانہ و

(۱) امام مالک نے مؤطا میں اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں اس حدیث میں ''مکارم'' کی جگہ ''حسن'' ذکر کیا ہے دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی عمدہ، اچھا۔ ان کی روایت کردہ حدیث بھی پڑھ لیجئے۔ ''عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بعثت لاتمم حسن الاخلاق'' (كذا في مشكوة، باب حسن الخلق، الفصل الثالث) ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔ جبکہ ''مکارم الاخلاق'' والی حدیث کے راوی حضرت مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ (مشکوۃ باب حسن الخلق، فصل ثالث)

مجبورانہ افلاس (Heedless and Bounded Poverty) سوءِ تدبیر (Mal - Administration) اور مزاج کے اختلال (Upset) کا باعث ہوتا ہے دوسرے یہ کہ نظامِ معیشت میں دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے، جبکہ وہ باہمی مناقشات اور بغض وحسد کا سبب بنتی اور خود اہل دولت و ثروت کے اطمینانِ قلب کو تعب اور حریصانہ کد و کاوش (Tiresome & Greedy Struggle) کے زہر سے مسموم (Poisoned) کرتی اور قوموں کو استحصال بالجبر (Forced Exploitation) اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لیے آمادہ کرتی ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت اور یادِ الٰہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مصائب کا دروازہ کھولتی ہے لہذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت "نظام معیشت" میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم ہو اور افراط و تفریط (Excess and Less) سے پاک ہو۔[1] اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔

پس اسلام نے اپنا یہ فرض اس طرح انجام دیا کہ اسود و احمر، عجم و عرب غرض تمام عالم کے لیے اپنے مکمل نظام (قرآن) میں نظام اقتصادی سے متعلق چند اصول اور اساسی قوانین بیان کر دیئے جو رہتی دنیا تک ہر "عقل سلیم" اور "فطرت مستقیم" کے نزدیک یکساں طور پر واجب العمل اور قابلِ قبول ہوں اور اس کی تشریح و تفسیر میں دورِ نبوت و خلافت راشدہ نے وہ عدیم النظیر عملی پروگرام پیش کیا جس کے حسن و کمال کا اعترافِ دوست اور دشمن دونوں نے یکساں طور پر کیا اور جو کتابی فن بننے کی جگہ اپنے مقصدِ وجود کے لحاظ سے ہر فردِ انسانی کی خوشحالی اور رفاہیت کا حامل ثابت ہوا۔

الحاصل، اسلام کا پیش کردہ "اقتصادی نظام" جو آئندہ صفحات میں سپردِ قلم کیا جارہا ہے ان ہی اصولوں پر مبنی ہے، جن کا داعی قرآنِ عزیز ہے اور جن کی شرح و تفسیر "احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم" اور "اسلامی فقہ" نے بیان کی ہے۔

---

(۱) شاہ ولی اللہ: مختصر از حجۃ اللہ البالغہ، مطبع منیریہ، قاہرۃ ۱۳۵۲ھ، ج ۱، اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم، ص ۱۰۴ و ۲/ ۱۰۵، ۱۰۶

اس تمہید کے بعد یہ مناسب ہے کہ اول ان مبادیات کو بیان کر دیا جائے جو ایک "صالح معاشی نظام" کے لیے "اصولِ موضوعہ" کی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر اسلام کے "معاشی نظام" کی وضاحت کی جائے اور اس کے بعد اسلامی معاشی نظام کا دوسرے نظامہائے معاشی سے موازنہ کیا جائے تاکہ اصل حقیقت منقح اور روشن ہو جائے۔

اصول موضوعہ (Declaratory Principles)(۱)

کائنات ہست و بود میں "ایک صالح معاشی نظام" کی اس لیے ضرورت پیش آتی

(۱) اصول موضوعہ: علماء اصول ـــــ جنہیں فقہ کی اصطلاح میں اصوبی (Usuli) بھی کہتے ہیں اور جن کا کام ادلۂ شریعۃ (Shar`i Arguments) یعنی قرآن مجید، حدیث و سنت نبوی، اجماع (Consensus of Jurests) اور قیاس (Analogy) کے ذریعہ نت نئے پیدا ہونے والے معاشی اور دیگر مسائل کے حل سے متعلق فیصلہ کرنا ہوتا ہے ـــــ کے نزدیک اصول موضوعہ ایسے اصول (Basic Principles) ہیں جن کا پہلے سے اپنا وجود نہیں ہو گا مگر انہیں خاص سبب (ضرورت) یا شرط یا مانع (رکاوٹ) کو دور کرنے کے لیے وضع کیا (بنایا) جاتا ہے۔ مثلاً معاہدہ بیع (Contract of Sale) کا سبب اس کا انسانی ضرورت ہونا ہے، مگر اس معاہدہ کی تکمیل اس وقت ہو گی جب مبیع (Good Or Property For Sale) پر خریدار کا قبضہ ہو جائے، لیکن اگر مبیع مقام بیع (Point of Sale) پر موجود نہ ہو یا موجود تو ہو مگر عیب دار ہو اور خریدار کے اسے دیکھنے پر اس میں وہ عیب (Defect) معلوم ہو جائے تو یہ موقع پر مبیع کی عدم موجودگی یا اس کا عیب خریدار کے قبضہ کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔ لہٰذا یہاں معاہدہ بیع کی اجازت مبیع (مال) کا خریدار کے قبضہ میں آنا اور قبضہ میں آنے کی راہ میں جو رکاوٹ ہو اسے دور کرنے کے لیے جو اصول و قواعد وضع کیے (بنائے) جائیں گے، وہ اصول موضوعہ کہلائیں گے۔

معاشیات کی اصطلاح میں اصول موضوعہ (Derived Principles) ایسے اصول ہو سکتے ہیں جنہیں انسان کی معاشی فلاح (Economic Wefare) اور اس کے حصول اور اس حصول کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ اور معاشی طریقہ یا نظام ـــــ خواہ وہ فرد کا ہو یا معاشرہ کا، قومی ہو یا بین الاقوامی ـــــ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان فلاحی اصول موضوعہ کے تابع ہو تاکہ معاشی نظام یا طریقہ (Methaod) کے وضع کرنے کا سبب (یعنی انسانی فلاح کی ضرورت) اس کی شرط (یعنی اس کا نظام یا طریقہ کی کامیابی کے لیے تمام ضروری وسائل کا ہونا) اور رکاوٹ (یعنی انسانی فلاحی نظام کی راہ میں حائل رکاوٹ) کو دور کر سکے۔

فاضل مصنف رحمہ اللہ نے معاشی نظام کے جو اصول موضوعہ (Declaratory Or Derivad Principles) بیان فرمائے ہیں وہ ایسے اصول ہیں جن کے ذریعہ سے معاشی نظام کے اعلیٰ مقاصد ـــــ انسانی فلاح، اس کے لیے ذرائع کا حصول اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں مثلاً ارتکاز و اکتنازِ دولت، معاشی وسائل پر طاقتوروں کا قبضہ، کمزوروں کا استحصال، محنت و سرمایہ میں ظالمانہ رواج اور طریقے وغیرہا) کو دور کرنا کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ موجود ہے کہ اس کو خدائے تعالیٰ کی بخشی ہوئی زندگی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مگر یہ انفرادی جذبہ جب زندگی کی کشمکش اور وسائلِ حیات کی کشاکش میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے تو قانونِ فطرت جو کہ خدا تعالیٰ کی جانب سے تمام کائنات پر حاوی ہے، ہر ایک انسان کو اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن یہ حیاتِ اجتماعی بغیر کسی ایسے نظام کے متصور نہیں ہو سکتی جب تک ان کے درمیان ایسا تعاون و اشتراک موجود نہ ہو جس کی بنیاد عدل اور حقِ معیشت کی مساوات پر قائم ہو تاکہ وہ "صالح معاشی نظام" کے لیے کلید بن سکے اور اس قسم کا تعاون و اشتراک جب ہی عالمِ وجود میں آسکتا ہے کہ نظامِ معاشیات میں حسبِ ذیل اصول کارفرما ہوں:

1. وہ نظام ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور اپنے دائرہ عمل میں کسی بھی فرد کو معاشی زندگی سے محروم نہ رکھتا ہو۔
2. ایسے اسباب و وسائل کا قلع قمع کرتا ہے جو معاشی دستبرد کا موقعہ مہیا کر کے افرادِ انسانی کے درمیان ظلم و استبداد کی راہیں کھولتے اور معاشی نظام کے فساد کا موجب بنتے ہوں۔
3. دولت اور اسبابِ دولت کو کسی خاص فرد یا محدود جماعت کے اندر سمٹ آنے اور اس فرد یا جماعت کو نظامِ معیشت پر قابض و مسلط ہونے سے باز رکھتا ہو تاکہ معاشی نظام تمام کائناتِ انسانی کی فلاح کی بجائے مخصوص طبقوں کے اغراض کا آلۂ کار بن کر نہ رہ جائے۔
4. محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن (True Balance) قائم کرتا اور ایک کو دوسرے کی حدود پر غاصبانہ دستبرد سے بچاتا ہو۔

معاشیات کے جدید نظریئے (Modern Theories of Economics):

ان اصولوں پر تفصیلی نظر ڈالنے سے قبل یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ موجودہ علمی دور میں "علم معاشیات" کے متعلق جو موشگافیاں کی گئی ہیں ان کا حاصل یہ ہے

کہ معاشیات پر جن نقطۂ ہائے نظر سے بحث کیا جانا ممکن ہے، وہ تین ہیں ”مابعد الطبیعاتی علمی نقطۂ نظر“ (Meta Physical Scientific Point of View)، ”طبیعاتی علمی نقطۂ نظر (Physical Scintific Point of View) اور ”تمدنی نقطۂ نظر (Social Point of View) اور علماء معاشیات ان کو حسبِ ترتیب، معیاری نقطۂ نظر، ترتیبی نقطۂ نظر (Ordinal Point of View) اور افہامی نقطۂ نظر سے تعبیر کرتے ہیں۔

معاشیات معیاری (Normative Ecomomics):

معاشیات معیاری کسے کہتے ہیں اس کو معاشیاتی علوم کے ایک بڑے ماہر کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

معاشیات معیاری کا مقصد معیشتِ موجودہ کی تشریح اور توجیہ نہیں بلکہ ”معیشتِ صحیحہ“ کا پتہ چلانا ہے، وہ محض یہ معلوم کرنے پر قانع نہیں کہ معاشی کل پرزے کیسے کام کرتے ہیں، بلکہ وہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ معاشی کل ہونی کیسے چاہیے؟

معاشیات معیاری کا مطمح نظر بہت بلند ہے وہ تو مقاصدِ معاشی کی تعیین (Determination) کرنا چاہتی ہے اور اس تعیینِ مقاصد کو وہ ”علم“ (Science) کا کام بتاتی ہے، وہ ان ازلی اور ابدی (Eternal) قوانین کے انکشاف کو اپنا فریضہ عملی جانتی ہے جو سارے عالم اخلاقی میں رائج ہیں اور جن کے زیر فرمان معیشتِ انسانی کا علاقہ بھی ہے، ان کا مقصدِ تلاش اور مطلوبِ جستجو ”معیشت صحیحہ“ (Righteous Economics) ہے، یعنی وہ معیشت جو مقصدِ حیاتِ انسانی اور مقصدِ کائنات کے مطابق اور ان سے ہم آہنگ ہو، یہی معیشتِ صحیحہ وصالحہ ان معیاریوں (Proposers and Followers of Normative Economics) کا مرکزی تصور ہے جس سے دوسرے تمام مسائل مثلاً ”مناسب اور صحیح اجرت،“ ”مناسب اور صحیح قیمت“ ”مناسب اور صحیح تقسیمِ دولت“ ”سود کا جواز وعدم جواز“ خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ ان کے نظام میں قدرِ اعلیٰ (High Value) ”معیشتِ صحیحہ“ ہے باقی سب اس سے ادنی اور اس کے

ماتحت قدریں ہیں، معاشیات کا کام یہ ہے کہ اس قدرِ اعلیٰ کا پتہ چلائے ماتحت قدروں کی اس سے مناسب و مطابق تشکیلات (Formation) کو معلوم کرے اور جو معاشی ادارے (Economic Institutions) واقعی موجود ہیں ان کو اس معیار پر پرکھ کر ان کے کھرے کھوٹے، صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے۔[1]

ترتیبی معاشیات (Ordinal Economics):

"ترتیبی معاشیات"[2] علم طبعیات کی ایک شاخ ہے جو علوم طبیعی کی اساس و بنیاد پر اپنی عمارت استوار کرتی ہے۔ مگر عملی زندگی میں اس کی قدر و اہمیت کے

---

(۱) ذاکر حسین، ڈاکٹر: معاشیات، مقاصد و منہاج: ص ۱۰، ۱۱

(۲) ترتیبی معاشیات (Ordinal Economics) کا تصور دینے والے وہ معیشت دان تھے جنہوں نے افادہ (Utility) کی ترتیبی پیمائش (Ordinal Measurement) کا نظریہ دیا، جس کے مطابق کسی شے (Good) کے استعمال سے اس سے حاصل ہونے والے افادہ کی ترتیبی پیمائش ممکن ہے یعنی اس شے (Good) مثلاً سیب کی اکائیوں (Units) کے ترتیب وار (مثلاً پہلا سیب، دوسرا سیب، تیسرا سیب وغیرہا کے) استعمال سے اُن اکائیوں میں سے ہر ایک کا ترتیب وار افادہ ماپا جا سکتا ہے اس نظریہ سے انہوں نے معاشیات کو افادہ کا علم بنانے میں سائنٹفک بنیادوں پر کام کیا۔ اس سے قبل افادہ کو عددی شکل (Cardinal) (یعنی ۱، ۲، ۳، ۴ آگے تک عددی طور پر قابل پیمائش تصور کیا جاتا رہا ہے اور ہے بھی۔ مختلف اشیاء کو باہم جمع بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک شے سے حاصل ہونے والا افادہ کسی دوسری شے کے صرف (Consumption) سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ ہر شے کا افادہ الگ الگ وجود رکھتا ہے۔ اور مختلف اشیاء سے حاصل ہونے والا افادہ جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریہ کے مؤیدین (Supporters) میں جرمن معیشت دان گوسن (Gossen) (۱۸۱۰ء تا ۱۸۵۸ء)، پروفیسر جیونز (Prof Jevons) (۱۸۳۵ء تا ۱۸۸۲ء) اور والرس (Walres) (۱۸۳۴ء تا ۱۹۱۰ء) شامل تھے۔ بعد کے معیشت دان جن میں ارونگ فشر (Irving Fisher) اور پروفیسر ایجورتھ قابلِ ذکر ہیں —— نے اس نظریہ پر اعتراض کیا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ افادہ ایک نفسیاتی کیفیت (Psychological Condition) کا نام ہے، جس کی پیمائش ممکن ہی نہیں۔

لہٰذا اٹلی کے مشہور معیشت دان ویلفرڈ پریٹو (Velfredo Pareto) (۱۸۴۸ء تا ۱۹۲۳ء) نے افادہ کی ترتیبی پیمائش (Ordinal Measurement) کا نظریہ پیش کیا اس ترتیبی پیمائش نے نظریہ مختتم ترجیح (Theory of Marginal Preference) کو جنم دیا یوں معاشیات نے افادہ کا علم (Science of Utility) کا رخ اختیار کیا اور یہ علم ترتیبی معاشیات (Ordinal Economics) کا روپ دھارتا نظر آیا۔ جو بعد میں اثباتی معاشیات (Ppsitive Economics) کی اصل یا شاخ بن گیا۔

اعتراف کے باوجود اس کا سنگ بنیاد کیا ہے؟ وہ محترم مصنف کے اس پارۂ بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان تینوں گروہوں (معروضیے(Objectivists)، موضوعیے (Subjectivists)، ریاضیاتی (Mathematicians) میں قدر مشترک یہ ہے کہ سب کے سب فلسفہ کے مقابلہ میں ''علم'' کے حامی ہیں یعنی جو کچھ ہے اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہونا چاہیے اس سے سروکار نہیں رکھتے، تمام مافوق التجربہ(Above Experiment) اور مابعد الطبیعی (Meta Physical) عناصر سے اپنے علم کو پاک اور صاف رکھنا چاہتے ہیں اور معاشیات میں اخلاقی احکام کے سختی سے مخالف ہیں، ان سب کے نزدیک علوم طبیعی زیادہ مکمل علوم ہیں انہیں سے تمام دوسرے علوم میں خصوصاً معاشیات میں نمونہ کا کام لینا چاہیے۔ لہذا ترتیبی معاشیات کا مقصد یہ ہے کہ قوانین مرتب کرے تاکہ ہر منفرد مظہر معاشی(Every Individual Economic Activity) کو کسی قانون کے تحت میں بہ حیثیت ایک مخصوص دفعہ کے لایا جاسکے کہ یہی ان کے نزدیک علم کی کل کائنات ہے۔[1]

علم المعیشت کے مشاہیر علماءِ یورپ اسی نظریئے کے حامی ہیں مثلاً جان اسٹارٹ مل(Jahn Staurt Mill) کارل منگر(Karl Minger) کارل مارکس(Karl Marx) پریٹو(Pareto) وغیرہ۔

افہامی معاشیات(Emperical Economics):

''افہامی معاشیات'' کو علم تمدن(Social Science) کا ایک جزء سمجھنا چاہیے اور تمدن سے بھی وہ تمدن مراد ہے جو انسان ہی کا تمام ساختہ پرداختہ (Man Made) ہے اس لیے کہ افہام کی بنیاد و اساس اس اصول پر قائم ہے کہ ہم جنس(Homogenous) ہی کے لیے ہم جنس کا سمجھنا ممکن ہے، چنانچہ اس کی تعبیر یوں کی جاتی ہے:

''افہام کا یہ نظریہ علم ان بنیادی افکار پر مبنی ہے کہ ہم جنس کا علم یعنی

(۱) حوالہ بالا: ص ۵۷

ہم جنس کا سمجھنا ہم جنس ہی کے لیے ممکن ہے اور یہ کہ ہم پورے طور پر اور ہر پہلو سے اس چیز کو جان سکتے سمجھ سکتے ہیں جسے ہم بنا بھی سکیں، مظاہر تمدن کے فہم کی کوشش میں چونکہ مدرک (Grasper) بھی ذہنی ہے اور مدرک (Grasped) بھی تشکیل ذہنی، اس لیے دونوں ہم جنس ہیں اور اس لیے پورا علم ممکن ہے، پھر سارا تمدن آدمی کا ساختہ پرداختہ ہے اسی نے اسے بنایا ہے اس لیے یہ اسے سمجھ سکتا ہے، قدرت چونکہ ذہنِ انسانی کی خارجی شکل (Apparent Shape) نہیں ہے بلکہ امر الٰہی کی خارجی تشکیل (Apparent Formation) ہے، قدرت انسان کی ساختہ پرداختہ بھی نہیں ہے اس لیے قدرت کا سمجھنا قدرت کا پورا پورا حقیقی علم ذہن انسانی کے لیے ممکن نہیں ہے، لیکن معاشیاتِ افہامی چونکہ صرف تمدن کے ایک ٹکڑے کو سمجھنا چاہتی ہے، متمدن زندگی یا انسانی زندگی کے مقصد و منشاءِ مضمر کا پتہ چلانا نہیں چاہتی، اسی لیے افہامی معاشیات فلسفہ یا مابعد الطبیعات یا مذہب نہیں بلکہ سیدھا سادہ تجربی (Experimental) جماعتی (Collective) تمدنی (Social) علم ہے۔"[1]

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۷۹، ۸۰، الغرض یہ تو معاشیات کے وہ نظریے یا پہلو یا اقسام ہیں جو آج سے تقریباً ایک صدی قبل حضرت مؤلف رحمہ اللہ کے دور میں موجود تھے کیونکہ مؤلف کی اس کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" کا پہلا ایڈیشن آج سے ۷۲ سال قبل ۱۳۵۸ھ، ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر ہند کی کتاب "معاشیات، مقصد و منہاج" ـــــ جس سے مؤلف نے معاشیات کی ان قسام کے نظریات کو لیا ہے وہ اس سے کئی سال پہلے چھپی ہوگی۔ گو ان کا تذکرہ اپنی اہمیت رکھتا ہے اور کسی نہ کسی نئے نام یا اصطلاح (Term) سے ان کا استعمال جدید معاشیات میں موجود رہے گا۔ مگر جدید معاشیات اپنی بڑھتی ہوئی اہمیت اور زندگی کے مختلف مسائل کو زیرِ بحث لانے اور اُن سے حاصل شدہ نتائج کو ان کے حل کے لیے استعمال کرنے کی بنا پر اس کی روز بروز شکلیں پہلو اور اقسام بدلتی اور بڑھتی جارہی ہیں اور نئے نئے ناموں سے سامنے آرہی ہیں مثلاً نظریاتی معاشیات (Theoretical Economics)، پالیسی معاشیات (Policy Economics)، اطلاقی معاشیات (Applied Economics)، معیاری معاشیات (Normative Economics)، بیانیہ معاشیات (Descriptive Economics)، زرعی معاشیات (Agriculturar Economics)، صنعتی معاشیات (Industrial

(Economics) اور نہ جانے کیا کیا کچھ؟
مگر جدید معیشت دانوں نے معاشیات کی مذکورہ تمام اقسام یا پہلوؤں کو دو قسموں کے تحت بیان کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اور اس پر آج کل وہ عمل پیرا بھی ہیں، جدید معیشت دانوں نے گاہے انہیں معاشی تجزیہ کے دو انداز (Two Approaches To Economics Analysis) کا نام بھی دیا ہے۔ یہ دو انداز یا پہلو ہیں: ① جزوی یا جزئی معاشیات (Micro- Economics) ② کلی یا کلیاتی معاشیات (Macro- Economics)۔ آئیے ان کا تعارف کرادوں۔

❶ جزوی معاشیات میں کسی معاشی نظام کو بنانے یا جاننے کے لیے اس کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں یا اس کے الگ الگ شعبوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے مثلاً ملکی صنعت میں صرف فولاد یا ٹیکسٹائل یا آٹا کی صنعت کا ذکر کرنا بلکہ ٹیکسٹائل کی صنعت (Textile Industry) کا جائزہ لیتے وقت اس کے کسی ایک یونٹ ہی کا تجزیہ کرنا یا قیمتوں کا جائزہ لیتے وقت کسی ایک خاص شے (Good) مثلاً پٹرول یا چینی یا آٹا وغیرہ کی قیمت کا جائزہ لینا۔ گویا بقول پروفیسر سموئیل سن (Prof .Semuel Son) جزوی معاشیات میں کسی معیشت کے جزئی یا انفرادی اجزاء و عناصر کے رویے (Behaviour) کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی خاص ایک شے (Good) کی قیمت کا تعین یا کسی ایک صارف (Consumer) کا طرز عمل یا کسی ایک کاروباری ادارہ کے رویہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جدید معاشیات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ۱۹۳۶ء تک کے تمام معاشی لٹریچر پر جزئی معاشیات کا غلبہ تھا، یہاں آپ کو زیادہ تر زور فرد، فرم صنعت کے رویہ اور نظریہ قیمت (Price Theory) پر ہی نظر آئے گا۔

❷ کلی معاشیات میں کسی ملک یا نظام کے معاشی معاملات کو بحیثیت کل (As aWhole) زیر بحث لایا جاتا ہے اس کے معاشی مجموعات کا مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً قومی پیداوار، قومی آمدن، قومی اخراجات، روزگار کی مجموعی حالت، قومی قرضے، قومی بجٹ، برآمدات و درآمدات (Exports & Imports) وغیرہا مگر جے ایم کینز (John Maynard Keyns) نے ۱۹۴۰ء، ۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری کے نقصانات سے متاثر ہو کر ۱۹۳۶ء میں اپنی مشہور کتاب روزگار، سود اور زر کا نظریہ عام (General Theory of Employment, Interest and Money) لکھ کر دراصل کلی معاشیات کا آغاز کیا۔ مگر عملی معاشی معاملات اور رویوں میں یہ دونوں انداز یا پہلو ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو جاتے ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے مثلاً کوئی ملک بحیثیتِ مجموعی صنعت میں ترقی پذیر ہو مگر کوئی خاص صنعت زوال پذیر ہو یا ملک میں فی کس آمدنی کا اندازہ مجموعی آمدنیوں کے مجموعہ کو آبادی کے مجموعہ پر تقسیم کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ ملکی سطح پر مجموعی طور پر فی کس آمدنی (Per capita Income) کی صورت حال حوصلہ افزا ہو مثلاً ۲۰ ہزار فی کس ہو جبکہ درحقیقت آبادی کا ایک بڑا حصہ خط غربت (Porerty Line) سے بھی نیچے کی زندگی گزار رہا ہو، جیسا کہ پاکستان میں ہے یا بعض بڑے بڑے کاروباری ساہو کار (Business Maganates) ہوں مگر ان کے پہلو میں کوئی مفلوک الحال تنگدست بھی ہوں غالباً اسی لیے پروفیسر ایکلے رقم طراز ہیں۔

درحقیقت کلی اور جزوی معاشیات میں خطِ امتیاز (Disceriminatory Line) کھینچنا مشکل ہے۔ معاشیات کا حقیقی عمومی نظریہ (Real General Theory of Economics) ان دونوں کو شامل ہے جزوی نظریہ انفرادی طرز عمل،

یہ ہیں علم المعیشت کے وہ نظریئے جو موجودہ دور میں اس تمدنی علم کے مایۂ ناز سمجھے جاتے اور اس کو ایک "علم وفن" (Science & Art) کی حیثیت بخشتے ہیں۔

اسلامی معاشی نظریہ اور جدید نظریے:

لیکن اسلامی "نظامِ معیشت" کی حدود ان نظریوں سے زیادہ وسیع اور اس کی پرواز فکر (Range of Thought) ان سے کہیں زیادہ بلند ہے، وہ جیسا کہ گذشتہ سطور

انفرادی پیداواروں، انفرادی آمدنیوں اور قیمتوں کی وضاحت کرے گا۔ اور ان انفرادی نتائج کے مجموعے (Aggregates) اور اوساط (اوسطیں۔ Averages) ایسے مجموعات (کل Aggregates) مہیا کریں گی جن سے معاشیات کل کا واسطہ ہے۔

اسلامی معاشیات اور جزوی وکلی معاشیات:

اسلام جس طرح خود ایک جامع نظامِ حیات ہے۔ اس کا مجوزہ اقتصادی نظام بھی ایک جامع نظام ہے۔ جس کی معاشی تعلیمات ہر دور، ہر خطہ اور ہر قسم کے حالات میں اور ہر انسان کے لیے وافر رہنمائی رکھتی ہیں۔ یہ صرف خوش عقیدگی کا خوش کن دعوی نہیں بلکہ اپنی ذات میں واضح دلیل بھی ہے۔ آپ مصنف رحمہ اللہ کی کتاب پڑھ جائیے یا اسلام کے معاشی نظام پر مرتب دیگر مسلم مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کر لیں آپ کو ہر معاشی پہلو پر رہنمائی کا سامان ملے گا۔

آپ جزوی اور کلی معاشیات کو لیں۔ یہاں انفرادی معاشیات (Individual Economics) فرد کے مصارف، ایک فرم کی کارکردگی، ذاتی وقف خیرات، انفرادی زمینداری، کاشتکاری، فرد کے مال پر جماعتی حقوق، وصیت ووراثت وغیرہ جزئی معاشیات (Micro Economics) کے موضوعات ہیں۔ جب کہ بیت المال یا سرکاری خزانہ، زرعی ترقیات کے مسائل، ٹیکسوں کا نظام، تنخواہوں کا نظام، سرکاری شعبہ، برآمدات درآمدات (Exports & Imports) وغیرہا کلی معاشیات (Macro- Economics) کے موضوعات ہیں اور ان دو قسموں یا اندازوں کا بیان حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" میں آپ کو ملے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ جزئی اور کلی معاشیات کے جدید معاشیات کی طرز کے عنوانات نہیں ہوں گے۔ البتہ موضوعات اور مواد (Materials) ہوں گے۔ جدید رواجی معاشیات (Traditional Economics) کی طرح یہاں اسلامی اقتصادیات میں بھی جزوی اور کلی کی تعلیمات آپس میں ملی جلی ہوتی ہیں۔ مثلاً جہاں اسلام معاشی استحصالی حربوں (Economics Exploitative Tools) جیسے سود، جوا، دھوکہ دہی، خیانت، چوری، اکتنازِ دولت وغیرہ کو حرام قرار دے رہا ہے تو یہ حرمت (Prohibition) فرد کے لیے بھی ہے اور اجتماع کے لیے بھی، جب وہ اسراف وتبذیر (Spend Thrift) کو ممنوع قرار دیتا ہے تو وہ جزوی معاشیات میں بھی ہے اور کلی میں بھی، الغرض، اسلامی معاشی تعلیمات، جزوی اور کلی معاشیات (Micro & Macro) دونوں کو شامل ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ جان لیں گے۔ (واللہ اعلم)

میں کہا جا چکا اور آئندہ تفصیلی طور پر آئے گا۔ اپنے معیاری نقطۂ نظر میں ان تمام افکار کا بھی حامل ہے جن کا ذکر ''مقالہ''[۱] میں موجود ہے اور ان سے وسیع تر افکار کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، اسی طرح وہ افہامی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ وقیع (High Toned) اور بہت زیادہ نافع (More Beneficial) نظامِ عمل کا بانی اور مؤسس (Founder) ہے۔

اسلامی معاشی نظریہ اور معیاری معاشیات کا نظریہ:

مثلاً جب کہ ''معیاری معاشیات'' کا اساسی تصور ''معیشتِ صالحہ'' (Righteous Economics) کا تصور ہے، تو گزشتہ سطور میں اسلامی نظامِ معاش میں ''معیشتِ صالحہ'' کی جو تشریح کی گئی ہے کیا اس سے بڑھ کر معیشت کے صالح ہونے کا تصور کسی بھی معاشی نظام میں موجود ہے اور کسی معاشی نظام کا نظریۂ فکر اس معراج اور رفعت (Height) پر پہنچا ہے کہ وہ ''معاشی نظام'' کی غرض و غایت صرف رفعِ حاجات و احتیاجات (Fulfillment of Needs & Necessities) کے وسائل کی درمیانی خلیج (Gap) کو پر کرنا ہی قرار نہ دیتا ہو بلکہ اس کو ذریعہ بناتا ہو اقوام کی باہمی اخوت و ہمدردی اور مساوات و مواسات کا، اور وسیلہ قرار دیتا ہو اخلاقی رفعت اور ابدی سعادت (Ever Blessing) کے حصول کا؟

اسلامی معاشی نظریہ اور افہامی معاشیات کا نظریہ:

اور جب کہ ''افہامی معاشیات'' کا نقطۂ نظر، نظر اور فکر کی جگہ موجودہ عملی معاشیات کا محور و مرکز ہے اور تمدن کے اس شعبہ کو جماعتی، تمدنی اور تجرباتی حیثیت سے بروئے کار لاتا ہے تو آئندہ صفحات اس امر کی شہادت دیں گے کہ تمدن کے اس ٹکڑے کو جس طرح اسلامی علم المعیشت نے سلجھایا اور اس کو طبقاتی جنگ اور سرمایہ داری کے غلبہ دونوں سے جدا رہ کر جس طرح عملی کسوٹی پر کسا اور تجرباتی خراد پر اتارا

---

(۱) معاشیات، مقصد، اور منہاج

اس سے بہتر اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر دوسرا کوئی نظامِ عمل نظر نہیں آتا۔

اسلامی معاشی نظریہ اور ترتیبی معاشیات کا نظریہ:

رہا ''ترتیبی معاشیات کا نظریہ'' تو وہ اپنی فلسفیانہ اور طبیعاتی نقطۂ نظر کے اعتبار سے اسلامی نظریۂ معاشیات سے بالکل جدا بلکہ متضاد ہے۔ البتہ اس کے باوجود بھی اس کے چند جزوی پہلو جو اس نظریہ کی پابندی سے الگ خود اپنی جگہ مستقل ہونے کی حیثیت سے اپنے اندر بعض خوبیاں رکھتے ہیں، سو اسلام کا نظامِ معاشی ان خوبیوں سے بھی خالی نہیں ہے مثلاً جبکہ معاشی نقطۂ نظر میں سب سے پہلا معاملہ ان اعمال سے وابستہ ہے جو رفع حاجات کے وسائل کی درمیانی خلیج کو پاٹتے ہیں تو خواہ کسی اسلوب سے بھی ہوں ان اعمال میں نقص و کمال اور تنزل و ترقی کا ہونا لازمی ہے اور یہی سبب بن جاتا ہے ایک ایسے فلسفہ کا جو ترتیبی درجات پر بحث کرتا اور ان کے نقص و کمال کو واضح کرتا ہے اور یہ اسلامی معاشیات میں اگرچہ کوئی خاص فن کی حیثیت نہیں رکھتا تاہم حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس کو ''ارتفاقات'' کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ اور اس کے مختلف درجات قائم کیے ہیں اور ان کو عملی معاشی نظام، تدبیر منزل، سیاست وغیرہ کے لیے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت دی ہے، پس موجودہ علم المعیشت کے یہ نظریئے ایک علم و فن کی حیثیت سے ''اسلامی معاشیات'' میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور وہ اس قسم کی فنی اور علمی کاوشوں کے مقابلے میں ایسے اصول اور ان اصول کے ماتحت ایسے عملی نظام کا داعی ہے جو انسانوں کی عام رفاہیت، خوشحالی اور ان کے امن و اطمینان کے لیے آلۂ کار بنیں اور معاشی راہ سے انسانوں کے درمیان غالب و مغلوب اور ظالم و مظلوم کی تقسیم کو مانع ہوں۔

جدید معاشیات کی ناکامی:

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ ''جدید علمی دور'' منجملہ دیگر علوم و فنون کے ''علم

المعیشت" کو بھی بڑی حد تک ایک علم و فن کی حیثیت حاصل ہے اور بڑے بڑے علماء یورپ و ایشیا نے اس پر ضخیم تصانیف (Voluminous Publications) پیش کی ہیں لیکن اس تمام این و آں اور چنیں و چناں کے باوجود "علم المعیشت" کا اصل مقصد یعنی عام رفاہیت و خوش حالی آج تک عنقا بنی ہوئی ہے اور دولت و ذرائع دولت سب سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں اس طرح آگئے ہیں کہ عام انسانی آبادی کے لیے زندگی "موت" سے زیادہ بھیانک بن گئی ہے، بخلاف اس دور (دورِ نبوت و خلافتِ راشدہ) کے وہاں معیشت کی یہ علمی اور فنی موشگافیاں اگرچہ عنقا تھیں مگر عام خوش حالی اور رفاہیت کا یہ عالم تھا کہ بلا لحاظ مسلم و کافر، مومن و مشرک مرد و عورت، صغیر و کبیر اور اجیر و مستاجر سب ہی امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور معیشت میں فارغ البال تھے اور تاریخ اس بات کا مواد فراہم کرتی ہے کہ اس دور میں ایک وقت مملکتِ اسلامیہ کے اندر ایسا آیا کہ لوگ صدقات کے مال کو لیے پھرتے تھے مگر اس کا قبول کرنے والا ہاتھ نہ آتا تھا۔ (۱)

---

(۱) ابن کثیر، عماد الدین، البدایة والنهایة، قاهرة: ٥/٦٤

یہاں مؤلف رحمہ اللہ اسلام کے زریں ادوار اور بالخصوص حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں موجود مسلمانوں اور عام رعایا کی معاشی خوشحالی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں جن ادوار میں اسلام کا صالح معاشی نظام کام کر رہا تھا جس کی بدولت ایک طرف اغنیاء کے اموال محفوظ تھے تو دوسری طرف محتاجوں کی معاشی حاجات پوری ہو رہی تھیں۔ جب ایسی حالت ہو کہ مال ان کے واقعی مستحقین (Beneficiaries) تک پہنچتا رہے تو زاویوں (Narrators) کا یہ بیان چنداں موجب حیرت نہیں کہ ان مبارک ادوار میں لوگوں کو فراخی نصیب ہو گئی تھی کہ مالدار زکاۃ کا مال لیے لیے پھرتے تھے اور کوئی محتاج لینے والا نہیں ملتا تھا۔ آئیے آپ شمالی افریقہ میں متعین حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے عامل زکاۃ (Zakat Collector) یحییٰ بن سعد رحمہ اللہ کا یہ بیان پڑھ لیں۔

مجھے امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے افریقہ میں صدقات کی وصولی کے لیے روانہ فرمایا۔ میں نے صدقات اکٹھا کیے اور ایسے محتاج لوگوں کو تلاش کیا جنہیں صدقات تقسیم کر سکوں، مگر ایسا شخص نہ ملا جو صدقہ قبول کرے۔ بالآخر اس صدقہ (کے مال) سے غلام خرید کر انہیں آزاد کر دیا۔ (ابن عبد الحکیم: سیرة عمر بن عبد العزیز رحمه الله، بیروت، ۱۳۸۷ء: ص ٦٩)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ مسلمہ کو ایسی خوشحالی کی خبر بھی دے دی تھی گو اس اطلاع میں اغنیاء

معاشی نظام کا منشاء:

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا میں کوئی کام بغیر کسی منشاء اور محرک (Motive) کے وجود پذیر نہیں ہوتا اور ہر عمل کی پشت پر ایک خاص ذہنیت کار فرما ہوتی ہے، پس کسی ''معاشی نظام'' کے صالح اور فاسد ہونے کا معیار بھی اس کے محرکات اور اس کے منشاء کے صالح اور فاسد ہونے پر موقوف ہے، سو اگر اس پشت پر فاسد ذہنیت (Corrupt / Deteriorative Intention) کام کر رہی ہے اور اس کے محرکات سر تا سر فاسد ہیں تو بلاشبہ وہ نظام ''فاسد نظام'' ہے اور اگر اس کی پشت پناہی ایک صالح ذہنیت (Righteous Intention) کر رہی ہے اور اس کے تمام تر محرکات صالح اور اس کا منشاء خیر ہی خیر ہے تو اس نظام کے صالح ہونے میں پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

—— صدقہ دینے والوں —— کو تنبیہ تھی مگر اس تنبیہ میں خوشخبری بھی پنہاں تھی، آئیے آپ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد پڑھاؤں۔

عن حارثة بن وهب رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: تصدقوا فأنه يأتی علیکم زمان یمشی الرجل بصدقته فلا یجد من یقبلها، یقول الرجل: لو جئت بها بالأمس لقبلتها، فإمّا الیوم فلا حاجة لی بها. (متفق علیه، بخاری کتاب الزکاة، باب الصدقة قبل الرد، مشکاة المصابیح، کتاب الزکاة باب الانفاق وکراهية الامساك، الفصل الاول)

ترجمہ: حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ دیا کرو، تم پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب ایک (مالدار) شخص اپنا صدقہ لے کر نکلے گا مگر اسے کوئی (صدقہ) قبول کرنے والا نہیں ملے گا وہ (جس) شخص (کے پاس صدقہ کا مال لے کر جائے گا) کہے گا: اگر تم کل (یا ماضی قریب میں لے کر آتے تو میں ضرور اسے قبول کر لیتا) مگر آج اس کی ضرورت نہیں رہی۔

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ الخزاعی ہیں۔ آپ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال فرمایا۔ (ابن حجر عسقلانی: الاصابة فی تمییز الصحابة رضی الله عنهم: ۱/۲۹۹ - ابن الاثیر: اسد الغابة: ۱/۳۵۹)

اس اصول کے پیشِ نظر جب ہم "معاشی نظام" پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور فکرِ عمیق سے کام لے کر جانچتے ہیں تو اس کے محرکات و منشاء یا اس سے متعلق ذہنیت کو صرف دو صورتوں میں محدود پاتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ ذاتی نفع کمانے کا محرک:

ایک یہ کہ "معاشی نظام" کو اس لیے قائم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے اور اس کو لین دین اور سودے کی اسپرٹ میں رکھا جائے تاکہ "ھل من مزید" (Is there any More to come?) کا نعرہ نفع بازی اور فائدہ طلبی کسی حد پر بھی جا کر ختم نہ ہو سکے، یہ نظریہ "سرمایہ دارانہ نظام" (Capitalism) کا بانی اور مؤسس ہے اور اسی کے زیر اثر یہ نظام پھلتا پھولتا ہے۔

"فورڈ کمپنی" کا مالک کروڑ پتی اور ارب پتی ہونے کے باوجود بھی مارکیٹ میں ترقی اور اضافہ ہی کا خواہش مند رہتا ہے کیونکہ وہ معاشی نظام کے جس ماحول میں جدوجہد کر رہا ہے اس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ نفع کمانے (Profit Maximization) اور سودے بازی (Bargaining) پر قائم ہے اور یہ صرف اربابِ دولت و ثروت ہی کو اور زیادہ بلند کرتا ہے اور باقی تمام انسانی آبادی کو افلاس و احتیاج (Porerty & Need) سے دوچار بناتا ہے۔

ضروریات زندگی اور رفع حاجات کا محرک:

یہاں رفع حاجات و تکمیل ضروریات (Fulfillment of Needs) کے وہ محرکات کام نہیں کرتے جو عام رفاہیت کا پیغام لائیں اور عام خوشحالی کو بحال کریں۔ دوسرے یہ کہ معاشی نظام کا محرک اور منشاء نفع بازی نہ ہو بلکہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور رفع حاجات ہو، اور اس کے منصۂ شہود پر لانے کے لیے صرف یہ ذہنیت کام کر رہی ہو کہ انفرادی و اجتماعی احتیاجات کو پورا کیا جائے نہ کہ زیادہ سے زیادہ نفع کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

اسلامی معاشی نظام کا محرک و منشاء:

معاشی نظام کے ان ہر دو محرکات (Motives) یا ہر دو ذہنیتوں (Intensions) میں سے اسلام ایک ایسے معاشی نظام کا بانی اور موسس ہے کہ جس کی بنیاد صرف کائنات انسانی کی رفع حاجات وضروریات اور انفرادی واجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے، وہ معاشیات کو دولت مندوں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان نہیں بنانا چاہتے بلکہ رفع حاجات و تکمیلِ ضروریات کے لیے ایک مفید اور نفع بخش ذریعہ بنا کر اس کی افادیت کو عام کرنا چاہتا ہے۔ (بقول مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ)[1]

(گویا اس نظام معیشت میں) بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے، کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہو گا اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت، بہ حیثیت جماعت کے خوشحال ہوتی جائے گی، قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے، لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائیں گے

---

(۱) مولانا آزاد، محی الدین احمد ابوالکلام آزاد، مولانا خطاب امام الہند بہت بڑے قادر الکلام صحافی، مقرر، شاعر، عالم، سیاستدان، معیشت دان، مؤرخ اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھے۔

ع گر ایک ادا ہو تو اپنی قضا کہوں

آپ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں مولانا خیرالدین رحمہ اللہ کے گھر پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں آپ کے والد آپ کو لے کر ہندوستان آگئے۔ آپ نے علوم دینی و شرقی کی تعلیم مولوی محمد یعقوب رحمہ اللہ اور مولوی عبدالحق خیر آبادی، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس دوم شمس العلماء مولانا سعادت حسین رحمہ اللہ سے حاصل کی۔ مگر آپ کی تربیت و تعلیم اور شخصیت کے نکھار میں بڑا کردار آپ کے والد محترم کا تھا، جو بہت بلند پایہ عالم فاضل تھے۔ آپ مسلمانان ہند کے سیاسی رہنما، آزادی ہند کے ہیرو، بدیشی حکمرانوں کے نہ مصالحت کرنے والے مخالف تھے۔ تحریر وخطابت کے بادشاہ تھے، بہت سی نہایت مقبول تصانیف چھوڑی ہیں جن میں تذکرہ، ترجمان القرآن جلد اول و دوم مع تفسیر سورۃ فاتحہ، قول فیصل، مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، جامع الشواہد، غبار خاطر، البلاغ اور الہلال کے شمارے قابلِ ذکر اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ آپ نے ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۱، ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی درمیانی شب دارالبقاء کی طرف رختِ سفر باندھ لیا۔ (ماخوذ از غبار خاطر، تذکرہ)

تمام افرادِ قوم کے لیے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیغام ہو جائے۔ جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔ [1]

مذکورہ مباحث کا خلاصہ:

اس تمام تر تفصیل کے بعد اب غور کیجئے کہ جس معاشی نظام کے کل پرزے اس طرح ڈھالے گئے ہوں، اس کا نشو ونما اور اس کی ترقی ایسے ترتیبی اجزاء پر قائم ہو جو صرف طبیعات ہی تک آکر نہ ٹھہر جائیں، اخلاقی اور مذہبی محاسن کو بھی اپنی آغوش میں لیں، بلکہ مذہب اور دستورِ الٰہی کے زیرِ فرمان عالم وجود میں آئیں اور اس کے محرک فلاح دارین اور سعادتِ کائنات کے وہ اصول ہوں جن میں معاشیات رفع حاجات اور تکمیل ضروریات کے لیے ہو نہ کہ زیادہ سے زیادہ سودابازی اور نفع طلبی کے لیے تو ایسے صالح اور صحیح نظام معاشی کا وجود بلاشبہ دنیا کے لیے پیامِ رحمت اور دعوتِ امن و سلامتی ہے۔

الحاصل ''اسلامی معاشی نظام'' ایسا بہتر نظام ہے جو اپنے اندر علم المعیشت کے قدیم و جدید نظامہائے مذہبی و عقلی کے تمام محاسن سموئے ہوئے ہے اور اس سے بھی زیادہ خوبیوں کا مالک ہے اور ان کے معائب و نقائص (Short Comings & Demerits) سے یکسر خالی بلکہ ان کے مسموم اثرات کا بے نظیر تریاق (Antidote) ہے اور ان تمام محاسن کے علاوہ اس کو یہ برتری حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے دماغ کی اختراع نہیں ہے کہ جس کی بنیاد انتقام (Retaliation) یا طبقاتی منافرت (Class Harted) جیسی خام کاریوں پر رکھی گئی ہو، بلکہ وہ نظامِ کائنات کے خالق کا بتایا ہوا نظام ہے۔

☆☆☆

(۱) ابوالکلام آزاد، مولانا: ترجمان القرآن، ج ۲، مقبول اکیڈمی، لاہور، سن طباعت درج نہیں: ص ۱۳۲

باب ــــــ ②

صالح معاشی نظام کے اصولِ معاشیات قرآن عزیز کی روشنی میں

(Principles of Ecnomics In The Light of The Holy Qur'ān)

یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن عزیز نے اپنی اساسی روش کے مطابق عبادات، معاشرتی معاملات، سیاسیات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح معاشیات میں بھی صرف اساسی اصول (Basic Principles) اور معجزانہ اختصار (Succinct) کے ساتھ اصول و کلیات (Principles & Theorems) کا ہی ذکر کیا ہے، اور ان کی تفصیلات و تشریحات کو ارشادات نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) (احادیث) اور ان سے مستنبط احکام (Inferred Rules) (فقہ) کے حوالہ کر دیا ہے معاشیات سے متعلق قرآن عزیز نے جن اساسی اصول کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

حق معیشت میں مساوات (Equality In Right To Livelihood):

رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذات الٰہی سے وابستہ ہے اور وہی ہر فرد کا کفیل ہے اور اگرچہ اس کی مصلحتِ عام (Welfare For All) اور حکمتِ تام (Perfect Wisdom) کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوتِ درجات (Gradations) پایا جائے، لیکن امارت و غربت کے فطری تنوع (Natural Variation) کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت (Destitute) نہ رہنے پائے کیونکہ اس نے حقِ معیشت کو سب کے لیے مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی

اس حقِ مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق عطا نہیں فرمایا۔

قرآنی تعلیمات:

اللہ تعالیٰ ہر فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر ایک جاندار کی معیشت اس کے ذمے ہے۔ اس کے لیے حسبِ ذیل (قرآنی) نصوص قابلِ مطالعہ ہیں۔

❶ ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي ٱلۡأَرۡضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزۡقُهَا﴾[1]

ترجمہ: اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ میں لے لی ہے۔[2]

---

(۱) القرآن الکریم: سورۃ ہود (۱۱): آیت ٦

(۲) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے اپنے دلائل کا آغاز کر کے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور حقیقت ہے رازق کریم کے رزاقی دسترخوان کی وسعت۔ ایک ایسا وسیع دسترخوان جس سے انسان و حیوان، پرند و چرند، ذی عقل و شعور اور کم فہم ولاشعور، آبی خاکی، فضائی و زمینی، پاؤں چلنے والے اور رینگنے والے، اپنے بھی اور پرائے بھی، احسان مند بھی اور احسان فراموش بھی، مومن بھی اور منکر بھی اپنا اپنا رزق پا رہے ہیں اور کھا رہے ہیں انسان ـــــ اس کی کچھ اور کتنی بھی حیثیت ہو امیر ہو، حاکم ہو محکوم ہو، آزاد ہو، مقید ہو ـــــ کو اس دستر خوان کا اس کی حیثیت، مرتبہ اور مقام کے مطابق نگران اور امین بنایا گیا ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنی حیثیت اور اپنے مقام کے مطابق اس دستر خوان کا انتظام سنبھالے اور اس دستر خوان سے اللہ کریم کی مخلوق کو مستفید ہونے دے اور کسی کو اس سے محروم نہ رکھے۔

دراصل اس رزاقی دستر خوان کو جاری و ساری رکھنے کے لیے آسمان رزق برسانے سے بخل نہیں کرتا نہ زمین اس کے رزق کو اُگانے میں کنجوسی سے کام لیتی ہے، نہ کارکنان قضاء و قدر اس دستر خوان کے رزق سے اللہ کریم کی مخلوق کو محروم کرنے میں کوئی زور زبردستی سے کام لیتے ہیں، یہ انسان ہی ہے جو دوسرے انسان اور دیگر مخلوقات کو اس رزق تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ لہٰذا مخلوقِ خدا کی اس محرومی کا ذمہ دار انسان ہی ٹھہرایا گیا ہے۔ انسان کو اس مجرمانہ حرکت سے باز رکھنے کے لیے ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے کام لیا گیا ہے اور اسے سخت سزا کا حقدار بتایا گیا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے اپنی اس تصنیف (Publication) میں انسانوں کی کفالت اور اس ضمن میں فرد، معاشرہ اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری پر نہایت عمدہ انداز میں روشنی ڈالی ہے البتہ انسان کے علاوہ اللہ کریم کی بہت ہی بڑی مخلوق ـــــ زمینی. فضائی، اور بحری کی کفالت کی ذمہ داری کا موضوع قدرے تشنہ رہ گیا ہے۔ یعنی اللہ کریم کے رزاقی دستر خوان سے اللہ کریم کی اس بڑی مخلوق ـــــ جو عاقل ہے نہ ذمہ دار اور نہ ہی جواب دہ

——کی کفالت کی اہمیت اور ذمہ داری کو ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے اجاگر کیا گیا ہے۔ آیئے چند نظائر ملاحظہ ہوں:

❶ ایک فاحشہ (Prostitute) عورت کو محض اس لیے جنت کا داخلہ دے دیا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا تھا۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: غفر لامراة موسة مرت بكلب على رأس ركى يلهث كاد يقتله العطش، فنزعت خفها فاوثقته بخمارها، فنزعت له من الماء، فغفرلها بذالك. قيل: ان لنا فى البهائم اجرا؟ قال: فى كل ذات كبد رطبة اجرٌ. (متفق عليه، مشكوة المصابيح، كتاب الزكاة، باب فضل الصدقة.)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک فاحشہ کو بخش دیا گیا۔ وہ ایک (پیاسے) کتے کے پاس سے گزری جو ایک کنواں کے پاس (شدت پیاس سے) ہانپ رہا تھا اور قریب تھا کہ پیاس (کی شدت) اس کی جان لے لے، اس (عورت) نے (اس پر رحم کھاتے ہوئے) اپنا جوتا اتارا اسے اپنی اوڑھنی سے باندھا، اس کتے کے لیے (کنواں سے) پانی کے لیے لٹکا دیا۔ (اللہ کریم نے اس فاحشہ کے اس عمل کی قدر دانی میں) اس کی بخشش فرمادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: کیا ہمارے لیے حیوانات (کی کفالت) میں بھی اجر و ثواب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: ہر تر و تازہ (یعنی زندہ) دل رکھنے والے (کی روح کی کفالت) میں ثواب ہے۔

❷ ایک عورت کو اس لیے جہنم کا سزاوار بنا دیا گیا کہ اس نے بلی کو بھوکوں مار دیا۔

عن عبدالله بن عمر رضى الله عنهما وابى هريرة رضى الله عنه قالا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عذبت امرأة فى هرة، أمسكتها حتى ماتت من الجوع فلم تطعمها ولا ترسلها فتأكل من خشاش الأرض. (متفق عليه، مشكوة المصابيح، كتاب الزكاة، باب فضل الصدقة.)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک عورت کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اُس نے بلی کو باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ بھوک سے مر گئی۔ اُس نے نہ خود اسے کھلایا پلایا نہ کھلا چھوڑا کہ وہ زمین کے جانور کھا کر اپنی بھوک مٹا لیتی۔

❸ ہر ذی روح کی کفالت کرنا بہترین صدقہ ہے۔

عن انس رضى الله عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفضل الصدقة إن تشبع كبدا جائعا. (امام بيهقى فى شعب الايمان، مشكوة المصابيح، باب افضل الصدقة)

=

❷ ﴿وَفِي ٱلسَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور تمہارا رزق اور جس شے کا تم وعدہ دیئے گئے ہو آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں) ہے۔

❸ ﴿وَلَا تَقۡتُلُوٓاْ أَوۡلَٰدَكُم مِّنۡ إِمۡلَٰقٖ نَّحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَإِيَّاهُمۡ﴾ (۲)

ترجمہ: اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالا کرو ہم ہی تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

❹ ﴿وَمَن يَرۡزُقُكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلۡأَرۡضِۗ أَءِلَٰهٞ مَّعَ ٱللَّهِۚ﴾ (۳)

ترجمہ: اور آسمان اور زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟

❺ ﴿إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلرَّزَّاقُ ذُو ٱلۡقُوَّةِ ٱلۡمَتِينُ ﴿٥٨﴾﴾ (۴)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہترین صدقہ یہ (بھی) ہے کہ کسی بھوکے ذی روح کو (کھانا) کھلایا جائے۔

❹ جس ذی روح ـــــ انسان ہو یا حیوان یا پرند ـــــ کی روزی کسی کے ذمہ ہو وہ اسے بھوکوں مرنے سے بچائے۔

عن عبداللّٰه بن عمرو بن العاص رضى اللّٰه عنهما قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: كفى بالمرء إثما ان يضيّع من يقوت. (صحيح مسلم، وابوداود، رياض الصالحين، باب النفقة على العيال)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص کے گنہگار ہونے کے لیے اتنا ہی کیا کم ہے کہ وہ اس جی (روح) کو (بھوکا رکھ کر) ضائع کردے جس کی روزی اس کے ذمہ ہو۔

(۱)سورۃ الذاریات: (۵۱): آیت ۲۲

(۲)سورۃ الانعام (٦): آیت ۱۵۱

(۳)سورہ النمل (۲۷): آیت ٦٤

(۴)سورۃ الذاریات (۵۱): آیت ۵۸

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے بڑی مضبوط طاقت والا ہے۔

❻ ﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾﴾ [۱]

ترجمہ: اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں معیشت کے سامان بنا دیئے اور ان کے لیے جن کو تم روزی نہیں دیتے۔

❼ ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ [۲]

ترجمہ: وہ (خدا) وہ ذاتِ پاک ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص (Specification) کے ہر فرد و بشر کو خطاب ہے اور ان کی روح یہ ہے کہ معیشت و اسباب معیشت خدائے تعالیٰ کے خزانۂ عامرہ (Ever Abundant Treasury) کی ایسی عطا و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جاندار کو برابر کا حق ہے۔

حق معیشت میں برابری

اور ان آیات کی اس روح کی زیادہ وضاحت و صراحت حسبِ ذیل آیات کرتی ہیں:

❽ ﴿وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ﴿١٠﴾﴾ [۳]

ترجمہ: اور رکھے اس زمین میں بوجھل پہاڑ (اس کی پیٹھ پر) اور برکت رکھی اس کے اندر اور چار دن میں اندازہ سے رکھیں اس میں ان کی خوراکیں جو

---

(۱) سورۃ الحجر (۱۵): ۲۰

(۲) سورۃ البقرہ (۲): ۲۹

(۳) سورۃ فصلت (۴۱): ۱۰

برابر ہیں حاجت مندوں کے لیے۔

❾ ﴿ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٧١﴾ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی کو اپنے زیر دستوں پر لوٹا دیں حالانکہ اس روزی میں وہ سب کے سب برابر کے حقدار ہیں، پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں؟

ان آیات میں حق معیشت کی مساوات کا جس قدر صاف اور صریح اعلان ہے وہ آپ اپنی مثال ہے اور اس کا انکار بداہت وصراحت کا انکار ہے ۔

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب
گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ بادشمناں نظر داری

مساواتِ حقِ معیشت پر نامور مفسرین کی آراء:

حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے ”حق معیشت میں مساوات“ کی بحث کے حاشیہ میں چند مقتدر (Authoritative) مفسرین کی مساوات رزق کی آیۃ (سورۃ النحل: (۱۶): (۷۱)) کی تفسیر آراء کو اکھٹا بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

روح المعانی جلد ۱۴، البحر المحیط جزو ۵ سورۃ النحل وتفسیر فتح القدیر جلد ۳، اس آیت کے ایک معنی یہ بھی کیے جاتے ہیں:

---

(۱) سورۃ النحل (١٦): آیت ۷۱

وجوز ان یکون معنی الایة: ان اللّٰہ تعالٰی فضل بعض علی بعض فی الرزق وان المفضلین لا یردون من رزقھم علی من دونھم شیئا، وانما أنا رازقھم، فالمالك والمملوك فی اصل الرزق سواء. وان تفاوتا کما وکیفا، واختار فی الکشاف أن المعنی أنه سبحانه جعلکم متفقاوتین، أفبنعمة اللّٰہ یجحدون. ویکون المعنی علی قراة الخطاب ان المالکین لیسوا برآدّی رزقھم علی مما لیکھم، بل أنا الذی أرزقھم فی الرزق فرزقکم أفضل رزق مما بدلکم وھم بشر مثلکم واخوانکم. وکان ینبغی أن تردو الفضل ما رزقتموہ علیھم حتی تساووا فی الملبس والمطعم کما یحکی عن ابی ذر رضی اللّٰہ عنه الخ"[۱] وایّا ھم فلا یظنوا أنھم یعطونھم شیئاو أنما ھو رزقی أجریه علی أیدیھم وھم جمیعا فی ذلك سواء لا مزیة لھم علی ممالیکھم فیکون المعطوف علیه المقدر یناسب ھذا المعنی یقال لا یفھمون ذالك فیجحدون نعمة اللّٰہ.[۲]

ترجمہ: علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ [۳] نے اپنی تفسیر روح المعانی جلد

---

(۱) روح المعانی: جلد ١٤

(۲) فتح القدیر للشوکانی: ۱۷۱/۳ وکذا فی البحر المحیط: ج ٥. (سید محمود آلوسی رحمہ اللہ کی روح المعانی وامام الشوکانی رحمہ اللہ کی فتح القدیر، امام زمخشری رحمہ اللہ کی کشاف اور ابو حیان رحمہ اللہ کی البحر المحیط میں سورۃ النحل کی آیت نمبر ۷۱ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔)

(۳) آلوسی، سید محمود آفندی ابوالثناء شہاب الدین آلوسی بغدادی رحمہ اللہ شام اور بغداد کے درمیان واقع گاؤں آلوس آپ کے آباو اجداد کا مسکن تھا۔ اسی نسبت سے آپ آلوسی کہلائے۔ آپ نے ۱۳۱۷ھ کو بغداد کے محلہ کرخ میں ولادت پائی۔ آپ نے اپنے والد محترم شیخ خالد نقشبندی رحمہ اللہ اور شیخ علی سویدی رحمہ اللہ سے کسب فیض کیا۔ آپ مدرسہ مرجانیہ کے مہتمم اعلیٰ (پرنسپل) اور مفتی احناف رہے۔ ۱۲۶۷ھ سے ۱۲۶۹ھ تک اپنی تفسیر "روح المعانی" پر کام کیا اور اسے مکمل کر کے دولت عثمانیہ کے سلطان عبدالمجید خان رحمہ اللہ کو پیش کیا۔ آپ کی دیگر مشہور تالیفات میں حاشیہ الفطر، الفوائد السنیہ فی اداب البحث، الاجوبۃ العراقیۃ، درۃ =

۱۴۔ ابو حیان [1] محمد بن یوسف بن علی بن یوسف اندلسی غرناطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر البحر المحیط (جزء سورۃ النحل (آیۃ ۷۱) اور امام الشوکانی [2] محمد بن علی بن محمد رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر فتح القدیر جلد ۳ (سورۃ النحل: آیت ۷۱ کی تفسیر) میں (تحریر کیا) ہے: اس آیت کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں: اور جائز ہو گا اگر آیتِ مذکورہ کے معنی یہ کیے جائیں کہ اللہ کریم نے ہم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے، جنہیں اس برتری سے نوازا گیا ہے وہ اپنے (عنایت کیے گئے) رزق میں سے کچھ حصہ اپنے سے رزق میں کمتر افراد پر (کیوں) نہیں لوٹا دیتے (تاکہ وہ حق رزق میں ان کے برابر ہو جائیں)۔ (اللہ کریم فرماتا ہے) حالانکہ ان (تمام) کا رازق تو میں ہی ہوں۔ لہذا (دنیوی) آقا اور ماتحت اصل (حق) رزق میں برابر ہیں۔ اگرچہ ہم (یعنی دنیوی نظم معیشت چلانے

الغواص فی اوہام الخواص، النفحات القدسیہ فی المباحث الامامیۃ مشہور ہیں۔ آپ نے جمعۃ المبارک کے دن ۲۵/ ذیقعدۃ ۱۲۰۷ھ کو وفات پائی اور بغداد کے محلہ کرخ میں حضرت شیخ معروف کرخی رحمہ اللہ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ رحمہ اللہ

(۱) ابو حیان ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن علی بن یوسف اثیرالدین غرناطی اندلسی مشہور بہ ابو حیان رحمہ اللہ ۶۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے اندلس و افریقہ کے دیار و امصار کا سفر کیا۔ آپ کے اساتذہ کرام میں ابوطاہر اسماعیل بن عبداللہ، شیخ بہاؤالدین بن نحاس، عبدالنصیر بن علی مریوطی رحمہم اللہ تعالیٰ قابل ذکر ہیں۔ آپ بیک وقت مفسر، محدث، نحوی، شاعر اور تراجم رجال اور طبقات کے ماہر تھے۔ آپ نے گرانقدر تالیفات چھوڑی ہیں جن میں تفسیر البحر المحیط، غریب القران، نہایت الاعراب، خلاصۃ البیان اور شرح التسہیل قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ۷۴۵ھ میں مصر میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ

(۲) الشوکانی، محمد بن علی بن محمد الشوکانی رحمہ اللہ ۲۲/ ذی القعدہ ۱۱۷۲ھ کو (یمن یا بحرین کے قصبہ) شوکان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دینی و مروجہ علوم میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ کرام میں عبدالرحمٰن بن قاسم المدائنی، علامہ احمد بن عامر الحدائی، احمد بن محمد الحرازی، امام قاسم بن محمد، عبداللہ بن اسماعیل رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے یکتائے روزگار شامل ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر "فتح القدیر" کے علاوہ فقہ میں آپ کی مقبول کتاب "نیل الاوطار" ہے جسے سعودی عرب کے ادارۃ البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد نے شائع کر کے عام کیا ہے۔ آپ نے جمادی الآخر ۱۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

میں) وزن (Quantity) اور کیفیت (Quality) رزق میں اس برابری کو قائم نہ بھی رکھا ہو۔

(امام زمخشری رحمہ اللہ [۱] نے اپنی تفسیر) کشاف میں یہ معنی (بیان فرمائے) ہیں: اس ذات کریم نے تمہیں (رزق میں) درجہ بدرجہ بنایا ہے۔ پھر (یہ برتری والے کمزوروں پر اپنے رزق کا کچھ حصہ نہ لوٹا کر) کیا اللہ کریم کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے؟ خطاب کی قرأت کے مطابق یہ معنی بھی ہیں کہ (دنیوی) آقا (طاقتور) اپنے (فاضل) رزق کا کچھ حصہ اپنے ماتحتوں پر لوٹا رہے ہیں کہ ان پر احسان رکھیں (کہ انہیں اپنا رزق دے رہے ہیں) بلکہ یہ تو میں (اللہ رزاق کریم) ہوں جو انہیں (فقراء کو ــــ ان دنیوی فاضل رزق والوں کے رزق کا کچھ حصہ ان سے واپس دلوا کر ــــ رزق بہم پہنچا رہا ہوں (ان فاضل رزق والوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ) تم سے جو حصہ (فاضل رزق کا) لیا گیا ہے۔ اس سے بہتر رزق تمہیں دیا گیا (حالانکہ تمہارا تمہارے فاضل اموال سے ان کمزوروں کو کچھ حصہ دینا تمہارا ان فقراء پر کوئی احسان نہیں، نہ یہ کچھ لوٹانا تمہارے لیے وجہ افتخار ہے بلکہ) وہ (کمزور) بھی تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں بلکہ تمہارے بھائی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جو تمہیں رزق دیا گیا ہے اس کا فاضل (زائد) حصہ ان ضرورت مندوں کو لوٹا دیتے (اور تم یہ عمل متواتر کرتے رہتے) یہاں تک کہ تم سارے لباس، خوراک (اور

---

(۱) امام زمخشری، قاسم بن محمود بن عمر خوارزمی، زمخشری رحمہ اللہ ماہ رجب ۴۶۷ھ کو زمخشر (خوارزم کا علاقہ) میں پیدا ہوئے، مشہور مفسر، محدث فقیہ اور متکلم تھے۔ مکہ مکرمہ میں عرصہ دراز تک رہائش اور بیت اللہ شریف کی بکثرت حاضری کی بنا پر "جار اللہ" (اللہ کریم کے پڑوسی) کہلائے۔ تحصیل علم کے لیے بغداد، خراسان، مکہ مکرمہ وغیرہا کا سفر اختیار کیا۔ اپنے علمی کمال اور فن میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کی مشہور تصانیف میں تفسیر کشاف، رؤس المسائل فی الفقہ، المفصل فی النحو، الفائق فی تفسیر الحدیث، اساس البلاغۃ فی النحو وغیرہا ہیں۔ تحریک اعتزال کے روحِ رواں تھے، لہٰذا ان کی تفسیر میں جا بجا یہی رنگ غالب ہے۔ ۵۳۸ھ میں مکہ مکرمہ سے واپس جرجانیہ (خوارزم) میں شب عرفہ میں وفات پائی (تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن خلکان، وفیات الاعیان: ۵۰۹/۲ ــ علامہ جلال الدین سیوطی: طبقات المفسرین، ص ۱۴۱۔

دیگر بنیادی ضروریات زندگی) میں برابر ہو جاتے۔ جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] کے عمل کے بارے میں آیا ہے۔

---

(۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر بلکہ محبوب صحابی ہیں وہ تاریخ اسلامی معاشیات میں رہتی دنیا تک حق معیشت میں مساوات کے سچے داعی اور سچے حامی کے طور پر جانے جائیں گے۔ آیئے میرے اس دعوی کی دلیل کے لیے عتبہ بن مسعود رحمہ اللہ کا یہ بیان پڑھ لیجئے۔

"كسى أبوذر رضي الله عنه بردين فأتزر باحدهما وارتدى بشملته وكسا أحدهما غلامه ثم خرج على قوم فقالوا له: لو كنت لبستهما جميعا كان أجمل قال: أجل ولكني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إطعموهم مما تاكلون و إلبسهم مما تلبسون" (ابن سعد: الطبقات الكبرى، ج ٤ بيروت، ١٣٧٧ھ، ١٩٥٧ء، ص ٢٣٧)

ترجمہ: ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (ایک دن) دو چادریں اوڑھنا تھیں۔ مگر انہوں نے ایک ہی کو اپنا تہہ بند بنا لیا، (اس طریقہ سے کہ) اس کا ایک حصہ لمبا چھوڑ کر اسے (بدن ڈھانپنے کی) چادر بنا لیا۔ اور ایک (دوسری) اپنے خادم (ماتحت) کو دے دی۔ پھر جب وہ باہر لوگوں میں تشریف لائے تو انہوں نے ان سے عرض کیا: اگر آپ ہی وہ دونوں چادریں اوڑھتے تو زیادہ اچھے اور خوبصورت لگتے۔ فرمانے لگے: بات تو تمہاری بھی درست ہوگی، مگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سن لیا تھا: انہیں (اپنے ماتحتوں کمزوروں کو) وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔

حضرت معرور رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں ایک دن ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کا ماتحت ایک ہی قسم کے کپڑے کے حلے (Gowns) زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں تعجب سے دریافت کر بیٹھا ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا بات ہے آپ اور آپ کا خادم ایک ہی کپڑے کے حلے پہنے ہوئے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: مجھے میرے حبیب () کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا۔

ان إخوانكم خولكم جعلهم والله تحت أيديكم فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل وليلبسه مما يلبس (صحيح امام بخاری: ج ٢ كتاب العتق)

ترجمہ: یقیناً تمہارے ماتحت تمہارے بھائی ہی تو ہیں، جنہیں اللہ کریم نے تمہارے ماتحت بنایا ہے لہٰذا جس کسی کا کوئی بھائی اس کے ماتحت ہو اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے۔

اس فرمان کو نقل کر کے ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں تو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجا لا رہا ہوں (ان مباحث کے لیے میری کتاب "حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کمزوروں اور غریبوں کے وکیل" کا مطالعہ انشاء اللہ مفید ہو گا)

(حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم کے محب صحابی تھے انہیں جب کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث روایت کرنا ہوتی تو فرط محبت میں "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" کی بجائے

(اللہ کریم فرماتے ہیں) یہ امیر خبردار رہیں اور کہیں یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ وہ ان فقراء کو کچھ دے (کر ان پر احسان کر) رہے ہیں بلکہ وہ میرا رزق ہے جو ان امیروں کے ہاتھوں سے ان فقیروں میں جاری رکھتا ہوں۔ حالانکہ وہ (امیر اور غریب) اس حقِ رزق میں برابر ہیں۔ ان دنیوی وڈیروں کو اپنے کمزوروں پر کوئی فضیلت نہیں بلکہ جو اُن کمزوروں کو یہ امیر کچھ عنایت کر کے ان پر اپنا احسان سمجھ رہے ہوں یہ ایسا نہیں بلکہ اُن کمزوروں کا مقدر کیا ہوا حصہ ہے جو انہیں اس طرح مل رہا ہے چونکہ یہ وڈیرے صحیح بات نہیں سمجھ پائے (اور نتیجۃً ان معاشی دکھوں کے ماروں کو اپنے فاضل اموال سے واپس نہیں لوٹاتے) اس لیے وہ اللہ کریم کی نعمتوں کے صریح منکر ہو رہے ہیں۔)

لیکن اب سوال یہ ہے کہ منشاءِ الٰہی کے اس مقصدِ عظیم کو پورا کون کرے اور اس عالمِ اسباب میں اس کی تکمیل کس کے ذمہ واجب ہے؟ تو اسلام کے نظام کا مکمل نقشہ جن نگاہوں کے سامنے ہے وہ بآسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس "عالم تشریع" (World or Being of Legislation) میں یہ فریضہ نائبِ الٰہی (Vicegerent of Allah) "خلیفہ" پر عائد ہوتا ہے کہ قلمرو اسلامی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حقِ معیشت سے محروم ہو اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ حقِ معیشت میں در انداز بن سکے اور جو حکومت اس منشاءِ الٰہی کو پورا نہ کرتی ہو وہ فاسد نظام کی حامل اور نظامِ عدل سے منحرف ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کی رائے:

(چنانچہ) سورہ بقرہ کی اس آیت "هو الذی خلق لكم ما فی الارض جمیعا"، کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمد الحسن [1] صاحب رحمہ اللہ ارشاد

"قال حبی صلی الله علیه وسلم، اوصانی حبیبی" (مجھے میرے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی، اور "أَوْصَانی خلیلی" (مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی) کہا کرتے تھے، جن اہل علم کی ان سے مروی احادیث پر نگاہ ہے وہ یہ حقیقت جانتے ہیں۔

(۱) شیخ الہند محمود الحسن ایک متبحر عالم دین، فقیہ، محدث اور سیاست دان تھے۔ آپ ۱۲۶۸ھ (بمطابق ۱۸۵۱ء) =

فرماتے ہیں:

جملہ اشیائے عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان ''خلق لکم ما فی الارض جمیعا'' تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرضِ خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے دفع حوائج جملۂ ناس (انسان) ہے اور کوئی شے فی حدِ ذاتہ کسی کی مملوکِ خاص نہیں بلکہ ہر شے سے اصل خلقت میں جملہ ناس (Mankind) میں مشترک (Common) ہے اور ''من وجہ'' سب کی مملوک (Possession) ہے، ہاں بوجہ رفع نزاع (Settelment of Dispute) و حصولِ انتفاع (Acquistition of Benefit) قبضہ کو علّت ملک (Reason for Ownerrhip) مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ (Absolute permanent Possession) باقی رہے اس وقت تلک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا، ہاں خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مالِ کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا گو زکوٰۃ بھی ادا

بریلی (ہند) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اساتذہ کرام میں میانجی مولانا عبد اللطیف رحمہ اللہ، مولانا ملا محمود رحمہ اللہ (جو دیوبند کے پہلے مدرس تھے، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے ارشاد پر ۱۰۰ (سو) روپے کی ملازمت چھوڑ کر ۲۰ (بیس) روپے لینے دیوبند آ گئے) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ (بانی دارالعلوم دیوبند) ہیں، پھر ۱۲۸۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں ہی آپ مدرس بن گئے۔ ۴۰ سال تک یعنی آخر عمر تک رہے۔ آپ آزادی کے لیے مسلمانوں کی ''تحریک ریشمی رومال'' کے روح رواں تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا، جہاں گورنر غالب پاشا، انور پاشا، کمال پاشا اور دیگر زعماء اور علماء کرام حرمین شریفین سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنا ہم خیال بنانے کے لیے کوششیں کیں۔ دورانِ قیام مکہ مکرمہ آپ کو انگریز حکومت کے اشارہ پر گرفتار کر کے براستہ قاہرہ (مصر) جزائر مالٹا (کالا پانی) بھجوا دیا گیا۔ یہ ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کا دن تھا، وہاں تین سال سات ماہ قید رکھ کر ۲۰/ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸/ جون ۱۹۲۰ء آپ کو رہائی اور سفر کے بعد بمبئی پہنچا کر آزاد کیا گیا۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کے دن اللہ کریم کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی تصانیف میں ترجمہ قرآن، حجۃ الاسلام (سوانح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ) بخاری شریف کے ابواب و تراجم پر ایک جامع رسالہ اور ایضاح الادلۃ مشہور ہیں۔

کر دی جائے، اور انبیاء و صلحاء اس سے بغایت مجتنب (Abstainers) رہے، چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے، بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمادیا۔ بہر کیف غیر مناسب و خلاف اولیٰ (Against the Better) ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجت (More than the Need) سے تو اس کی کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک "من وجہ" اس میں موجود، تو گویا شخص مذکور "من وجہ" مال غیر پر قابض و متصرف (Occupier & User) ہے اور اس کا حال بعینہ مالِ غنیمت کا تصور کرنا چاہیے وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ کل مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت و حصولِ انتفاع (Utilization) بقدر حاجت (According to Need) ہر کوئی مال مذکور سے منتفع ہو سکتا ہے وہاں حاجت سے زائد جو رکھنا ہے اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے، (یعنی خائن (Treacherous) شمار ہوگا)۔ [1]

علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ کی روایات:

اور مشہور محدث ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ [2] نے اس سلسلے میں محلّی میں جو

(۱) مولانا محمود الحسن، شیخ الہند: ایضاح الادلۃ، قدیمی کتب خانہ (بالمقابل آرام باغ)، کراچی، ۱۴۱۳ھ، ص ۴۴۱، ۴۴۲

(۲) ابن حزم ظاہری، علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب بن سفیان بن یزید کنیت ابو محمد اور شہرت ابن حزم رحمہ اللہ کے نام سے پائی۔ آپ اندلس کے نامور عالم دین، محدث اور فقیہہ تھے۔ آخری دن رمضان المبارک ۳۸۴ھ مشرقی قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد احمد بن سعید رحمہ اللہ اموی حکمران مظفر بن منصور کے وزیر تھے، آپ نے ناز و نعمت کے باوجود تحصیل علم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔
آپ قوی استدلال رکھنے والے فقیہہ اور محدث تھے۔ یہی استدلالی قوت ان کے افکار سے جھلکتی ہے۔ جو رائے یا نظریہ رکھتے اس کے لیے دلائل اور حوالہ جات کے انبار لگا دیتے۔ اپنے مخالفین کے لیے بہت سخت زبان استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز بات ہے کہ ناز و نعمت سے پلے، وزیر ابن وزیر، اس دور میں کروڑوں کی جائیداد اور اندلس کے مختلف شہروں میں کوٹھیوں کے مالک ابن حزم رحمہ اللہ کو امیروں کے اموالِ فاضلہ میں فقراء اور معاشی دکھوں کے ماروں کے حقوق اور ان کی معاشی کفالت =

روایات نقل کی ہیں وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہیں:

❶ عن ابي سعيد ن الخدري رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان له فضل من زاد فليعد به على من لا زاد له. قال فذكر من أصناف المال ما ذكر حتى رأينا أنه لا حق لاحد منا في فضل.[1]

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)[2] سے روایت ہے

کا مقدمہ اس شدت سے کیوں لڑنا پڑا؟ میرے ناقص علم میں کمزوروں اور بے نواؤں کے وکیل سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد فقراء کے حقوق کے لیے ایسی شد و مد اور براہین و دلائل کے ساتھ قلمی جہاد کسی نے نہیں کیا۔ یہ ان کی فقراء کے اغنیاء کے فاضل اموال میں واقعی حقوق (Acknowleged Rights) کے لیے اخلاص کے ساتھ جدوجہد تھی جس کی صدائے بازگشت رہتی دنیا تک قافلہ صدق و وفا کے لوگ، غریبوں کے حامی و خیر خواہ، محتاجوں کے حقوق کی خاطر لڑنے والے سنتے اور سناتے رہیں گے۔

معاشی دکھوں کے ماروں کی ہمدردی اور ان کے حقوق کے لیے لڑنے کا یہ محیر العقل انداز کی کچھ سیاسی، معاشی اور نفسیاتی وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ کے والد اندلس کے اموی حکمرانوں کے وزیر تھے، ان کے بعد ابن حزم رحمہ اللہ بھی اموی وزیر رہے، مگر جب حمودی غالب آئے تو ابن حزم رحمہ اللہ کو اپنا نعمت کدہ چھوڑ کر جائے پناہ کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ ان کا مال و جائیداد لوٹ لیا گیا۔ اگرچہ ان کے والد محترم نے ان کی خاطر اندلس کے ہر بڑے شہر میں مکان چھوڑا، مگر وہ ایک گم نام دیہات میں رہ کر اپنا قلمی جہاد کرتے رہے، دکھ سہہ کر جیتے رہے اور یہیں رختِ سفر باندھ کر اللہ کریم کو پیارے ہوئے۔ زمانہ کی اس گردش نے بھی ان کے سیال قلم کو صیقل کر دیا اور انہوں نے معاشی طور پر پریشان حالوں کے دکھ بانٹنے اور ان کا صحیح حل تلاش کرنے کے لیے خوب خوب لکھا۔

آپ کی بہت سی تالیفات ہیں، زیادہ مشہور المحلی فی فروع الفقہ گیارہ جلدوں میں "کتاب الاحکام لاصول الاحکام" آٹھ جلدوں میں اور کتاب الفصل فی العلل والاہواء والنحل ہیں۔

آپ نے ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ میں وفات پائی (تفصیل کے لیے دیکھیں یاقوت حموی رحمہ اللہ، معجم الادباء، ج ۱۲ مطبع الرافع، قاہرۃ ص ۲۳۷- شیخ ابو زہرہ رحمہ اللہ: حیات ابن حزم، ص ۲۷، ۳۷۔ ابن حزم: طوق الحمامہ، مطبوعہ قاہرۃ، ص ۱۵۴

(۱) امام مسلم: الصحيح: ج ۲ كتاب اللقطة. ابن حزم: المحلى، ۱۵۷/۶، ۱۵۸. النووي، امام ابو بكر يحيى بن شرف: رياض الصالحين باب الايثار والمواساة.

(۲) ابو سعید الخدری: سعد بن مالک ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کبار صحابہ کرام =

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس قوت وطاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہو اس کو چاہیے کہ اس فاضل سامان کو کمزور کو دے دے اور جس شخص کے پاس سامانِ خورد نوش حاجت سے زائد ہو اس کو چاہیے کہ فاضل سامان نادار اور حاجت مند کو دے دے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مختلف انواع مال کا ذکر فرماتے رہے حتی کہ ہم نے یہ گمان کر لیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔

❷ قال عمر بن الخطاب رضي الله عنه لو استقبلت من امري ما استدبرت لاخذت فضول الاغنياء فقسمتها على فقراء المهاجرين۔[1]

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا ہے اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو میں اس میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلاشبہ اربابِ ثروت کی فاضل دولت لے کر فقراء اور

رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ فقیہ، محدث اور معاشی لین دین کے مسائل کے ماہر تھے، سود اور تبادلہ (Exchange) کے مسائل پر آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ حضرت ابو نضرۃ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے صرف (Barter۔ یعنی اشیاء کا آپس میں تبادلہ جب کہ وہ ہم جنس ہوں) کے بارے میں دریافت کیا۔ تو انہوں نے فرمایا: کیا دست بدست یعنی حاضر سودا ہو گا؟ ابو نضرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: ہاں تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ پھر میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور آپ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا جواب سنایا تو آپ نے فرمایا: میں عنقریب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو لکھوں گا پھر وہ اس طرح صرف (تبادلہ) کے جواز کا فتویٰ ہرگز نہیں دیں گے۔ (برائے تفصیل دیکھیں: ابن سعد: طبقات، ۱۲/۲۔ ابن منذر: التر تیب الاداریۃ، ۲۴۷/۲۔ محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، تذکرہ ابو سعید الخذری رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۱) ابن حزم: حوالہ مذکورہ: ص ۱۵۸ ابن حزم اس روایت کی سند پر حکم لگاتے ہوئے فرماتے ہیں: ”وھذا اسناد فی غایۃ الصحۃ والجلالۃ“ اور یہ سند نہایت صحیح اور پر از جلالت ہے۔ محلی ابن حزم: ج ٦

مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بانٹ دیتا۔

❸ وصحح عن أبوعبيده بن الجراح وثلث مائة من الصحابة رضی اللّٰه عنهم أن زادهم فنيٰ فأمرهم ابوعبيدة فجمعوا أزواد هم فی مزودين وجعل يقوتهم اياها علی سواء.[1]

ترجمہ: حضرت ابوعبیدہ[2] اور تین سو صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے

---

(۱) حواله بالا: ١٥٨/٦ متفق عليه بحواله رياض الصالحين، باب الايثار والمواساة۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں مساوات کے داعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خوش کن صورت حال سے کس قدر خوشی ہوئی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت میں یہ طریقہ معاش کس قدر عزیز تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ ان لوگوں کو اپنا قبیلہ، اپنی جماعت اور اپنا خاندان تصور فرماتے تھے۔ آئیے مدینہ منورہ کے اس سعادت مند قبیلہ "الاشعری" کا "مساویانہ معاشی رویہ" اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے پسندیدگی کا حال پڑھ لیں۔

إن الأشعريين إذا أرملوا فی الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم فی ثوب واحد، ثم اقتسموا بينهم فی اناء واحد بالسوية فهم منی وانا منهم. (صحیح بخاری: ج ۱ كتاب الشركة) ترجمہ: اشعریین (ایسے ایثار پسند اور بامروت لوگ ہیں کہ) جب کبھی وہ سفر جہاد میں ہوں اور زادِراہ کی کمی محسوس کریں یا مدینہ منورہ میں (مقیم) ہوں اور اُن کے اہل وعیال کا سامان خوراک کم پڑ جائے تو ان کے پاس (فرداً فرداً) جو کچھ ہوتا ہے اسے ایک کپڑا میں اکٹھا کر لیتے ہیں پھر ایک پیمانہ کے ذریعہ اسے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ (ایثار شعار لوگ) مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

(۲) حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے بہادر، جری، صائب الرائے، معاملہ فہم، مدبر اور عالم صحابی تھے۔ مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے بدری تھے۔ آپ کا شمار عشرہ مبشرہ ــــ یعنی وہ سعادت مند اور منتخب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنہیں اللہ کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعہ دنیا میں جنت کی بشارت دی تھی ــــ میں شمار ہوتا ہے۔ آپ امانت اور دیانت داری کے اس مقام پر تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو امین الامت کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ آپ قائد لشکر اسلام تھے۔ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں شام کے محاذ پر اسلام کے سپہ سالار تھے اور شام اور دیگر محاذوں پر فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کمیٹی کے ممتاز رکن ــــ بلکہ بعد میں سربراہ بن گئے ــــ تھے جس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد امیرالمومنین کا انتخاب کرنا تھا۔ آپ کو خلافت کی پیش کش ہوئی مگر آپ نے فیصلہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے کے بعد حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں دیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ

متعلق یہ روایت صحت کو پہنچ چکی ہے کہ (ایک موقعہ پر) ان کا سامان خورد ونوش ختم کے قریب آ گیا پس حضرت ابو عبیدہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے حکم دیا کہ جس جس کے پاس جس قدر موجود ہے وہ حاضر کرے اور پھر سب کو یکجا کر کے ان سب میں برابر تقسیم کر کے سب کی قوت لایموت کا سامان کر دیا۔

❹ عن محمد بن علی أنه سمع علی بن أبي طالب يقول: أن الله تعالى فرض على الاغنياء في أقواتهم بقدر ما يكفي فقراءهم فإن جاعوا أو عروا وجهدوا فبمنع الأغنيآء وان على الله تعالى أن يحاسبهم يوم القيامة و يعذبهم عليه.[1]

ترجمہ: محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجۂ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے، پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے وہ محض اس لیے کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے اور اس لیے اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔

اور اسی قسم کی دوسری احادیث اور آیاتِ قرآنی کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے مشہور محدث ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ یہ مسئلہ تحریر فرماتے ہیں:

❺ وفرض على الأغنياء من أهل كل بلد أن يقوموا بفقرائهم، يجبرهم السلطان على ذلك، إن لم تقم الزكاة بهم ولا فی سائر اموال المسلمين بهم. فيقام لهم بما يأكلون من القوت الذی لا

تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیت المال سے وظائف کا تقرر آپ کی رائے سے ہوا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۱۸ھ مطابق ۶۳۹ء عمواس کی وبا سے جابیہ ملک شام میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۱) حوالہ بالا: ۱۵۸/۶

بد منه، ومن اللباس للشتاء والصيف بمثل ذلك، وبمسكن يكنّهم من المطر والصيف والشمس وعيون المارة.[1]

ترجمہ: اور ہر ایک بستی کے اربابِ دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر زکوٰۃ اور مسلمانوں کے دیگر اموال فیٔ (بیت المال کی آمدنی) ان غرباء کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان اربابِ دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے (یعنی ان کے فاضل مال سے بجبر (Forcibly) لے کر فقراء کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے) اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔

❻ اور حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی روایت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس بات پر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا ننگا یا ضروریاتِ رہائش سے محروم ہے تو مالدار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔[2]

• اب ان تمام نصوصِ قرآنی اور ان کی مؤید (Supporting) احادیث و فقہی روایات کو سامنے رکھ کر بہ نظر انصاف غور فرمائیے کہ ''اسلام کا معاشی نظام'' حق

(۱) حوالہ بالا: ۶/۱۵۶، مسئلہ رقم: ۲۵، مصنف رحمہ اللہ نے ''عیون المارۃ'' کا ترجمہ سیلاب کیا ہے جب کہ اس کا ایک ترجمہ ''گزرنے والوں کی نگاہیں'' بھی کیا گیا ہے لہٰذا اس ترجمہ کی رو سے عبارت کے آخری حصہ کا مطلب ہو گا۔ ایسا مکان جو...... گزرنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھے یعنی اس کی پردہ داری اور خلوت (Privacy) میں دخل اندازی نہ ہونے دے۔

(۲) محلی: ۶/۱۵۸، تمام ائمہ مجتہدین کا بھی یہی مسلک ہے۔

معیشت کی مساوات کا کس طرح صاف اور واضح اعلان کرتا ہے اور امیر اسلام کے اختیارات میں وسعت دے کر اس کی حفاظت کے لیے کس قدر عادلانہ دستور قائم کرتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب:

جو دماغ اسلامی نظام کے حقائق سے ناآشنا اور موجودہ فاسد نظام ہی کو کہ جس میں امارت و غربت کا قابلِ نفرت حد تک تفاوت (Difference) نظر آتا ہے، اسلامی نظام سمجھتے ہیں، ان کے لیے یہ باتیں بلاشبہ حیرت زدہ (Wonderful) ہیں اور ان میں سے بعض تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے منشاء الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے جب خود ہی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو محروم المعیشت پیدا کیا ہے اور غربت و امارت کا یہ فرق بھی کہ ایک کروڑ پتی ہے اور دوسرا نانِ جویں (Bare Bread) سے بھی محروم۔ اُسی کا بنایا ہوا ہے تو پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ حقِ معیشت میں تمام افرادِ انسانی مساوی ہیں اور یہ کہ کوئی فرد اس کائنات میں محروم المعیشت نہ رہے؟

اور بعض اس گمراہی میں ہیں کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اسلامی نظام کو ہمہ گیر ثابت کرنے کے لیے ایک جدید کوشش ہے جو دنیا کے رجحانات اور وقت کے تقاضوں کے سامنے سُپر ڈالتے ہوئے (ہار تسلیم کرتے ہوئے) احکام الٰہی کی ترمیم و تبدیل کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے یا اشتراکیت (Socialism) و اشتمالیت (Communism) سے مرعوب ہو کر قبائے مارکسزم (Marxism) کو اسلام کے جسم پر موزوں کیا جا رہا ہے، لیکن افسوس اور صد ہزار افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں خیالات، وساوس اور اوہامِ فاسدہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور درحقیقت یہ نتیجہ ہے اس عام بے خبری کا جو اسلامی تعلیم کے متعلق مسلم فضا میں ابرِ محیط کی طرح چھائی ہوئی ہے اور یہ ثمرہ ہے اپنے حقائق سے یکسر ناآشنا رہتے ہوئے اس مرعوبیت کا، جو مغربی تعلیم کی بدولت ہم پر طاری و ساری ہے۔

عالم تکوین اور عالم تشریع (۱):

یہ دونوں خیالات، وسوسہ سفطہ (Illusion) کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ہم اس قسم کے مسائل پر بحث کرتے وقت اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ عالمِ تکوین اور عالمِ تشریع میں کیا فرق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس قانونِ الٰہی کو کائنات کی کامرانی (Success) کا واحد حل تجویز فرمایا ہے، ذی عقل کائناتِ عالم (Wise Creation of the Globe i.e. the Man) کو جس کے امتثال کی تکلیف دی ہے اور جس کی تعمیل کے لیے مکلف بنایا ہے اس کا تعلق تکوینیات سے ہے یا تشریعیات سے سو اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتے تو بلاشبہ اس قسم کے وساوس اور اوہام کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔

انسان عالم تشریع کا پابند (۲):

یہ ایک حقیقت ہے کہ خالقِ کائنات نے کائنات کے آغاز و انجام کا جو تکوینی

(۱) عالم تکوین: (World of Being – Ruled by the Will of Allah- Alone) عالم تکوین اس عالم (دنیا) کا نام ہے، جہاں اللہ کریم کا ارادہ، حکم اور قضاء و قدر کا راج ہے یہاں جو اللہ کریم چاہیں وہ ہو گا، جو نہ چاہیں نہیں ہو گا۔ اس عالم میں کسی اور فرشتہ، انسان و جن کے ارادہ یا عمل کو دخل ہے نہ ان میں سے کوئی اس عالم میں کیوں؟ کیا؟ کیسے؟ اور کیونکر؟ کا ذمہ دار یا جوابدہ ہے۔ اس عالم پر مطلق حکم (Absolute Order) اللہ کریم ہی کا چلتا ہے۔

(۲) عالم تشریع: (World ruled by Legislation) اللہ کریم قادر مطلق (Absolute) ہوتے ہوئے اس عالم کا بھی حاکم اور مالک ہے اور یہ عالم بھی اسی کریم و قادر کے حکم سے چل رہا ہے۔ مگر اس نے یہاں انسان کو اپنا نائب (Vicegerent) بنایا ہے جس کا اشارہ قرآن کریم میں کیا ہے اس کو ارادہ اور عمل کی قوت سے نوازا ہے، اسے اس عالم کو چلانے کے لیے کچھ اختیارات عنایت کیے ہیں اس سلسلہ میں اس کی رہنمائی کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام ـــــ جن کے آخری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ـــــ مبعوث فرمائے جن میں سے بعض پر کتب اور صحائف ـــــ جن کی تکمیل قرآن کریم پر ہوئی ـــــ نازل فرمائے یہاں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس عالم کو اللہ کریم کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں تشریع (Legislation) کر کے چلائے، اپنی فلاح و بہبود کے لیے قوانین اور ضوابط (Rules & Regulations) وضع کرے، جن کی وہ خود بھی پابندی کرے اور دیگر انسانوں سے ـــــ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ـــــ پابندی کا مطالبہ کرے۔ انسان اس عالم تشریع میں اللہ ـــــ قادر مطلق ـــــ اور وقت کے نبی علیہ السلام کی رہنمائی میں اپنے وضع کردہ قوانین کا پابند ہو گا۔ انہی قوانین میں وہ معاشی قوانین بھی ہوں گے جن کا انسان پابند اور جواب دہ ہے۔

نظام بنایا ہے اس کا تمام تر تعلق صرف اپنی ذات احدیت (Oneness) ہی کے ساتھ رکھا ہے اور اس میں کسی دوسرے کے دخل کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ نظامِ تکوینی میں کسی شے کے لیے کیا ہے اور کیا نہیں اور نہ اس علم کا ہم کو مکلف بنایا گیا ہے اور اس کا تعلق سر تا سر "عالم تکوین" سے متعلق ہے، البتہ اس نے حضرت انسان (ثقلین) کو جبکہ عقل و شعور اور ادراک و تمیز عطا فرمائے ہیں تو اس عطا و بخشش کے بعد اس کو یونہی بیکار اور معطل نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اشیاء کے حسن و قبح اور اپنی مرضیات و نامرضیات کی معرفت اور ہدایت و گمراہی اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے نیز افراد کو اجتماعی سلک میں منسلک کرنے کے لیے ایک بہترین "نظام عطا فرمایا اور اس میں اچھی اور بری دونوں راہوں کو واضح کر دیا ﴿وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ ۝١٠﴾[1] اس نظام کا نام "نظامِ تشریعی" (Legislative System) ہے اور کائنات میں "پہلے انسان" کے ساتھ ساتھ یہ "نظام" عالم تشریع پر حاوی ہے اور انبیاء و رسل کے ذریعہ برابر دنیائے انسانی پر کار فرما رہا ہے اور اس کی فلاح و بہود کا ضامن و کفیل ہے، پس یہی وہ نظام ہے کہ جب حد کمال کو پہنچا، تو "قرآن عزیز" کی شکل میں جلوہ افروز ہوا۔

پس اگر یہ بنیادی حقیقت ہمارے پیشِ نظر رہے تو ہم بآسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے دائرہ سے یہ باہر ہے کہ ہم "نظامِ تکوینی" سے بحث کریں بلکہ ہم صرف "نظام تشریعی" (قانون تشریع) ہی کے دائرہ میں محدود رہ کر بحث کر سکتے ہیں، تو اب قرآنِ عزیز سے نقل شدہ نصوص کو ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجئے کہ کیا ان نصوص کی مراد یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحتِ عامہ اور حکمتِ بالغہ کی بنا پر کائناتِ انسانی میں امارت و غربت کے تفاوتِ درجات کو خلق کیا ہے اس لیے کہ مرد مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس تفاوتِ درجات کو ترقی دینے کے لیے ایسا نظام قائم

(۱) ﴿وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ ۝١٠﴾ (سورۃ البلد: (۹۰): ۱۰) اور ہم نے اُسے دونوں راہوں (بھلائی اور برائی) کی رہنمائی کر دی۔

کرے کہ تمام ثروت و دولت امیروں کے ہاتھ میں آجائے اور کروڑوں انسان فقیر اور محتاج بن کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جانِ آفرین کو جان سپرد کر دیں اور اس طرح "العیاذ باللہ" منشاء الٰہی کو پورا کریں۔

اور اگر ان آیاتِ قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے تو پھر اس کے سوائے دوسرے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ درجاتِ معیشت میں فطری حد تک تفاوت کے باوجود حق معیشت میں تمام کائناتِ انسانی مساوی اور برابر کی شریک ہے اور کسی صاحبِ ثروت کی دولت و ثروت غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی وہ امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیر فرمان غرباء و مساکین کی غربت و مسکنت (Poverty & Misery) کو فنا کرنے کے لیے استعمال ہونی چاہیے، گویا صاحبِ ثروت کی ثروت، غرباء کی غربت کے لیے رحمت ثابت ہو، نہ کہ زحمت۔ (۱)

(۱) اسلام کے عادلانہ معاشی نظام نے ایک کریمانہ قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ وہ مالداروں کو اللہ کریم کے وکیل اور فقراء کو اللہ کریم کا خاندان بتاتا ہے۔ وہ مالداروں کو حکم کرتا ہے کہ وہ اللہ کریم کے قبیلہ یعنی فقراء کی ضروریات کی تکمیل پر خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لیں، ورنہ انہیں اللہ کریم کا عذاب آن لے گا۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک حدیث قدسی سن لیں اور حقِ معیشت میں محتاج کے حق کی اہمیت کا اندازہ کر لیں۔

الاغنیاء وکلائی، والفقراء عیالی، فاذا بخل وکلائی علی عیالی أذقتھم وبالی ولا أُبالی.

ترجمہ: مالدار (تقسیم مال اور خرچ مال میں) میرے وکیل ہیں جبکہ فقراء (محتاج لوگ) میرا خاندان ہیں، پھر اگر یہ میرے وکلاء میرے خاندان پر خرچ کرنے میں بخل (کنجوسی) سے کام لیں گے، تو میرا وبال (عذاب) انہیں آن لے گا پھر میں بھی ان (مالداروں کے دکھوں) کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا۔

مصر کے مشہور شاعر ــــ بلکہ جنہیں اشعر الشعراء یعنی تمام شاعروں کا بڑا شاعر کہا گیا ہے ــــ احمد شوقی رحمہ اللہ (۱۸۶۸ء-۱۹۳۲ء) کی قبر پر اللہ کریم کی رحمتیں نازل ہوں انہوں نے کس عمدہ پیرایہ میں اسلام کے اقتصادی نظام کے بانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ حسنہ کا بیان کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداروں سے محتاجوں کا حق لے کر دینے سے متعلق ہے۔ لیجئے آپ بھی اس عظیم شاعر کا انداز ملاحظہ کریں۔

انصفت اھل الفقر من اھل الغنی

فکل فی حق الحیاۃ سواء

=

مساواتِ حقِ معیشت میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری:

اور اگر اربابِ ثروت ایسے عادل سسٹم کو منظور نہ کریں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو پھر خدا کے نائب (خلیفہ) کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے "اجتماعی معاشی نظام" کے مطابق اربابِ ثروت کو قانوناً اس پر مجبور کرے اور اگر بیت المال کا مالیہ کافی نہ ہو اور اس سے بھی قلمرو خلافت (Purview of Khilfah) میں محروم المعیشت انسان موجود رہ جائیں تو اہلِ دولت کے سرمایہ سے بہ جبر حاصل کر کے "حقِ معیشت کی مساوات" کو بروئے کار لائے خواہ وہ اہلِ دولت اپنے مال میں سے تمام عائد شدہ مالی فرائض و حقوق ادا کر چکے ہوں۔

مباحث کا خلاصہ:

الحاصل قرآنی نصوص اور ان کی موید احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے مستنبط فقہی احکام یہ واضح کرتے ہیں کہ "حقِ معیشت کی مساوات" کا یہ نظریہ منشاءِ الٰہی کے خلاف نہیں بلکہ عین منشاءِ الٰہی کے مطابق ہے اور یہ جدید نظریہ نہیں ہے کہ مارکسزم (Marxism) کی حمایت یا اس سے مرعوبیت کی بنا پر احکامِ اسلامی کی انوکھی تعبیر کے ذریعہ وجود میں آیا ہو بلکہ اسلام کا وہ بنیادی اور اساسی حکم ہے جو اپنے وجود سے آج تک غیر متبدل و غیر متزلزل (Unchanged & Firm) رہا ہے اور اگر ہم نے اس کو سمجھنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی یا دوسرے انسانوں کے اختراعی معاشی نظاموں (Human Modeled Economic Systems) سے مرعوب ہو کر ہم نے

لــــــــو ان انســــــــانا تخـــــــير ملـــــــة

مــــــا اختــــــار إلا دينـــــك الفقـــــراء

ترجمہ: (اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ نے دولت و ثروت والوں سے انصاف کے ساتھ حاجت والوں (فقراء و مساکین) کو (اُن کا) حق دلوایا۔ اس طرح تمام انسان زندگی کے حق (معیشت) میں برابر ہو گئے۔
(اے غریبوں کے ملجاء و ماوی نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) اگر انسان کو اپنی مرضی سے کسی (مذہب) و ملت کا اختیار کرنا ہوتا تو محتاج لوگ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طریقہ (معیشت) پسند کرتے۔

"اسلامی معاشی نظام" کو یکسر بھلا دیا تو اس میں اپنا قصور ہے نہ کہ اسلامی نظام کے بیان کرنے والے اور اس کی اصل حقیقت سے روشناس کرانے والے کا۔ اور یہ بھی سخت گمراہی ہے کہ ہم یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ غربت و امارت کا یہ غیر فطری تفاوت اور ظالمانہ امتیاز جو آج ہم کو کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے خدا کا بنایا ہوا ہے، بلکہ یہ "فاسد نظامہائے معاشی" کے ثمرات و نتائج ہیں اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نظامہائے فاسد کو یک قلم سوخت ہو جانا چاہیے۔

درجات معیشت (EconomicGradation)

اگرچہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں ہیں، اور معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک فطری (Natural) ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لیے سامانِ معیشت ایک ہی طرح کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لیے۔

مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہِ ظلم نہ بن سکے، یعنی تفاوتِ درجات تو ہو لیکن نہ ایسا کہ "معیشت" انسانوں کو دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسروں کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلۂ کار بن کر رہ جائے۔ قرآن عزیز نے اس تفاوتِ درجات کو اس طرح بیان کیا ہے:

❶ ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ﴾[1]

ترجمہ: دنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو دوسرے بعض پر درجۂ معیشت میں بلندی حاصل ہے۔

---

(۱) سورۃ الزخرف (۴۳): ۳۲

❷ ﴿ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ﴾ (۱)

ترجمہ: اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی ڈالتا ہے۔

❸ ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ﴾ (۲)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں تمھیں آزمائے۔

❹ ﴿ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۷۱) ﴾ (۳)

ترجمہ: خدا تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی ہے وہ اپنی روزی سے اپنے زیر دستوں کو لوٹا دے۔ حالانکہ اس روزی میں سب برابر کے حق دار ہیں پھر کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں؟

گویا رزق میں تفاوتِ درجات کی مصلحت ایک خاص قسم کی آزمائش پر مبنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ایک جانب غنی کو صاحبِ ثروت بنا کر اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ثروت کو تنہا اپنی ملکیت نہ سمجھے بلکہ "انفرادی ملکیت (Individual Ownership) کے باوجود" یہ یقین رکھے کہ وہ جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اس کی دولت پر

(۱) سورۃ الرعد (۱۳): ۲۶

(۲) سورۃ الانعام (۶): ۱۶۵

(۳) سورۃ النحل (۱۶): ۷۱

اجتماعی حقوق (Social Obligations) زیادہ عائد ہوں گے، پس وہ صرف اپنے لیے نہیں کماتا بلکہ جماعت کے دوسرے افراد کے لیے بھی کماتا ہے۔

نیز یہ ذہن نشین رہے کہ درجات کا یہ تفاوت جماعت کے دوسرے افراد کو محروم المعیشت بنانے اور ذاتی اغراض کی خاطر معاشی دستبرد (Economic Exploitation) کرنے کے لیے نہیں ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ خدا کی نعمت (عطاء ثروت) کا جاحد (منکر) ہے۔

کیونکہ یہاں دولت و سرمایہ کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع بازی نہیں ہے بلکہ انفرادی حاجات و ضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حاجات و ضروریات کی تکمیل ہے، دوسری جانب غیر متمول (The Poor) سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متمول (The Rich) افراد ملت کے تمول (Opulence) کو دیکھ کر خدا کے ساتھ کفران اور ناشکر گزاری نہ اختیار کرے اور نہ حسد و بغض کو دل میں جگہ دے بلکہ طمانیتِ قلب (Peace of Mind) کے ساتھ اپنی مختصر فارغ البالی اور خوشحالی (Short Well- Being & Presperity) پر شاکر رہے [1] اور یا پھر عملی جدوجہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوقِ معیشت سے متمتع (Utilizer) ہو اور غنا و دولت

---

(۱) لفظ فارغ البالی اس لیے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں کسی فرد کا محروم المعیشت رہنا ناجائز ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام نے اغنیاء کو یہ احساس بھی دلا دیا ہے کہ اپنے معاشی طور پر کمزور اور محتاج بھائیوں کی مدد کر کے یا انہیں بنیادی ضروریاتِ زندگی میں اپنے برابر کر کے وہ ان بے نواؤں پر کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ ان (طاقتور اغنیاء) کو تو روزی اور مدد ان کے کمزور اور فقیروں کے سبب اللہ کریم کی طرف سے مل رہی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے جذبات ابھارنے والے انداز میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔:

عن ابی الدرداء عویمر رضی اللہ عنه قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول: ابغونی الضعفاء، فانما تنصرون، وترزقون بضعفائکم. (ابوداؤد، ریاض الصالحین، باب ملاطفة الیتیم ...... والضعفاء والمساکین الخ)

ترجمہ: حضرت ابو درداء عویمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: کمزوروں کے بارے میں مجھے خوش رکھا کرو (اور اس میں تمہارا بھی سراسر فائدہ ہے) کیونکہ تمہیں مدد اور رزق تمہارے کمزوروں کے سبب ہی ملتا ہے۔

(Richness & Riches) حاصل کرے جن کو تمام مخلوقِ خدا کے لیے عام اور مساوی کر دیا ہے اور دوسرے افرادِ ملت کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو اپنے حاصل کردہ مال پر اسی طرح عائد کرے جس طرح قانونِ اسلامی نے دوسرے اربابِ دولت پر عائد کیے ہیں۔

احتکار واکتناز کی حرمت

(Prohibition of Hoarding & Concentration)

دولت اور سرمایہ داری کے وہ اصول قطعاً ناقابلِ تسلیم ہیں جن میں احتکار واکتناز کی کوئی صورت بھی بن سکے اور ان سے دولت و کنز (Wealth & Treasure) پھیلنے اور تقسیم ہونے کی بجائے سمٹ کر خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو جائے۔ اور اس طرح عام انسانی زندگی کو مفلوک الحال (Poverty Stricken) بنادے، اکتناز واحتکار کی حرمت اور انفاق کے وجوب کے لیے ذیل کی آیات قابلِ توجہ ہیں:

(۱) ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾﴾[1]

ترجمہ: اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں، پہلو اور ان کی پیٹھ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا تھا اور چکھو مزہ

(۱) سورۃ التوبۃ (۹): ۳٤، ۳٥

لیے چراہ گاہ کی حد بندی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ کسی کے لیے روا نہیں ہے۔

یعنی یہ حق صرف خلافت "حکومت" کا ہے کہ جہاد اور صدقات کے مویشیوں کے لیے چراگاہ محدود کر دے اس کے علاوہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ [1] فرماتے ہیں:

أقول لما كان الحمى تضييقا على الناس وظلما عليهم و إضرارا فهى عنه. [2]

ترجمہ: میں کہتا ہوں جب کہ حمی کا دستور لوگوں کی ضروریات میں دشواری کا باعث اور ان کے مفاد عامہ پر ظلم تھا اور باعث نقصان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناجائز فرمادیا۔

اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر بارش کی کمی یا کسی اور وجہ سے خودرو گھاس کی کمی ہو اور افراد ملک کے مویشی چارہ سے محروم ہو جائیں تب "سرکاری" "حمی" بھی پبلک مفاد کے لیے عام کر دیا جائے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

عن زيد بن اسلم عن أبيه قال: رايت عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه أستعمل مولى له على الحمى. فقال له: ويحك يا هُنَيُّ! اضمم جناحك عن الناس، واتق دعوة المظلوم فان دعوته مجابة. أدخل لى رب الصريمة ورب الغنيمة. ودعنى من نعم عثمان بن عفان رضى الله عنه وابن عوف رضى الله عنه إن هلكت ما شيتهما رجعا إلى المدينة إلى نخل وزرع و إن

---

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ۱ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ: حجة الله البالغة، ۱۰٤/۲

هذا المسكين، إن هلكت ما شيته جاءني يصيح يا أمير المؤمنين! يا أمير المؤمنين! والماء والكلاء أهون على من إن أغرم له.[1]

ترجمہ: زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے: میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اس وقت موجود تھا جب انہوں نے اپنے آزاد شدہ غلام "ہنی" کو "سرکاری چراگاہ"[3] پر نگران بنایا تو فرمانے لگے: اے ہنی! خبردار اپنے بازوؤں کو

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الکلا والمروج، ص ۲۲۲، ۲۲۳

(۲) زید بن اسلم، ابو معشر زید بن اسلم بن ثعلبہ بن عدی بن الجد بن العجلان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدری صحابی ہیں، غزوہ احد میں بھی شریک ہوئے۔ ابن سعد: طبقات، ج ۳، تذکرہ زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۳) سرکاری حمی، سرکاری چراگاہ: جس چراگاہ کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ مدینہ منورہ سے چار منزل ربذہ کے مقام پر تھی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آزاد کردہ غلام ہنی (Hunney) کو اس کا نگران مقرر کیا، یہاں جہاد کے لیے اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور اونٹ پائے جاتے تھے اور بوقت ضرورت عام مسلمانوں کے مواشی بھی یہاں چر لیا کرتے تھے۔ یہ چراگاہ دس (۱۰) میل لمبی اور دس (۱۰) میل چوڑی تھی۔

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم ــــ بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ ــــ کے عہد میں ایسی سرکاری چراگاہیں اسلامی ریاست کے متعدد مقامات پر بنائی گئیں، جن میں جہادی گھوڑے اور اونٹ پرورش پاتے تھے۔ مدینہ منورہ کے قریب ربذہ کی چراگاہ کے علاوہ ایک چراگاہ مکہ مکرمہ سے سات (۷) منزل کے فاصلہ پر ضریہ کے مقام پر تھی یہ چراگاہ چھ میل لمبی اور چھ میل چوڑی تھی اس میں تقریباً ۴۰ چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) جہادی اونٹ پرورش پاتے تھے۔

ایک تیسری چراگاہ بصرہ میں تھی، جس کا انتظام اہواز کے گورنر حضرت جزو بن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا۔

ایک چوتھی چراگاہ کوفہ میں تھی، جس کا انتظام حضرت سلمان بن ربیعہ الباہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سنبھالتے تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کریم نے گھوڑوں کی شناخت اور پرداخت کا خاص ملکہ ودیعت فرمایا تھا گویا وہ پیدا ہی جہادی گھوڑوں کی تربیت کے لیے ہوئے تھے، اسی شناختی اور پرداختی کمال کی وجہ سے ان کا نام ہی سلمان الخیل ــــ سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑوں والے ــــ پڑ گیا۔

اس طرح ایک چراگاہ عاقول کے قریب دریائے فرات کے کنارہ پر تھی جہاں حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہار کے موسم میں کوفہ کی چراگاہ کے گھوڑے لاتے تھے۔ (ان تمام چراگاہوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ طبری: ص ۲۵۰۴۔ خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)، مطبوعہ قاہرۃ، ص ۲۵۵،
=

لوگوں سے سمیٹے رکھ اور مظلوم کی بد دعا سے پرہیز کر اس لیے کہ وہ خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے۔ تو میری اس قائم کردہ چراگاہ میں بکریوں اور دیگر چوپاؤں کے ریوڑ والوں کو اجازت دے کہ وہ چراگاہ میں چرا سکیں اور عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱) کے

۲۵۶ــــــ شبلی نعمانی: الفاروق، حصہ دوم، عنوان: صیغہ فوج، تذکرہ: گھوڑوں کی پرداخت)
دراصل ایسی چراگاہوں کا آغاز بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقیع کو حمی (چراگاہ) مقرر فرمایا، یہاں مجاہدین اسلام کے جہادی گھوڑے، اونٹ چرا کرتے تھے اور عام غریب مسلمانوں کے مواشی بھی۔ بخاری کے الفاظ ہیں:

وقال صعب بن جثامه ليثى رضى الله عنه بلغنا أن النبى صلى الله عليه وسلم حمى النقيح، وأن عمر (رضى الله تعالىٰ عنه) حمى السرف والربذه. (صحيح بخارى، كتاب المساقات، باب لا حمى الا لله ورسوله صلى الله عليه وسلم)

ترجمہ: اور حضرت صعب بن جثامہ لیثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "نقیح" اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "سرف" اور "ربذہ" کو چراگاہیں بنایا۔

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ابو محمد زہری قرشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام الفیل سے دس سال قبل پیدا ہوئے، نہایت جلیل القدر صحابی تھے، عشرہ مبشرہ (دس سعادت مند ترین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنہیں جنت کی دنیا میں اللہ کریم نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی خوشخبری دی) میں شامل تھے اور اس سات رکنی مجلس کے رکن اعظم تھے، جس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے بعد خلیفہ منتخب کرنا تھا۔ ابتداء اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت پر مشرف باسلام ہوئے۔ دوبارہ ہجرت حبشہ کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی، غزوہ احد میں ثابت قدمی پر بہت زخم کھائے حتی کہ عمر بھر لنگ کا شکار رہے۔ غزوہ موتہ (دومۃ الجندل) میں امیر لشکر اسلامی بنا کر بھیجا گیا واپسی پر آپ کے اقتداء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز بھی ادا کی۔ امامت کا یہ شرف صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا۔

ہجرت مدینہ منورہ سے قبل غریب تھے، ہجرت کر کے کاروبار کیا، امیر ترین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ان کا شمار ہوا۔ جہاد اور امت کی خوشحالی کے کاموں پر بہت خرچ کرتے تھے۔ امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا بہت خیال کیا کرتے تھے۔ وفات کے وقت وصیت کر گئے کہ ان کے مال سے اصحاب بدر رضوان اللہ علیہم اجمعین (جو زندہ ہوں) کو چار چار سو دینار فی کس دیئے جائیں۔ چنانچہ تقریباً سو بدریین ــــــ ان کی قبروں پر اللہ کریم کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں ــــــ کو چار چار سو دینار پیش کیے گئے۔ ۳۲ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع کے خوش نصیبوں میں صور پھونکے جانے کے دن تک زمین اوڑھ کر سو گئے۔ (دیکھئے: اسد الغابہ، استیعاب، اصابہ وغیرھا میں ترجمہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی

چوپایوں کی پرواہ نہ کر اس لیے کہ اگر ان کے چوپائے ہلاک بھی ہو جائیں تو وہ مدینہ میں اپنے کھجوروں کے باغ اور زمین کی کاشت سے فائدہ اٹھا سکیں گے، اور اگر ان چرواہوں کے چوپائے مر گئے تو یہ مسکین چیختے پکارتے آئیں گے اور امیرالمؤمنین! امیر المؤمنین کہہ کہہ کر امداد طلب کریں گے اس لیے بیت المال کے روپیہ پیسہ سے ان کی امداد کرنے سے میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ ان کو چراگاہ کے گھاس پانی سے فائدہ اٹھانے کی اجازت رہے۔

مفاد عامہ کی قدرتی اشیاء پر طاقت وروں کا قبضہ ختم:

ایک یہ بھی دستور تھا کہ زمیندار خودرو گھاس، تالاب اور کھیتوں کا پانی، خودرو درختوں کی خشک لکڑی پر بھی بلاشرکتِ غیر قابض رہتے تھے اور اپنی زمین کی ملکیت کے دعوے سے دوسروں کو اس سے نفع نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ یہ بھی عوام اور غرباء کے ایسے مفاد میں ظالمانہ دستبرد تھی جس کو خدائے تعالیٰ کی سخاءِ عام (General Generosity) نے بغیر محنت ان کو بخشا تھا۔

اسلام نے اس قبضہ کی بھی مخالفت کی اور ان چارہ ہائے مویشی کے علاوہ جن کو غلہ کی طرح بیج ڈال کر اور محنت کر کے بویا جاتا ہے اپنے مقامِ روئیدگی (Place of Growth) میں ان سب کا مفاد عام (Public Good) کر دیا اور کسی کو ان کی ذاتی ملکیت کا حق نہیں بخشا۔ الا اس قدر کہ محنت سے حاصل کر کے اس کو اپنی ملکیت میں لے آئے جیسا کہ گھسیارہ کا گھاس کاٹ کر اپنی ملکیت میں کر لینا یا سقہ کے پانی کو اپنی مشک میں بھر کر مالک ہو جانا۔

(۱) عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم

اللّٰہ تعالٰی عنہ —— ولی الدین خطیب رحمہ اللّٰہ تعالٰی صاحب مشکاۃ المصابیح، الکمال فی اسماء الرجال)

قال: لا تمنعوا فضل الماء لتمنعوا به فضل الكلاء.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ضرورت سے بچے ہوئے پانی سے لوگوں کو اس لیے نہ روک دیا کرو کہ اس بہانے سے تم کو فاضل گھاس سے روکنے کا موقع مل جائے۔

❷ ولأبي داؤد والمسلمون شركاء في ثلاث في الماء والكلاء والنار.[2]

ترجمہ: اور ابوداؤد میں ہے کہ تمام مسلمان پانی، گھاس اور سوختہ (کی لکڑی) میں برابر کے شریک ہیں۔

اور صحاح کی بعض روایات میں نمک کا اضافہ ہے اور بعض روایات میں ایسا کرنے والے پر قیامت میں خدا کے غضب نازل ہونے کی وعید آئی ہے۔

❸ قال أبو عبيد: وهو عندي في الأرض التي لهارب ومالك ويكون فيها الماء العد الذي وصفناه. والكلاء الذي تنبته الأرض من غير أن يتكلف لهار بها لذلك غرسا ولا بذرا.[3]

ترجمہ: ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حکم میرے نزدیک اس زمین کے بارہ میں ہے جو کسی شخص کی مملوکہ ہو اور اس میں بیان کردہ جاری چشمہ کی طرح کا پانی ہو یا بغیر بیج ڈالے اور کھیتی کیے خودرو گھاس اگی ہوئی ہو۔

❹ ومن السحت ما يؤخذ على كل مباح كماء وكلاء وماء

---

(۱) صحيح بخاری، كتاب المساقات، باب من قال ان صاحب الماء أحق بالماء. أبوداؤد، كتاب البيوع، جامع ترمذی، كتاب البيوع، باب ماجاء فی بيع فضل الماء. صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم بيع فضل الماء

(۲) أبوداؤد: السنن، كتاب البيوع باب فی منع الماء. ابن ماجه، كتاب الرهون، باب المسلمون شركاء فی ثلاث حدیث کی باقی کتابوں میں "المسلمون" کی بجائے "الناس" آیا ہے۔

(۳) ابو عبید: کتاب الاموال (۱۳۵۲ھ) ص ۳۰۰

ومعادن.[1]

ترجمہ: اور وہ ٹیکس ظلم ہے جو نمک، گھاس اور پانی اور ظاہری کانوں پر لیا جائے۔

❺ قال ابو یوسف رحمه الله تعالٰی: ولو أن أهل قرية لهم مروج يرعون فيها ويحتطبون منها، قد عرف أنها لهم، فهي لهم على حالها يتبايعونها ويتوارثونها، ويحدثون فيها ما يحدث الرجل في ملكه. وليس لهم أن يمنعوا الكلاء ولا الماء ولا أصحاب المواشي أن يرعوا في تلك المروج يسقوا من تلك المياه الخ[2]

ترجمہ: ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کسی بستی والوں کے متعلق یہ معلوم ہو کہ ان کی چراگاہیں "کہ جس میں وہ اپنے مویشیوں کو چراتے اور اس سے سوختہ حاصل کرتے ہیں" ان کی ذاتی ملک ہیں تو وہ ذاتی ملک ہی رہیں گی اور ان کو اس کے فروخت کرنے، خریدنے اور ترمیم و تنسیخ (Alteration & Cancellation) کرنے کا حق ہے، اور اس میں ان کی وراثت بھی جاری کی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کو یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ وہ چراگاہ کی خود رو گھاس اور اس کے پانی سے دوسروں کو روکیں۔ اور چرواہوں اور مویشیوں والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بغیر روک ٹوک ان چرواہوں میں چرائیں اور ان کا پانی پئیں پلائیں۔

یعنی اگر چراگاہیں حکومت کی ذاتی ملک اور افتادہ زمینوں کی قدرتی چراگاہیں نہ بھی ہوں اور زمینداروں کی ذاتی ملک بھی ہوں تب بھی ان کو خود رو گھاس اور پانی سے

(۱) الدر المختار على حاشية رد المحتار، مطبوعه بمبئی (هند) ۱۳۰۹ھ، ۳۷٤/٥

(۲) ابو یوسف: كتاب الخراج، باب في الكلاء والمروج. ابن عابدين: شامی، ج ٥ كتاب احياء الموات، ص ۳۸۸

دوسروں کو فائدہ اٹھانے سے روکنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ ان دونوں چیزوں میں تمام افراد برابر ہیں۔

کاشت کار اور مستاجر کے لیے چند مزید مراعات

مسطور بالا مظالم کا انسداد اور ان کی جگہ عادلانہ اصلاحات و انقلابات کے علاوہ اس سلسلہ میں چند اور مراعات بھی ہیں جو اس لیے مستاجر اور کاشت کار کے حق میں تسلیم کی گئی ہیں کہ معاملہ زیر بحث میں باہمی تعاون اور شرکتِ منافع کا جو مقصد ہے وہ فوت نہ ہونے پائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی تعمیل ہو سکے۔ جو باہمی معاملات کے لیے ایک بیش بہا اصول ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنهما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: لا ضرر ولا ضرار.(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما(۲) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (تمام معاملات زندگی میں یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے) کہ نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا۔

ارشادِ مبارک کا مطلب یہ ہے کہ صرف لین دین کے معاملات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر اس شعبہ میں کہ جو باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کا محتاج ہے یہ گرانقدر اصول پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ نہ مجھ کو نقصان اٹھانا چاہیے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہیے اور جو کچھ بھی ہو عدل و مساوات اور اخوت و مساوات کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے۔ لہٰذا اسلام کے معاشی نظام میں بھی اس اصول کو بنیادِ کار بناتے ہوئے حسبِ ذیل دفعات کا اعلان کیا گیا ہے:

❶ اگر کوئی زمین پانی میں غرق ہو جانے یا خشک سالی پیش آجانے کی وجہ سے قابلِ

(۱) احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ: مسند، ۲۱/۲۱۲، مرویات عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تعارف باب ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

زراعت نہ رہے یا کسی آفت سے کھیتی تباہ ہو جائے تو اس سال کا (خراج) (مالگذاری) معاف ہے اور اگر آفت سے نقصان پہنچ گیا ہے تو بقدرِ نقصان معافی ہوگی اور خراج کی اس معافی میں خراج موظف (نقدی لگان) اور خراج مقاسمہ (بٹائی) دونوں کا یکساں حکم ہے۔

ولا خراج إن غلب علی أرضه الماء وانقطع أو أصاب الزرع آفة. الخ[1]

ترجمہ: اور اگر کاشت کار کی زمین کو پانی کے سیلاب نے غرق کر دیا یا پانی سے محرومی نے زمین کو ناقابلِ برداشت بنا دیا یا کھیتی کو کسی آفت نے برباد کر دیا تو ان سب صورتوں میں زمین کا خراج (مالگذاری) معاف ہے۔

اور اگر کھیتی کو ضرر "نقصان" پہنچا ہے تو بقدرِ نقصان معاف ہوگا اور خلیفہ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ مزارعین کو اس صورت میں بھی معاف کر دینا مناسب سمجھتا ہے تو کل معاف کر سکتا ہے۔[2]

❷ اگر کاشت کار نے حکومت یا زمیندار سے زمین کو اجارہ پر "بٹائی" (مزارعۃ) سے لیا ہے تو اس صورت میں بھی ان تینوں حالتوں میں مالگذاری اور لگان قطعاً معاف ہیں اور اگر کھیتی کو صرف نقصان پہنچا ہے تو بقدرِ نقصان معاف ہوگا اور موجودہ پیداوار ہی کی بٹائی کی جا سکے گی۔

❸ اور اگر زمین کو نقد لگان (کراء الارض) پر لیا ہے تو اکثر فقہاء اسلام کے نزدیک اس صورت میں بھی تینوں حالتوں میں لگان یا مالگذاری معاف ہے۔

کھیتی پر آفت کی صورت میں امام اعظم رحمہ اللہ اور دیگر آئمہ کی رعایات:

امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین کے غرقِ آب ہو جانے اور پانی سے محروم ہو کر ناقابلِ کاشت ہو جانے پر تو معاف ہے لیکن کھیتی پر

(۱) کنز الدقائق مع شرح بحر الرائق، ج ۵، باب الخراج، ص ۱۱۷

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی والی الخراج

آفت آجانے سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ [۱] کے فقہ میں حسبِ ذیل تفصیلات (فتاویٰ

(۱) امام ابو حنیفہ، نعمان بن ثابت زوطی ابو حنیفہ رحمہ اللہ ۸۰ھ (مطابق ۶۹۹م) کوفہ میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر ریشم کا کاروبار کیا۔ آپ کے زمانہ میں چار اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ــــ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بصرہ میں، حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ میں، حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ میں اور حضرت ابو الطفیل عامر بن واصلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ میں ــــ زندہ سلامت تھے۔ آپ رحمہ اللہ نے پہلے علم الکلام میں مہارت حاصل کی، پھر تجارت میں تجربات حاصل کیے، پھر علم فقہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ نے فقہاء کے مرکز کوفہ جسے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سبب قائم ہوا تھا ــــ کے ترجمان حضرت حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ سے فقہ حاصل کی۔ عطا بن ابی رباح، ابو اسحاق سبیعی، محمد بن المنکدر، نافع، ہشام بن عروہ، سماک بن حرب رحمہم اللہ تعالیٰ سے حدیث سماعت کی۔ مروان بن محمد اموی نے حاکم عراق، ابن ہبیرۃ کے ذریعہ قاضی القضاۃ کے عہدہ کی پیش کش کی مگر انکار کی صورت میں پس دیوار زنداں بھیج دیا گیا، ۱۰۰ کوڑے مارے گئے، زہر کھلایا گیا مگر موقف پر قائم رہے۔ عباسی خلیفہ منصور نے آپ کو کوفہ سے بغداد منتقل ہونے کو کہا۔ آپ ہجرت فرما کر وہاں مقیم ہو گئے، پھر عہدہ قضاۃ کی پیش کش کی گئی، پھر انکار، پھر قید، پھر آخر سانس تک زندان کی رسم وفا کو زندہ رکھا سرمد مجذوب رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت کہا:

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

الحکم بن ہشام رحمہ اللہ نے کیا کہا؟ اور کن کانوں نے کیسے سنا؟

أنه كان من أعظم الناس أمانة، وأراد السلطان على أن يتولى مفاتيح خزائنه أو يضرب ظهره، فأختار عذابهم على عذاب الله. (الكمال في اسماء الرجال لصاحب المشكوة شيخ ولی الدين رحمه الله تعالىٰ الباب الثانی)

ترجمہ: وہ (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ) امانت داری میں دنیا کے عظیم ترین انسانوں میں سے تھے۔ بادشاہِ وقت نے ارادہ کر لیا کہ یا تو وہ ان کے خزانوں کی چابیاں سنبھال لیں یا پیٹھ پر کوڑا پٹوائیں۔ مگر اس (عظیم انسان) نے ان (صاحب اقتدار واختیار) کے عذاب کو عظیم وجلیل اللہ کے عذاب سے ہلکا سمجھ کر اختیار کر لیا۔

یہی امام الحکم بن ہشام رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا تذکرہ امام ابن مبارک رحمہ اللہ کے سامنے کرنے لگا تو انہوں نے مجھے روک کر کہا:

اتذكرون رجلا عرضت عليه الدنيا بحذافيرها ففرّمنها. (حواله بالا)

ترجمہ: ارے تم میرے سامنے اس (عظیم) شخص کا تذکرہ چھیڑنا چاہتے ہو جس پر دنیا اپنے تمام کمال وجمال کے ساتھ پیش کی گئی۔ مگر اس نے اس سے منہ پھیر لیا۔

قید خانہ میں ہی ۱۵۰ھ (مطابق ۷۶۷م) میں وفات پائی۔ آپ مسلک حنفی رحمہ اللہ کے بانی ہیں۔ مسلک حنفی =

قاضی خان[1] میں مذکور) ہیں:

❶ رجل استاجر أرضا ليزرعها فزرعها فأصاب الزرع آفة فهلك أو غرق، ولم ينبت كان عليه الأجر، ولو غرقت الأرض قبل أن يزرعها فلا أجر عليها. وكذا لو غصبها رجل فزرعها الغاصب لا أجر على المستاجر وذكر الشيخ الامام المعروف بخواهر زاده أنه إذا استاجر أرضا للزراعة فزرع فاصطلمه آفة كان عليه أجر ما مضى وسقط عليه أجر ما بقى من المدة بعد الاصطلام.[2]

ترجمہ: کاشت کار نے اگر زمین کو کاشت کے لیے نقد لگان پر لیا اور اس کو بو لیا، جوت لیا، کھیتی کر لی پھر کھیتی کو آفت نے آ گھیرا اور وہ برباد ہو گئی یا پانی میں غرق ہو گئی اور پیداوار نہ ہوئی تو لگان اس کے ذمہ واجب رہا اور اگر زمین کھیتی سے پہلے ہی غرق آب ہو گئی تو لگان معاف ہو جائے گا اور اسی طرح اگر کھیتی سے قبل کسی غاصب نے زبردستی زمین پر قبضہ کر کے اس کو کاشت کر لیا تو کاشتکار کے ذمہ لگان واجب نہیں ہو گا اور شیخ امام

کے پیروکار کی تعداد دو تہائی (۲/۳) مسلمان ہیں۔ زیادہ اکثریت پاکستان، بنگلہ دیش، ہندوستان، افغانستان، ترکی، مصر وغیرہا میں آباد ہے۔ آپ رحمہ اللہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف، امام محمد، امام وکیع بن الجراح، عبد اللہ بن مبارک رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے اساطین علم و فضل ہیں۔

(۱) فتاویٰ قاضی خان: قاضی فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی فرغانی رحمہ اللہ (متوفی ۵۹۲ھ) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے امام محمد بن حسن شیبانی، شاگرد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کتب "ظاہر الروایۃ" اور "النوادر" کو بنیاد بنا کر متقدمین اور متاخرین فقہاء احناف کے دلائل کی روشنی میں نئے مسائل و واقعات کا حل تلاش کرتے اور ان پر فتوی دیتے ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں متاخرین کی آراء مختلف ہوں تو وہ اپنی ترجیح بدلائل بیان کرتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں فتاویٰ عالمگیریہ کے حاشیہ پر شائع ہوئی۔

(۲) قاضی خان، فخر الدين حسن بن منصور الاوزجندی الفرغانی رحمه الله تعالىٰ: فتاوى، ج ۲، مطبوعه كلكتة (هند)، ۱۸۳۵م (فتاویٰ عالمگیری کے حاشیہ پر) كتاب الاجارات، ص ۴۰۳

مشہور بہ خواہر زادہ فرماتے ہیں کہ اگر کاشتکار نے کھیتی کر لی اور بعد میں زراعت کسی آفت سے برباد ہو گئی تو اس صورت میں بھی پورا لگان واجب نہیں ہو گا بلکہ جس عرصہ تک کاشت موجود رہی اس مدت کا لگان واجب ہو گا اور تباہی کے وقت سے آخر سال تک کا معاف ہو جائے گا۔

❷ رجل أستاجر أرضا فزرعها فلم يجد ماء يسقيها فيلبس الزرع قالوا: ان أستاجرها بغير شرب فلم ينقطع ماء النهر الذی يرجی منه السقی، فعليه الأجر، و إن أنقطع كان له الخيار، و إن استاجرها بشربها فانقطع منه الشرب فجاء وقت الذی يفسد فيه الزرع عند القطاع الماء فسد الزرع سقط عنه الأجر الخ.(1)

ترجمہ: (ایسے) کاشتکار کا معاملہ جس نے اگر زمین کو لگان پر لیا اور اس میں کاشت کی اور پھر پانی میسر نہ آیا اور کھیتی خشک ہو گئی تو فقہاء کہتے ہیں: اگر کاشتکار نے پانی کی شرط کے بغیر لگان پر لیا ہے اور جس نہر سے پانی مل سکتا تھا اس کا پانی بھی منقطع نہیں ہوا تو اس صورت میں کاشتکار پر لگان واجب ہے اور اگر پانی کی سبیل منقطع ہو گئی اور وہ بن نہیں پڑتا تو اس کو اختیار ہے کہ وہ زمین کو واپس کر دے۔ اور اگر زمین پانی کی شرط کے ساتھ ملی ہے اور پانی کے ذرائع منقطع ہو گئے اور وہ وقت آ گیا کہ جب پانی کی محرومی کی وجہ سے کھیتی ضائع ہو جاتی ہے اور ضائع ہو گئی تو اس صورت میں کاشتکار سے لگان معاف ہے۔

❸ ولو أستاجر أرضا بشربها ليزرع فيها فخرب النهر الأعظم فلم يستطع سعيها فهو بالخيار إن شاء ردّها و إن شاء

(1) حوالہ بالا

امسکها. فان لم یرد حتی مضت المدة کان علیه الأجر إذا کان بحال یمکنه أن یحتال بحیلة وزرع فیها شیئا بغیر ماء بوجه من الوجوه ولا حیله فی ذالك فلا أجر علیه الخ.[۱]

ترجمہ: اور اگر زمین کو پانی کی شرط کے ساتھ کھیتی کے لیے لیا ہے اور پھر بڑی نہر خراب ہو گئی (اور یہ گولوں اور جیہوں سے) پانی حاصل نہ کر سکا اور سیرابی کی کوئی صورت نہ بن پڑی تو اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو زمین کو واپس کر دے اور چاہے تو قبضہ میں رکھے۔ پس اگر واپس نہ کی اور مقررہ مدت ختم ہو گئی تو اگر یہ صورت ہے کہ اس کو ایسے ذرائع ممکن ہیں کہ بغیر پانی کے وہ اس میں زراعت کر سکتا ہے تب تو لگان واجب ہو گا اور اگر زراعت کی کوئی صورت بھی نہیں ہو سکتی تو لگان واجب نہیں ہے۔

۴ رجل أستاجر أرضا فأنقطع الماء إن کانت والأرض تسقی بماء الارض وماء المطر، وانقطع ماء المطر أیضا لا أجر علیه لأنه لم یتمکن من الإنتفاع بها الخ.[۲]

ترجمہ: اگر کاشتکار نے زمین کو نقد لگان پر لیا، پھر پانی میسر نہ آسکا اور زمین کنوئیں وغیرہ کے پانی اور بارش کے پانی دونوں سے سیراب ہونے والی ہے، اور بارش کا پانی بھی منقطع ہو گیا تو اس صورت میں لگان معاف ہے اس لیے کہ اس صورت میں وہ زمین سے فائدہ اٹھانے پر قادر نہیں ہے۔

اور جن بعض صورتوں میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ یا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک لگان واجب رہتا ہے ان کے نزدیک بھی یہ فیصلہ ہے کہ زمیندار کو کاشت

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا

کار سے اس وقت تک مطالبہ نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ اس کے حالات درست نہ ہو جائیں اور وہ بآسانی لگان ادا کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ چنانچہ شیخ منصور علی ناشف رحمہ اللہ التاج الجامع الاصول کے باب وضع الجوائح سے متعلق احادیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ظاهر ما تقدم أن من أستاجر أرضا وزرعها أو اشترى زرعا أو ثمرا بعد بدوّ صلاحه ثم أصابته جائحة فالحكم وضعها أي سقوط اجارة الأرض وثمن الزرع والثمر بسببها وعليه جماعة. ومنهم الشافعي في القديم. وقال في الجديد وابو حنيفة عليه الضمان. ولكن ينبغي المدائن التساهل معه للحديث الاول. الخ[1]

ترجمہ: اس سے قبل جو احادیث مذکور ہوئیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی نے زمین کو نقد لگان پر لیا اور زراعت کی یا زراعت کو یا درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کو ان کے قابل استعمال ہونے کے بعد خرید لیا پھر اس کو آفت نے آدبایا اور برباد کر دیا تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ لگان اور زمین اور پھلوں کی قیمت دونوں مستاجر اور خریدار سے ساقط ہو جائیں گی اور اسی پر فقہاء کی ایک جماعت نے فتویٰ دیا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے اور ان کا قولِ جدید اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ (ان تفصیلات کے ساتھ جو گذشتہ سطور میں بیان ہو چکیں) کاشت کار پر لگان اور خریدار پر قیمت واجب ہے لیکن "صاحبِ زمین اور صاحبِ ثمر" کو چاہیے کہ حدیثِ اول کے مطابق اپنے مطالبہ میں سہولت اور نرمی کا معاملہ کرے۔

---

(۱) ناشف، شیخ منصور علی رحمہ اللہ تعالیٰ، ناصف ازھری، التاج الجامع الأصول، باب وضع الجوائح، ۲/۲۶۲

لیکن لگان کی کمی اور معافی کا یہ حکم ان ہی صورتوں میں ہے کہ زمین اور کھیتی پر آئی ہوئی تباہی مستاجر کے اختیار سے باہر ہے اور اگر یہ تباہی اور خرابی اپنے ہاتھوں سے لائی گئی ہے یا جان بوجھ کر غفلت برتی گئی تو پھر کمی یا معافی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ یہ صاحبِ زمین کو نقصان پہنچانا ہے اور "ضرار" میں داخل ہے۔

جب سرکار اور کاشتکار کے درمیان زمیندار کا دخل ہو:

❹ اگر کاشت کار زمین کا خود مالک نہیں ہے اور حکومت اور کاشت کار کے درمیان زمیندار کا بھی داخل ہے تو سرکاری مالگذاری (عشر یا خراج) اصولاً زمیندار کے ذمہ ہے نہ کہ کاشت کار کے ذمہ، چنانچہ فقہ میں اس کی جو جزئیات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ تصریحات موجود ہیں:

❶ والحاصل ان العشر عند الإمام على رب الأرض مطلقا وعند هما كذلك لو البذر ولو من العامل فعليهما. ثم اعلم ان هذا كله في العشر إما الخراج فعلى رب الأرض اجماعا. الخ [1]

ترجمہ: حاصل کلام یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک "عشر" ہر حالت میں مالکِ زمین کے ذمہ واجب ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہی حکم ہے اگر بیج مالکِ زمین کے ذمہ ہے اور اگر کاشتکار کے ذمہ ہے تو دونوں کے ذمہ بقدر حصہ ہو گا اور واضح رہے کہ یہ تفصیل بھی صرف عشر کے متعلق ہے لیکن خراج اور نقد لگان (کراء الارض) میں باتفاق ہر صورت میں مالگذاری زمیندار کے ذمہ ہے۔

❷ وفي المزارعة إن كان البذر من رب الأرض فعليه، ولو من العامل فعليهما بالحصة الخ. [2]

---

(۱) ابن نجیم: بحر الرائق، ۱۱۷/۵

(۲) ابن العابدين: ردالمختار، ج ۲، مطبع دار السعادة، قاهرة ۱۳۲٤ھ، باب ۱۰، ص ۷٦

ترجمہ: اور مزارعۃ (بٹائی) میں اگر بیج مالکِ زمین کا ہے تو عشر اسی پر واجب ہوگا اور اگر کاشت کار کے ذمہ بیج ڈالنا ہے تو دونوں پر حصہ رسدی واجب ہوگا۔

ان تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں سرمایہ (زمین) اور محنت میں عادلانہ توازن کا بخوبی لحاظ رکھا گیا ہے اور خاص مسئلہ میں محنت کو سرمایہ کے مقابلے میں نفع کا حق زیادہ دیا گیا ہے۔ نیز ان مسائل میں مالگذاری کے واجب ہونے نہ ہونے میں ''بیج'' کو اس لیے اہمیت دی گئی ہے کہ زمین کی کاشت کے مسئلہ میں جس کے ذمہ بیج ہوتا ہے حقِ انتفاع بھی اسی کو زیادہ حاصل ہوتا ہے۔

سرکاری زمین کے کاشتکار کو بے دخل نہ کیا جائے:

۵ اگر زمین سرکاری ہے اور کاشت کار مقررہ لگان (کراء الارض) ادا کر رہا ہے تو اس کو زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا اور یہ اس لیے کہ کاشتکار جبکہ زمین نہیں رکھتا اور اس نے اپنی معاشی زندگی کے لیے ایک زمین کو کرایہ پر حاصل کیا ہے تو اس کا یہ حق ہونا چاہیے کہ جب تک وہ زمین کا واجبی لگان ادا کرتا رہے اس سے یہ معاشی ذریعہ چھینا نہ جائے، چنانچہ شامی نے ارضِ موقوفہ (State Land or Endowed Land) کی بحث میں یہ تصریح کی ہے:

ثم إعلم أن أراضی بیت المال المسماة بأراضی المملکة وأراضی الحوذ إذا کانت فی ایدی زراعها لا تنزع من أیدیهم ما دموا یؤدّونها ما علیها، ولا یورث عنهم اذا ماتوا ولا یصح بیعهم لها، ولکن جری الرسم فی الدولة العثمانیه ان من مات عن ابن انتقلت لابنه مجانا والا فلبیت المال. الخ[1]

ترجمہ: یہ واضح رہے کہ بیت المال کی زمین کہ جن کو ارض حوز اور ارض مملکت کہا جاتا ہے ان کو اگر کاشتکار کاشت کر رہے ہیں تو جب تک وہ

(۱) حوالہ بالا، ج ۳، باب العشر والخراج والجزیة، ص ۵۵

اس کا مقررہ لگان ادا کر رہے ہیں ان زمینوں کو ان کے قبضہ سے نہیں نکالا جائے گا۔ مگر وہ ان میں وراثت نہیں چلا سکتے اور نہ ان زمینوں کو فروخت کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن دولتِ عثمانیہ میں یہ رسم جاری ہو گئی ہے کہ اگر کسی کاشتکار کے انتقال کے وقت اس کا لڑکا موجود ہے تو وہ سرکاری زمین اس کی جانب مفت منتقل ہو جاتی ہے ورنہ تو پھر بیت المال ہی کی جانب واپس ہو جاتی ہے۔

یہ حکم اگرچہ زمینِ وقف اور زمینِ حکومت سے متعلق ہے لیکن کاشتکار کے قبضہ سے نکالنے کی جو فقہی وجہ بیان کی گئی ہے ''کہ وہ مقررہ لگان برابر ادا کر رہا ہے'' چونکہ یہ وجہ شخصی زمیندار کی زمین پر بھی صادق آتی ہے اس لیے خلیفہ اور امیرالمؤمنین کے اختیار میں ہے کہ وہ اگر چاہے تو یہی شخصی اراضی پر بھی عائد کر دے۔

نیز اس لیے بھی کہ جب کاشتکار کسی زمین کو محنت کے ذریعہ قابلِ کاشت بناتا ہے تو وہ یہ محنت اس یقین پر کرتا ہے کہ اس محنت کا پھل اس کے حصہ کے مطابق اس کو ضرور ملتا رہے گا۔ پس اگر زمیندار کو یہ حق بغیر کسی قید و شرط کے حاصل ہے کہ وہ جب چاہے کاشتکار کو زمین سے اس لیے بے دخل کر دے کہ وہ مالکِ زمین ہے تو ایسی حالت میں وہ کاشتکار کے اس نفع کا غاصب (Usurper) ہوتا ہے جس کو کاشتکار کی محنت نے کاشت کار کے لیے وقتی کاشت کے علاوہ بطور ثمرہ ممتد (Continuous) کے بخشا تھا البتہ اگر ''زمین'' عقد کے عرصہ بعد حالات و واقعات کی بناء پر ازدیاد (Increase) لگان کی مستحق ہے تو بلاشبہ صاحبِ زمین کو ازدیاد کے مطالبہ کا اسی طرح حق ہے جس طرح خصوصی حالات و واقعات کی بناء پر انتقاص (کمی) کے مطالبہ کا کاشتکار کو حق حاصل ہے۔

کاشتکار کا کاشت کردہ زمین پر رہائشی مکان اور درخت:

❻ اگر کاشت کار نے رہنے کے مکان میں یا کاشت کی زمین میں کوئی درخت لگالیا

ہے اور اس سے زمین کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا تو صاحبِ زمین اس درخت کو اکھاڑنے پر مجبور نہ کرے اور اگر لگانا چاہتا ہے تو اجازت دے دے اور یہ درخت کاشتکار ہی کی ملکیت میں رہے گا۔ البتہ جب وہ زمین سے بے دخل ہو جائے یا اجارہ فسخ ہو جائے تو صاحبِ زمین اگر اپنی زمین کو اس درخت سے خالی کرانا چاہے تو کاشتکار کو اپنا درخت اکھاڑ لینا ہو گا۔

للمستاجر غرس الشجر بلا إذن الناظر إذا لم يضرّ بالأرض وليس له الحفر إلا بإذن و يأذن له خيرا و إلا لا. وما بناه مستاجر أو غرسه فله مالم ينوه للوقف.[1]

ترجمہ: ناظر وقت کی اجازت کے بغیر کاشتکار کو درخت لگا لینے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ زمین کو اس سے نقصان نہ پہنچتا ہو اور اس کو ناظر کی اجازت کے بغیر زمین کی کھدائی کا حق نہیں ہے، مگر ناظر کو چاہیے کہ اگر زمین کے لیے یہ امر بہتر ہے اور مضر نہیں ہے تو اجازت دے دے ورنہ نہیں۔ تاہم کاشتکار نے جو مکان بنایا ہے یا جو درخت لگایا ہے وہ کاشتکار ہی کا ہے جب تک کہ وہ اس کو وقف نہ کر دے۔

غرض یہ اور اسی قسم کے اور حقوق ہیں جو کاشتکار کی آسانیوں اور سہولتوں کے پیشِ نظر قائم کیے گئے ہیں کیونکہ مبسوط اور دیگر کتب فقہ سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مزارعۃ اور اجارہ زمین کے جواز میں تعاونِ باہمی کے ساتھ ساتھ مستاجر (کاشتکار) کی معاشی حاجت کا انسداد اور رفعِ ضرورت زیادہ مقصود ہے۔[2]

---

(۱) درمختار بر رد المحتار: ۵۹۳/۳ بحث ارض موقوفہ و البحر الرائق، ۱۳/۸

(۲) نوٹ: اس بحث میں چند امور قابلِ لحاظ ہیں:

(الف) خراج ان زمینوں پر عائد ہوتا ہے جو کاشت کرنے والوں کی ذاتی ملکیت ہوتی ہیں اور اگر حکومت یا کسی دوسرے فرد کی زمین کو نقد اجرت پر کاشت کے لیے لیا جائے تو وہ "اجرت ارض" کہلاتی ہے۔ کتاب میں دونوں باتوں کی تفصیل کے باوجود ان مسائل میں دونوں کو ایک لفظ "لگان" ہی سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے ان مسائل میں دونوں کے احکام یکساں ہیں اور جن احکام میں فرق ہے وہ یہاں زیرِ

بنجر زمینوں کو مزروعہ بنانا

(Rerival of Waste Lands)

زراعت کو ترقی دینے اور اس کی افادیت کو وسیع کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جانے چاہئیں ان میں سے ایک ذریعہ "احیاءِ اموات" (Rerival of Waste Lands) ہے یعنی بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنانا گویا ناقابلِ کاشت زمین مردہ زمین ہے اور اس کو قابلِ کاشت بنانا اس کو زندگی بخشنے کے مترادف ہے چنانچہ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے قرآن عزیز نے یہی اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔

﴿فَأَحْيَا بِهِ ٱلْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۱)

ترجمہ: پھر زندہ کر دیا ہم نے پانی سے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد۔

خشک چٹیل میدان، ریتلی زمینیں اور خشک ٹیلے عام طور پر ناقابلِ زراعت ہوتے ہیں مگر سخت محنت اور بعض زراعتی تدابیر کے ذریعہ ان میں سے اکثر حصہ کو قابلِ کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ پس اسلام کے معاشی نظام کا یہ بھی ایک اہم حصہ ہے کہ ملک کی اس قسم کی تمام زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا جائے اور خام پیداوار سے ملک کو مالا مال کیا جائے اور حتی الامکان زمینوں کو بنجر نہ رہنے دیا جائے اسی طرح جو زمینیں قابلِ کاشت ہونے کے باوجود غیر آباد پڑی ہیں یا لاوارث ہیں ان کو بھی مزروعہ بنایا جائے۔ اور بیکار و معطل نہ رہنے دیا جائے۔

بحث نہیں ہیں۔

(ب) عام بول چال میں لگان اور مالگذاری میں فرق ہے اگرچہ حاصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کاشتکار اگر خود مالکِ زمین ہے تو اس سے وصول شدہ ٹیکس "مالگذاری" کہلاتا ہے اور اگر حکومت اور کاشتکار کے درمیان زمیندار ہے تو حکومت جو ٹیکس زمیندار سے لیتی ہے وہ مالگذاری کہلاتا ہے اور زمیندار کاشتکار سے جو اجرت لیتا ہے وہ لگان ہے۔

(ج) "عشر" کے علاوہ "جو کہ ایک مقررہ زکوٰۃ ہے" تخفیف لگان و مالگذاری کے مسائل "خراج" اور "اجارہ" (کراء الارض) دونوں سے متعلق ہیں۔

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ١٦٤

بنجر زمین کی آبادی کاری کے طریقے:

اسلام کے معاشی نظام میں اس کے لیے دو طریقے ہیں:

اقطاع یا جاگیر کا طریقہ:

ایک یہ کہ امیر المؤمنین افرادِ ملک کو ترغیب دے اور اعلان کرے کہ جو شخص ان زمینوں کے جس قدر حصہ کو آباد کرے گا وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا اس کو عربی میں اقطاع اور اردو میں ''جاگیر'' کہتے ہیں۔

وللإمام أن يقطع كل موات، وكل ما كان ليس لأحد فيه ملك، وليس في يد أحد و يعمل في ذلك بالذي يرى أنه خير للمسلمين وأعم نفعا.[1]

ترجمہ: اور امام کو چاہیے کہ وہ بنجر زمینوں کو اور غیر مملوکہ اور لاوارث زمینوں کو جاگیر کے طور پر دے دے (تاکہ وہ مزروعہ بن سکیں) اور ان کے سلسلہ میں ایسا عمل اختیار کرے جس میں تمام مسلمانوں کی بھلائی اور نفع عام ہو۔

''اور فقہاء کے نزدیک بنجر زمین، سخت زمین، ریتلی یا ریت چڑھی ہوئی زمین، پتھریلی زمین ٹیلے جو آبادی سے دور ہوں اور جن کا نہ کوئی مالک ہے یا مالک کا پتہ نہیں چلتا اور خلاصۂ کلام یہ کہ جو زمین ناکارہ پڑی ہو اور اس کی خرابی قدیم اور عادی ہو (تو یہ سب موات ہیں) پس اگر کسی مسلمان یا ذمی (کافر) نے خلیفہ کی اجازت سے اس کو زندہ (قابلِ زراعت) کر لیا تو وہ زمین اسی کی ملکیت ہو جائے گی۔''[2]

اور اگر امام یہ سمجھ کر کہ زمین بہت زیادہ محنت اور خرچ کے بعد قابلِ کاشت ہو سکتی ہے ایک دو سال کا لگان بھی معاف کر دے تو اس کو ایسا کرنے کا مجاز ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی زمینوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

---

(۱) ابو يوسف: كتاب الخراج، باب في موات الأرض في الصلح والعنوة وغيرها، ص ۱۴۱

(۲) سعيديات في المعاملات: ص ۳۰۰، ۳۰۱

❶ من عمر أرضا ليست لأحد فهو أحق بها.[1]

ترجمہ: جس شخص نے ایسی زمین کو کاشت کے قابل بنالیا جو کسی کی ملک نہیں ہے تو وہ شخص ہی اس کی ملکیت کا مستحق ہے۔

❷ من أحيا أرضا مواتا فهي له.[2]

ترجمہ: جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ کرلیا وہ اسی کی زمین ہے۔

بنجر زمین کی آباد کاری کی شرائط:

اس کے لیے تین شرطیں ہیں:

❶ ایک یہ کہ وہ زمین فناءِ شہر میں شامل نہ ہو یعنی عام شہری ضروریات کے کام میں نہ آتی ہو۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

"اور اے امیر المؤمنین! آپ نے ان زمینوں کے متعلق دریافت کیا ہے جو فوج کشی کے ذریعہ سے یا مصالحت کی راہ سے فتح کی گئی ہیں اور ان زمینوں کے متعلق دریافت کیا ہے جو بعض دیہات میں اس حالت کے اندر موجود ہیں کہ نہ ان میں مکان ہونے کے نشانات پائے جاتے ہیں اور نہ زراعت کے تو ان کے متعلق کیا مشورہ ہے؟ پس اگر ایسی زمینوں میں نہ مکانیت کے اثرات ہوں اور نہ زراعت کے اور نہ وہ اہل بستی کے حق میں فئ ہو اور نہ قبرستان ہو اور نہ چراگاہ اور نہ وہ کسی کی ملکیت ہو اور نہ کسی کی مقبوضہ تو ایسی زمین "أرض اموات" ہے پس جو شخص اس کو یا اس میں سے بعض حصہ کو زندہ (کاشت) کرلے تو وہ اسی کی ملک ہو جائے گی۔"[3]

---

(۱) صحیح امام بخاری، ابواب الحرث والمزارعة، باب من أحيا أرضا مواتا

(۲) جامع ترمذی، ج ۲. ابواب الاحکام. تحفة الاحوذی باب ما ذكر فی أحياء أرض الموات. ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الأرض الخ ص ۱۳۸

(۳) حوالہ بالا: ص ۱۳۷

ایسی زمینوں کے متعلق جاگیر کے طور پر دے دینے کا بھی اختیار ہے اگر مناسب سمجھیں اور اجرت پر کاشت کرالینا یا کوئی دوسرا مناسب طریقہ اختیار کر لینا بھی جائز ہے۔[۱]

❷ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایسی زمین پر اجازت امام سے قبضہ کر لینے کے بعد تین سال تک اس کو بنجر ہی رہنے دیا اور جاگیر دینے کا جو مقصد تھا وہ پورا نہ کیا تو وہ زمین اس کے قبضہ سے نکال لی جائے گی اور کسی دوسرے شخص کو دے دی جائے گی جو اس کو کاشت کرے اس لیے کہ اس نے اس مفاد کو پورا نہ کیا جس کے لیے زمین اس کو بطور جاگیر دی گئی تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

عادي الأرض لله وللرسول ثم لكم من بعد فمن أحياء أرضا ميتا فهي له وليس لمحتجر حق بعد ثلاث.[۲]

ترجمہ: افتادہ (غیر مملوکہ) زمین اللہ اور اس کے رسول (خلافت) کی ہے پھر اس کے بعد تمہارے لیے ہے پس جس شخص نے اس کو زندہ کاشت کر لیا تو وہ اسی کی ملک ہے اور بے کاشت روک رکھنے والے کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جاتا ہے۔

بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۳] کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا: ص ۱۳۹

(۳) بلال بن حارث ابن عاصم بن سعید بن قرۃ بن خلاف بن ثعلبہ ابو عبد الرحمٰن مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ۵ ہجری میں قبیلہ مزینہ کا وفد لے کر حاضر ہوئے تھے۔ فتح مکہ کے دن قبیلہ مزینہ کا جھنڈا انہوں نے تھام رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد انہوں نے بصرہ اقامت اختیار کر لی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے آخری دنوں میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔ (دیکھئے: ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ تعالیٰ: اسد الغابة فی معرفة الصحابه رضی اللہ تعالیٰ عنهم، ترجمہ بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ. مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ: التعلیق الممجد لمؤطا امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، حاشیہ باب الرکاز)

ایک بہت بڑا ''مربعہ'' جاگیر کے طور پر دے دیا تھا مگر وہ اس تمام کو کاشت میں رکھنے سے معذور تھے اس لیے ایک کافی حصہ اراضی بیکار پڑی رہتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو بلا کر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو اس لیے جاگیر دی تھی کہ اس کو کام میں لاؤ اور فائدہ اٹھاؤ مگر اتنے بڑے حصہ آراضی کو تم کام میں لانے سے معذور ہو۔ لہٰذا بقدرِ ضرورت رکھ لو اور باقی واپس کر دو تاکہ میں حاجت مند مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔

فقال: لا افعل، واللہ شیئا اقطعنیه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم. فقال عمر رضی اللہ تعالٰی عنه: واللہ لتفعلن فأخذ منه ما عجز عن عمارته فقسمه بین المسلمین.[1]

ترجمہ: بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: یہ جاگیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بخشی ہوئی ہے خدا کی قسم! میں ہرگز اس میں سے کچھ نہ دوں گا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم! تجھ کو یہی کرنا ہوگا اور جس قدر اراضی کو وہ کام میں لانے سے عاجز تھے اس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے واپس لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

۳ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ زمین، کنوئیں، باؤلی، تالاب اور چشمہ کی حریم (Boundary) نہ ہو۔[2]

---

(۱) ابو عبید: کتاب الاموال، ص ۲۹۰

(۲) جنگل میں کنوئیں، باؤلی، تالاب اور چشمہ کی ضروریات اور ان کی حفاظت کے لیے چہار جانب جو جگہ چھوڑی جاتی ہے اس کو ''حریم'' (باڑہ) کہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جو کنوئیں چوپایوں کے پانی پینے کے لیے ان کے چہار جانب چالیس گز زمین چھوڑی جائے اور جو زراعت کے لیے بنائے گئے ہیں ان کے لیے ساٹھ گز مربع زمین اور چشموں کے لیے پانچ سو گز زمین مربع چھوڑنی چاہیے۔ کتاب الخراج ص ۰۰ او سعیدیات جز ص ص ۲۱۲۔

آباد کاری کا دوسرا طریقہ:
حکومت اپنی نگرانی میں کاشت کرائے:

بنجر زمینوں کو آباد کرنے اور کاشت کے قابل بنانے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ حکومت (خلافت) خود اپنی نگرانی میں کاشت کرائے اور وہ حکومت ہی کی ملکیت رہیں۔

ایسی زمینوں کے لگان کے متعلق فقہی احکام یہ ہیں کہ اگر یہ زمین ذمی کے قبضہ میں دی گئی ہے تو باتفاق آراء (Consensus of Opinions) اس پر خراج مقرر کیا جائے گا اور اگر "مسلم" کے قبضہ میں دی گئی ہے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور دوسرے آئمہ کے نزدیک اگر وہ زمین عشری زمینوں سے ملحق یا اس کا جزء ہے تو اس پر "عشر" واجب ہو گا اور اگر خراجی زمینوں سے ملحق یا اس کا حصہ ہے تو اس پر "خراج" عائد ہو گا۔

اور امام محمد رحمہ اللہ [1] فرماتے ہیں کہ اگر عشری زمین کے پانی سے اس زمین کو سیراب کیا گیا ہے تو اس پر عشر عائد ہو گا اور اگر خراجی زمینوں کے پانی سے سیراب کی گئی ہے تو خراج واجب ہو گا۔ [2]

---

(۱) امام محمد، محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ (۱۳۲ھ۔ ۱۸۹ھ) امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ فقہ حنفی کی تدوین و اشاعت کا تقریباً سار کام آپ ہی کتب سے ہوا۔ جنہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: کتب ظاہر الروایۃ جن میں المبسوط، الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، کتاب السیر الکبیر، کتاب السیر الصغیر اور زیادات ہیں، جنہیں ابو الفضل مروزی رحمہ اللہ نے "الکافی" میں اکٹھا کیا، جن کی شرح شمس الآئمہ امام سرخسی رحمہ اللہ نے "المبسوط" میں تیس (۳۰) بڑی بڑی جلدوں میں لکھی۔ دوسری قسم کتب النوادر پر مشتمل ہے۔ اس قسم میں کتاب امالی یا کسانیات (جسے شعیب کسائی نے روایت کیا) کتاب الرقیات، کتاب ہارونیات، جر جانیات، کتاب المخارج فی الحیل، الزیادات اور کتاب نوادر محمد رحمہ اللہ بروایت ابن رستم رحمہ اللہ۔ آپ ہارون الرشید کے عہد میں رقہ کے قاضی بھی رہے آپ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ ـــــ بانی فقہ شافعی ـــــ کے استاد ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ)

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الأرض فی الصلح والعنوة وغیرهما. فتاوی عالمگیری، کتاب الخراج

چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس جانب پوری توجہ فرمائی اور اذن عام دیا کہ جو شخص ان زمینوں کو آباد کرے گا وہ اسی کی ملک ہو جائے گی اور اگر کسی نے قبضہ سے تین سال تک اس کو مزروعہ نہ بنایا آباد نہ کیا تو اس کے قبضہ سے نکال لی جائے گی اس فرمان کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس طرح قلمرو ِ خلافت کی تمام زمینیں مزروعہ اور آباد ہو گئیں اور حکومت کی ترقی کا باعث بنیں۔ (۱)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احیاء موات کے لیے اقطاع (جاگیر دینے) کا یہ طریقہ سلف میں مسلسل جاری رہا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اقطاع (جاگیر دینے) کے بارہ میں ان آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف قوموں کو زمینیں دی ہیں اور آپ کے بعد خلفاء نے بھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس عمل میں یہ حکمت سمجھی کہ اس ذریعہ سے اسلام کے ساتھ قوموں کی رغبت بھی بڑھتی ہے اور زمین کی آبادی بھی ہوتی ہے اور اسی طرح آپ کے خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس اسلامی بیت المال کی رفاہیت و ترقی اور دشمن کو زک دینے کا سبب سمجھتے تھے یعنی مالی خوشحالی حکومت کے ساتھ رعایا کی وفاداری کا موجب ہوتی ہے۔ (۲)

---

(۱) ابو یوسف: حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا. غیر مزروعہ اور بنجر زمینوں (Un-Cultivated & Barren Lands) کی آبادی کاری کے سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا اپنے گورنر کے نام حکم ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔ ترجمہ پڑھیے:

"اپنے صوبہ میں (بے کار) پڑی زمینوں کا اچھی طرح جائزہ لو اور انہیں پیداوار کے پچاس فی صد (۵۰٪) حصہ پر مزارعت کی شرط پر (بے زمین کسانوں یا ضرورت مند کسانوں میں) تقسیم کر دو۔ اگر زمین کم تر درجہ (زرخیزی) کی ہو تو ایک تہائی (۱/۳ حصہ) بلکہ اس سے بھی کم ریاستی حصہ پر دے دو، حتیٰ کہ (زمین کے محل وقوع اور زرخیزی کو مدنظر رکھتے ہوئے) دسویں (۱/۱۰) حصہ پر دے دو۔ البتہ اگر زمین اتنی ہی بنجر اور بے کار ہو گئی ہے کہ کوئی شہری اسے ۱/۱۰ حصہ پر بھی کاشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر اسے مفت دے دو۔ اگر کوئی ایسی بنجر زمین ہو جسے کوئی کسان مفت کاشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر مسلمانوں کے بیت =

ذرائع آبپاشی کو ترقی دینا

نہریں:

زراعت کی ترقی اور وسعت کے سلسلہ میں چوتھا ذریعہ ”وسائل آبپاشی کو سہل الحصول اور وسیع بنانا ہے“ اسی وجہ سے زراعتی ترقی میں نہروں اور آبپاشی کے کنوؤں کو بہت دخل ہے اور آبپاشی کی وسعت ہی ایک ذریعہ ہے جو زراعت کی بیش از بیش ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

آب پاشی کے اصول:

اس لیے اسلام نے بھی اپنے اقتصادی نظام میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کو عملی صورت دینے اور اس کے افادہ کو زیادہ سے زیادہ عام بنانے کے لیے چند اصول مقرر کیے ہیں:

❶ تالاب کھیتیاں، جوہڑ، کنوئیں اور چشمے اگر شخصی ملکیت نہیں ہیں تو ان میں تمام پبلک کا یکساں حق انتفاع (Right of Benefit) ہے اور وہ کسی بھی حال میں شخصی ملکیت نہیں بن سکتے۔ قرآن عزیز میں ناقہ صالح (علیہ السلام) کے واقعہ میں ہے:

﴿لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿١٥٥﴾﴾ (۱)

ترجمہ: ناقہ کے لیے ایک دن پانی کی باری ہے معین اور تمہارے لیے ایک دن معین۔“

﴿وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۖ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾﴾ (۲)

المال سے خرچ کر کے اسے زیر کاشت لاؤ (اور ایسا کرتے رہو) یہاں تک کہ تمہارے زیر تسلط کوئی بھی زمین تمہاری عدم توجہ کا شکار (ہو کر بے کار) نہ ہو جائے۔“ (یحیی بن آدم القرشی: کتاب الخراج، مطبوعہ لیدن، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۵)

(۱) سورۃ الشعراء (۲۶): ۱۵۵

(۲) سورۃ القمر (۵۴): ۲۸

ترجمہ: (اور ان کو مطلع کر دو کہ پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان باری سے بٹا ہوا ہے لہذا اپنی باری پر پہنچنا چاہیے)۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "المبسوط" میں ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمام مسلمان تین چیزوں میں برابر کے شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ۔ اور دوسری روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام انسان ان تینوں چیزوں میں برابر کے حصہ دار ہیں اور یہ روایت پہلی روایت سے عام ہے کیونکہ اس میں مسلمان اور کافر سب کی شرکت کا اعلان ہے۔ اور واقعہ بھی یونہی ہے کہ تمام انسان ان چیزوں میں برابر کے حقدار ہیں اور پانی کے بارے میں یہ شرکت وادیوں کے پانی اور دریاؤں (یعنی خودرو پانی) سے متعلق ہے۔ مثلاً سیحون، جیحون، فرات، دجلہ، نیل وغیرہ اس لیے کہ ان سے فائدہ اٹھانا ایسا ہے جیسا کہ سورج کی دھوپ اور ہوا سے فائدہ حاصل کرنا کہ اس میں تمام کائناتِ انسانی مساوی شریک ہیں اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس افادہ سے دوسرے کو روک دے یا اس کی مثال راستہ اور شارع عام کی سی ہے جس پر ہر مسلم و کافر سب کو چلنے کا برابر حق ہے اور لفظ شرکت سے اصل اباحۃ (Permission) اور انتفاع (نفع اُٹھانے) میں تمام انسانوں کا مساوی ہونا مراد ہے یہ مراد نہیں کہ وہ ان کی ملک ہے اس لیے کہ پانی وادیوں اور دریاؤں میں کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوتا۔"[1]

❷ اور اگر یہ پانی شخصی ملکیت بھی ہو تب بھی عام حالات میں پینے اور استعمال کرنے کے لیے دوسروں کو اس سے یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے کیونکہ پانی اپنے مقام میں کسی کی بھی شخصی ملک نہیں ہے اور نہ اس حالت میں اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔ البتہ انسانوں اور حیوانوں کے پینے اور نہانے جیسی ضرورتوں کے علاوہ "آبپاشی کے لیے" مالکِ زمین سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے اور بصورتِ اذن مالک کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس کی اجازت دے اور اگر ایسا کرنے میں خود اس کی

(۱) امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: المبسوط، مطبع السعادۃ، قاھرۃ، ۱۳۳۱ھ، ۱۲/۱۶۴

اپنی زراعت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو وہ دوسروں کو آبپاشی کرنے سے روک دینے کا مجاز ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب سعیدیات، مبسوط اور کتاب الخراج میں ہے:

اور بعض پانی ذاتی ملک بھی ہوتے ہیں جو شخصی کنوؤں، حوضوں، گولوں اور خاص چشموں کی صورتوں میں نظر آتے ہیں تو ان میں بھی ہر شخص کو پانی پینے اور اپنے چوپایوں کو پانی پلانے کا عام حق ہے، جیسا کہ گذشتہ حدیث سے واضح ہے اور اگر چوپایوں کی آمد و رفت سے کنوئیں یا نہر کی فصیلوں کو تباہ ہونے اور خراب ہو جانے کا خطرہ ہو تو مالک زمین اس کی حفاظت کی حد تک روک بھی سکتا ہے البتہ ایسے کنوؤں، حوضوں، نہروں اور خاص چشموں سے دوسروں کو آبپاشی کرنے کا حق نہیں ہے۔[۱]

والماء في الحوض ليس مملوك لصاحب الحوض فلا يجوز بيعه الخ.[۲]

ترجمہ: اور حوض میں جمع کردہ پانی صاحبِ حوض کی ملک نہیں ہے اس لیے اس حالت میں اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

وله أن يمنع السقى للأرض والزرع والنخل والشجر، وليس لأحد أن يسقى شيئا من ذالك إلّا بإذنه.[۳]

ترجمہ: اور مالک کا یہ حق ہے کہ وہ زمین، کھیت، کھجوروں کے باغ اور درختوں کی آبپاشی سے روک دے اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر آبپاشی کا اقدام کرے۔

---

(۱) سعیدیات: جزء ۲ ص ۳۰۲

(۲) سرخسی رحمه الله تعالىٰ: المبسوط، ۱۹۴/۲۳

(۳) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی القنی والآبار والانهار والشرب، (شرب الشفة)، ص ۲۰۵

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے غلام نے ان کو خط لکھا کہ میں نے آپ کی زمینوں کی آب پاشی اور باغوں کی سیرابی کے بعد باقی پانی کا معاملہ تیس ہزار درہم میں دوسروں سے کر لیا ہے اور آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جواب دیا: میں تمہارا مطلب سمجھ گیا لیکن میرے پیشِ نظر وہ حدیث ہے جس میں ضرورت سے فاضل پانی اور گھاس کو روکنے اور دوسروں کو فائدہ نہ پہنچنے دینے والے شخص کے بارہ میں سخت وعید کا تذکرہ اور قیامت میں رسوائی کا ذکر کیا گیا ہے۔ لہذا تم زمینوں اور باغوں کی سیرابی و آبپاشی کے بعد ہمسایوں کو موقع دو کہ وہ اس پانی سے مفت اپنے کھیت اور باغ سیراب کریں اور اس میں درجہ بدرجہ نزدیکی کا لحاظ رکھنا۔ والسلام (۱)

نہریں:

آبپاشی کے لیے کثرت سے نہریں کھدوائی جائیں اور اس کا تمام خرچ بیت المال (سرکاری خزانہ) پر لازم ہے اور اگر بیت المال میں گنجائش نہیں ہے تو اہلِ دول پر جبر کیا جائے گا، کہ وہ حکومت کو اس معاملہ میں مدد دیں۔

”اور اگر نہریں حکومت کی جانب سے کھودی جارہی ہیں تو ان کا تمام خرچ بیت المال کے ذمہ ہے اس لیے کہ وہ مصلحت عامہ کے لیے ہیں لہذا کسی خاص جماعت پر اس کا خرچ نہیں ڈالا جا سکتا کیونکہ بیت المال میں اگر مال موجود ہے تو اسی قسم کی مصالح کے لیے ہے اور اگر بیت المال میں گنجائش نہیں ہے تو خلیفہ لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ نہروں کی اس کھدائی میں صرف کے ذمہ دار ہوں اس لیے کہ بیت المال میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے اگر نہروں کی کھدائی نہ کی جائے گی تو یہ لوگوں کے لیے بہت بڑے نقصان کا باعث ہوگا اور یہ شاذ و نادر بات ہے کہ عام مصالح کی خاطر لوگ برضاء و رغبت خرچ پر تیار ہو جائیں اور چونکہ امام مصالح عامہ کا نگران ہے

---

(۱) حوالہ بالا، باب بیع الماء، ص ۲۰۷

اس لیے اس کو اس معاملہ میں جبر کرنے کا حق ہے۔"(۱)

❹ جو چھوٹی چھوٹی نہریں عام مصالح آبپاشی اور بہم رسانی آب کے لیے نہ بنائی جائیں بلکہ ان کو اہل محلہ یا اہل قصبہ و شہری اپنی ضروریات کے لیے بنانا چاہیں تو اگر اس میں مصالح عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو اور جس دریا یا بڑی نہر سے پانی لیا جائے گا اس کو نقصان پہنچ کر عام ضروریات کے لیے حرج پیدا نہ کرتا ہو تو امام ایسی خصوصی نہروں کی اجازت دے سکتا ہے البتہ ان کے اخراجات کا مطالبہ کرنے والوں پر پڑے گا۔ حکومت کا خزانہ ذمہ دار نہ ہو گا۔

"اور اگر نہر کسی ذاتی ملکیت میں اس کی خاص اپنی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہے تو اس کے مصارف کا تمام بار اسی پر ہو گا کیونکہ وہ اس کا حق ہے اور اس کی منفعت خاص اس کی جانب راجع ہے۔"(۲)

❺ آبپاشی کی نہریں اور کنوئیں پبلک کی مصالح عامہ اور معاشی وسائل کی ترقی کے لیے ہیں حکومت کے محاصل میں اضافہ کرنے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہیں اس لیے حکومت کی نہروں اور کنوؤں سے آبپاشی کرنے والوں سے یا تو قطعاً محصولِ آبپاشی نہ لیا جائے یا صرف اس قدر لیا جائے جس قدر ان نہروں اور کنوؤں کی بقاء کے لیے ضروری ہو باقی انتظامات کا کل خرچ بیت المال پر ڈالا جائے۔ مبسوط میں ہے:

"کیا تم کو یہ معلوم نہیں کہ امام پر یہ واجب ہے کہ بیت المال کے مال سے چھوٹے بڑے پل اور مہمان سرائیں تیار کرائے اسی طرح اس کے ذمے یہ بھی واجب ہے کہ اس بڑی نہر کا خرچ بھی بیت المال ہی پر ڈالے اور اسی طرح اس کے کناروں کی درستی و اصلاح کا بھی اگر اس کی خرابی کی وجہ سے غرق ہونے کا اندیشہ ہے۔"(۳)

---

(۱) سعیدیات: ۲/۳۰۴. ابو یوسف: کتاب الخراج، باب بیع الماء، الشرکۃ فی الماء ــــ امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: المبسوط، ۱۷۸/۲۳

(۲) سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: المبسوط، ج ۲۲ کتاب الشرب

(۳) حوالا بالا: ص ۱۷۵

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نہریں:

بہرحال اسلامی نظامِ اقتصادی میں ان اصولوں کے پیشِ نظر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں اس محکمہ پر خاص توجہ دی گئی، نہریں جاری کی گئیں، بند باندھے گئے، تالاب بنائے گئے۔ گولیں اور چھوٹی نہریں نکالی گئیں اور اس طرح زراعت کو بھی ترقی دی گئی اور پانی کی قلت کا حل بھی کیا گیا۔ (۱)

---

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مقصد کے لیے ایک بڑا محکمہ آبپاشی (Irrigation Department) قائم کیا اس محکمہ کی وسعت کا اندازہ لگائیے کہ صرف مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار کارندے (Employees) سال بھر اس کام میں لگے رہتے، جن کی تنخواہیں اور دیگر مصارف بیت المال سے دیئے جاتے تھے۔ (مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ: الخطط، ۱/٦)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر حضرت جزر بن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہواز، خوزستان کے اضلاع میں بہت سی نہریں تیار کرائیں، جن کی بدولت بہت سی بنجر اور دو افتادہ زمینیں آباد ہوگئیں اور امت کی معاشی خوشحالی کا ذریعہ بنیں۔ (شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ: الفاروق، ج ۲، عنوان: محکمہ آبپاشی)

نہر ابی موسیٰ۔ یہ نہر بصرہ کے لوگوں کے لیے دریائے دجلہ سے کاٹ کر بنائی گئی۔ اس کی لمبائی ۹ (نو) میل تھی یہ نہر حضرت حنیف بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی درخواست پر کھدائی گئی جو ایک وفد کے ساتھ اس غرض کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نہایت مؤثر تقریر میں یہ عوامی مطالبہ پیش کیا۔ چونکہ یہ نہر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر بصرہ نے حضرت امیرالمؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر کھدوائی۔ لہٰذا اس کا نام "نہر ابی موسیٰ" رکھا گیا۔

نہر معقل: یہ نہر بھی دجلہ سے کاٹ کر لائی گئی تھی۔ اس کی کھدائی کا سارا اہتمام حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھا، لہٰذا اس کا نام ہی "نہر معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ" پڑ گیا۔

نہر سعد: یہ کوفہ کے علاقہ انبار (جو آج کل بھی عراق کا ایک صوبہ ہے، اور عراق پر غیر ملکی غاصبین کے خلاف مزاحمتی تحریک کا مرکز ہے) کے باسیوں کی درخواست پر نکالی گئی۔ انبار کے عوام کے مطالبہ پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر کوفہ نے حضرت سعد بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس پر مامور فرمایا انہوں نے بڑے اہتمام سے شروع کر دیا، مگر کچھ دور جا کر درمیان میں ایک پہاڑ حائل ہو گیا، کام وقتی طور پر روکنا پڑا۔ حجاج بن یوسف نے اپنی گورنری کے زمانہ میں اس پہاڑ کو کاٹ کر بقیہ کام مکمل کرایا۔ چونکہ آغاز اور کام کا اکثر حصہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں ہوا، لہٰذا نہر کا نام نہر سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑ گیا۔

نہر امیرالمؤمنین: یہ نہر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر دریائے نیل کو بحیرہ قلزم (بحر احمر Red Sea) =

اسی سلسلہ میں بصرہ کی "نہر ابو موسیٰ"[1] جو دجلہ سے کاٹ کر بنائی گئی ہے اسی طرح نہر معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی دریائے دجلہ سے نکالی گئی اور کوفہ کے علاقہ

سے ملا کر بنائی گئی تھی۔ اس کی تعمیر کا قصہ بھی قادر مطلق کی قدرت میں اپنی نوعیت کا عجیب ہے۔ ۱۸ھ میں جزیرہ عرب قحط سالی کی لپیٹ میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیار و امصار سے غلہ منگوایا اور قحط زدہ لوگوں کو مدینہ منورہ بلا کر کھلاتے رہے، مگر قحط سالی سایہ فگن رہی۔ آپ نے مصر سے غلہ منگوانے کا ارادہ کیا، مگر درمیان میں سمندر پڑتا تھا، خشکی کا راستہ ہزاروں میلوں کا تھا۔ آپ نے گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ مصر کے معتبر حضرات کا ایک وفد لے کر مدینہ منورہ آئیں۔ ان کے آنے پر آپ نے ان کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر دریائے نیل کو سمندر سے جوڑ دیا جائے تو عرب دنیا میں قحط سالی کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے۔ آمدہ وفد نے بخوشی اس بات کو قبول کیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واپس جا کر فسطاط —— جو موجودہ قاہرہ سے دس بارہ میل کی دوری پر ہے —— دریائے نیل سے بحیرہ قلزم تک نہر کھدوا کر نیل کو قلزم سے ملا دیا۔ طرفہ تماشہ کہ یہ نہر ۶۹ میل لمبی تھی اور صرف چھ ماہ کے مختصر عرصہ میں تیار ہو گئی اب مصر سے اناج کے لدے پھندے ۲۰ جہاز جن میں ساٹھ ہزار اردب (ایک اردب ۲ من کے برابر) اناج بھرا ہوا تھا فسطاط سے بحیرہ قلزم (بحیرہ احمر) میں داخل ہوئے اور جدہ (یا ینبوع) لنگر انداز ہو کر چند دنوں میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ یہ نہر مدتوں جاری رہ کر مصر کی تجارتی ترقی میں شاہ رگ کا کردار ادا کرتی رہی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے بعد مصر کے حاکموں کی بے پروائی کی وجہ سے جا بجا اٹ گئی اور مقام ذنب التمساح (مگر مچھ کی دم) پر آکر بالکل رک گئی۔ مگر بعد میں عباسی حکمرانوں کے دور میں دوبارہ جاری ہو گئی اور ایک زمانہ تک جاری رہی۔ (ان نہروں کی تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ: حسن المحاضرۃ، ص ۹۳، ۹۴۔ علامہ مقریزی: الخطط والآثار، مطبع النیل (قاہرۃ)، ۱۳۲۴ھ، ۱/۱۷۱، ۱۳۹/۲ تا ۱۴۴ —— علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ: الفاروق: ج ۲، عنوان: پبلک ورک یا نظارات نافعہ، نہریں جو تیار کرائیں)

علامہ بلاذری رحمہ اللہ نے عراق میں ایسی ایک سو سے زائد نہروں کے نام گنوائے ہیں جو دریاؤں کو کاٹ کر کھودی گئی تھیں (بلاذری: فتوح البلدان، مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۳۲ء، ص ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۷۲، ۱۸۴، ۲۸۴، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۲، ۲۹۳، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۵۶ تا ۳۶۴ وغیرہا) جبکہ مورخ اصطخری رحمہ اللہ نے بصرہ کے آس پاس ۱۹ ایسی چھوٹی بڑی (جن میں غالباً چھوٹے نالے (Water Cources) بھی شامل ہوں گے) ایک لاکھ بیس ہزار (۱۲۰۰۰۰) نہروں کا ذکر کیا ہے جو ایک دوسری سے مربوط تھیں۔ (اصطخری، ابراہیم بن محمد رحمہ اللہ: مسالک الممالک، لیدن، ۱۸۷۰ء، ص ۸۰) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کو زمینوں کی آباد کاری اور زراعت کو ترقی دینے کا کس قدر خیال تھا۔ اور یہ صورت حال تو بنو امیہ کے دور تک کی ہے، اس کے بعد زراعت کی ترقی کے ذرائع کو مزید وسعت ملی ہوگی۔

(۱) بلاذری: فتوح البلدان، ص ۳۵۲، ۳۵۳، مقریزی: الخطط، ص ۷۱

انبار کی "نہر سعد" اور مصر کی "نہر امیرالمؤمنین" مشہور نہریں ہیں [۱] اور فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد نہر ثار، نہر دبیس، نہر اساورہ، نہر عمرو، نہر حرب وغیرہ کا ذکر تاریخی کتب میں آج تک موجود ہے جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ [۲]

زراعت اور ترقیٔ زراعت کی داستان بہت طویل ہے اور اس کے تمام شعبوں کی اصلاحات کا قانون، اسلامی تاریخ کا اہم جزء شمار ہوتا ہے یہاں صرف اختصار کے طور پر چند نمونے پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

———☆☆☆———

(۱) سیوطی، جلال الدین: حسن المحاضرة فی اخبار مصر والقاهرة، مطبوعه قاهرة، ص ۹۳، ۹٤

(۲) بلاذری: حواله بالا: ص ۳۵۳

باب ـــــ ⑧

زمین کے متعلق خصوصی احکام

زمین اور انفرادی ملکیت

زراعت سے متعلق احکام اور گذشتہ صفحات میں بیان شدہ اسلام کے معاشی نظام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ''زمین'' اور ''ذرائع پیداوار'' میں انفرادی ملکیت کو تصور کرتا ہے؟ بے شک یہ صحیح ہے، اور اس لیے صحیح ہے کہ اسلام کی نظر میں ''زمین'' یا ''ذرائع پیداوار'' کا انفرادی ملکیت ہونا دراصل معاشی نظام کے فساد کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں ''اعتدال و توازن کا فقدان'' راہِ فاسد کھولتا ہے۔

نیز اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کا انسداد انسان کے جائز انفرادی حقوق و فرائض پر ضرب کاری کے مترادف ہے اور قوائے عملی میں جمود و تعطل پیدا کرنے کا موجب ہے اس لیے اس قسم کا اقدام گویا فطرت کے ساتھ بغاوت ہے اس لیے وہ کہتا ہے کہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ قوانینِ فطرت (نوامیس الٰہیہ) (Divine Laws) کی مطابقت کے ساتھ ساتھ ایک جانب ''زمین'' اور ''وسائل پیداوار'' میں انفرادی ملکیت کو ایک حد تک جائز قرار دیا جائے اور دوسری جانب اجتماعی مفادات کے پیش نظر اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کر دیئے جائیں کہ جو انفرادی ملکیت میں اعتدال و توازنِ حقیقی برقرار رکھیں کیونکہ علم الاخلاق (Ethical Science) اور علم الاجتماع (Social Science) دونوں کا یہ نظریہ ہے کہ ''انفرادی حقوق و فرائض میں اعتدال ہی اجتماعی حقوق و فرائض کے لیے بہترین کفیل ہے۔''

اسی نظریہ کے ماتحت اسلام نے اپنے معاشی نظام میں "زمین کی انفرادی ملکیت" کو چند شرائط وقیود کے ساتھ ایک حد تک تسلیم کیا ہے جن میں سے بعض کا ذکر زراعت کی بحث میں آچکا ہے اور ان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کس طرح سرمایہ دارانہ مفاسد کا انسداد اور سد باب کر کے عام رفاہیت وخوش حالی کے سامان مہیا کرتا ہے۔

زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات

اس سلسلہ [1] میں پہلی بات جو جاذبِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے متعلق

---

(۱) شاید بہت سے دیگر قارئین کرام کی طرح آپ بھی حضرت مصنف رحمہ اللہ کا یہ عنوان: "زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات" عنوان پڑھ کر حیران ہوں، کیونکہ یہ نہ اسلام کے صالح معاشی نظام کے مزاج وفطرت سے ہم آہنگ ہے نہ اس کی عادلانہ سوچ سے موافق ہے جو زمیندارانہ نظام کی نہ مصالحت کرنے والی مخالف (Un-Compromising Opponent) ہے، نہ اس کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" کے مقصد ومنہاج کے مطابق ہے، نہ ہی حضرت مصنف رحمہ اللہ کے علو فکر کا ترجمان ہے۔ میرے خیال میں حضرت مصنف رحمہ اللہ کے عبقری ذہن میں عنوان "مزارعت سے متعلق اسلامی جوازات" تھا جیسا کہ انہوں نے مذکورہ عنوان "زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات" کے ذیل میں تمام بحث جواز مزارعت اور اس کے عدم جواز پر کی ہے۔ اور ایسا عنوان لکھ کر وہ نفسیاتی طور پر ایسے قاری کی توجہ بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اسلام میں مذموم اور استحصالی زمینداری کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

مزارعت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کسی دوسرے ضرورت مند شخص کو اس شرط پر دے کہ یہ شخص اسے کاشت اور برداشت (Harvest) کرے گا اور پیداوار پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق آدھوں آدھ یا تہائی یا چوتھائی کے حساب سے دونوں آپس میں تقسیم کرلیں گے۔ بیج اور پانی وغیرہ کے اخراجات کی شرائط بھی پہلے طے شدہ ہوں گی۔

اگر یہی معاملہ باغ یا پھل دار درختوں کا ہو تو اسے مساقات (Gardening) کہا جاتا ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے میں مزارعت کا معاملہ فاسد اور باطل ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ ایسا عقد اجارہ (Lease) ہے جس میں اجرۃ (Earning Or Wage) مجہول (Un- Known) اور غیر یقینی (Uncertain) ہوتا ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخابرہ ـــــ جو مزارعت ہی کی ایک شکل تھی ـــــ کی نہی (Prohibition) بھی ثابت ہے۔ البتہ حضرت امام رحمہ اللہ کے دونوں شاگرد ـــــ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور حضرت امام محمد رحمہ اللہ ـــــ مزارعت ومساقات کے جواز کے قائل ہیں۔ اور انہی کی رائے پر فقہاء احناف کا فتوی اور عمل ہے۔

=

انفرادی ملکیت کے جواز کو مان لینے کے باوجود اسلام کے معاشی نظام میں کیا زمینداری سسٹم (Land Lordism) کی موجودہ ظالمانہ روش کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ اسلام موجودہ زمینداری سسٹم کے ظالمانہ اور غلط طریقہ ہائے کار کو کیسے جائز قرار دے سکتا ہے جبکہ وہ مباح زمینداری (Permissible Landlordism) کو بھی غیر پسندیدہ سمجھتا ہے جو انصار اور مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان اجارہ اور مزارعۃ کی صورت میں رائج تھی۔

مزارعت اور زمینداری کے عدم جواز کی احادیث:

❶ عن رافع بن خديج رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أمر كان لنا نافعا، إذا كانت لأحدنا أرض أن يعطها ببعض خراجها أو بدراهم وقال: إذا كانت لأحدكم أرض فليمنحها أخاه أو ليزرعها.[1]

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] نے فرمایا: رسول اللہ

دیگر آئمہ کرام حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ بھی جواز مزارعت و مساقات کے حق میں ہیں۔

(۱) صحيح الامام البخاری ج ۲ ابواب الحرث والمزارعة، باب ما كان اصحاب النبی صلى الله عليه وسلم يواسی بعضهم بعضا فی الزراعة. نسائی: كتاب الايمان والنذور، باب من الشروط فيه المزارعة

(۲) حضرت رافع بن خدیج انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ولادت ہجرۃ نبوی سے ۱۲ سال قبل اور وفات ۷۴ھ میں ہوئی۔ مدینہ منورہ کے انصار باوفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے تھے۔ ان کا خاندان کاشتکار اور زمیندار تھا۔ لہٰذا زراعت، زمیندارہ اور کاشتکاری کے مسائل سے متعلق اکثر احادیث آپ سے مروی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ آپ کے پاس ایک چمڑا پر لکھی ہوئی تھیں۔ حضرت نافع بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک دن مروان خلیفہ اموی نے خطبہ دیا اور اس میں مکہ مکرمہ اور اس کی حرمت کا ذکر کیا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود تھے آواز دے کر فرمایا: اگر مکہ مکرمہ حرم ہے تو مدینہ منورہ کو بھی نبی کریم نے حرم ٹھہرایا ہے اور یہ ہمارے پاس خولانی چمڑا پر درج ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: الاصابة، پیراگراف نمبر ۲۵۲۶۔ مزی: تهذيب، ۳/۲۲۹. داكٹر حميد الله: الوثائق السياسية ص ۴۷، ۴۸

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے منع فرمادیا جو (بظاہر) ہمارے لیے نفع بخش تھا وہ یہ کہ ہم میں سے کسی شخص کے پاس زمین ہو تو وہ نہ اس کو بٹائی پر دے اور نہ نقد لگان پر اور فرمایا: اگر تم میں سے کسی کے پاس زمین ہو تو وہ خود کاشت کرے یا اپنے مسلمان بھائی کو کاشت کے لیے احسان کے طور پر مفت دے۔

❷ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كانت له أرض فليزرعها أو ليمنحها فإن أبىٰ فليمسك أرضه.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس زمین ہو اس کو چاہیے کہ وہ خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کے لیے مفت احسان کے طور پر دے دے اور اگر دونوں میں سے کوئی بات کرنے کو آمادہ نہیں تو اپنی زمین کو یونہی روکے رکھے۔

❸ عن جابر بن عبدالله رضي الله تعالىٰ عنهما قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يؤخذ للأرض أجر أو حظ.[2]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما[3] فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی

(۱) امام مسلم: صحيح كتاب البيوع، باب كراء الأرض۔ یہاں روایت حضرت جابر سے مروی ہے۔
صحيح الامام البخاري، ابواب الحرث والمزارعة، باب ما كان أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم يواسي بعضهم بعضا في الزراعة.

(۲) نسائي: السنن، ج ۲، كتاب الايمان والنذور، باب من الشروط فيه المزارعة

(۳) حضرت جابر بن عبد اللہ بن عمرو بن حرام انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۶ قبل از ہجرت مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث اور فقہ کا وافر حصہ پایا۔ آپ اپنے زمانہ میں مدینہ منورہ کے مفتی تھے۔ آپ نے مسائل و احکام پر ایک رسالہ "منسک صغیر فی الحج" تحریر فرمایا۔ آپ سے روایت حدیث

اللہ علیہ وسلم نے اسی بات سے منع فرمایا ہے کہ زمین کے ذریعہ سے عیوض کا یا اجارہ کا فائدہ اٹھایا جائے۔

۴ وكان إبن عمر رضى اللّٰه تعالٰى عنهما يكرى مزارعة على عهد النبى صلى اللّٰه عليه وسلم وأبى بكر و عمر و عثمان رضى اللّٰه تعالٰى عنهم وصدرا من أمارة معاوية رضى اللّٰه تعالٰى عنه، فلما سمع حديث رافع رضى اللّٰه تعالٰى عنه ترك ذلك خشية أن يكون النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قد أحدث فى ذلك شيئا لم يكن يعلمه فترك كراء الأرض.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی زمین کو عہد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابتداءِ امارت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کاشت کاروں کو لگان پر دیتے رہے مگر جب انہوں نے رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سنی تو اس عمل کو اس خوف سے ترک کر دیا کہ شاید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر مبارک میں یہ فیصلہ دیا ہو جسے انہوں نے نہ سنا ہو لہٰذا زمین کو بٹائی پر دینا ترک کر دیا۔

یہ روایت الفاظ کے معمولی ردوبدل کے ساتھ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے شہرت کے اونچے درجہ تک پہنچ گئی ہے اس روایت کے الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

کرنے والوں میں امام حسن بصری، سلیمان بن قیس، عامر الشعبی، عطا بن ابی رباح، قتادہ اور وہب بن منبہ رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے نامور فقہاء اور محدثین شامل ہیں۔ آپ نے ۷۸ھ میں وفات پائی اور مدینہ منورہ میں آپ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں آخری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ جنہوں نے وفات پائی۔ (محمد مصطفی اعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، ج۱، تذکرہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۱) صحیح بخاری، ابواب الحرث والمزارعة، باب مذکورہ بالا

وسلم، زمین کو نقد لگان یا بٹائی پر دینے کو جائز قرار دنہیں دیتے اور اس طرح زمینداری کے نفسِ جواز کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ زمین کی انفرادی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے یا خود کاشت کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں اور یا دوسرے بھائی کے ساتھ حسنِ سلوک کی۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہی ہے کہ زمین کو نہ نقد لگان پر دینا جائز ہے اور نہ بٹائی پر اور یہ کہ زمینداری کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

مزارعت کے جواز کی روایات:

دوسری روایات بھی ہیں جو الفاظ اور معانی کے اعتبار سے پہلی روایت ہی کے برابر شہرت کا درجہ رکھتی ہے۔ ان روایات میں صاحب زمین کو نقد لگان اور بٹائی دونوں پر دینے کی اجازت نکلتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے خلفاءِ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے زمانہ تک صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اور امت کے افراد کے عملی تواتر سے بھی یہی ثابت ہے کہ وہ زمین کو نقد لگان اور بٹائی پر دیتے رہتے ہیں۔

1. عن حنظلة بن قيس رضي الله تعالىٰ عنه قال: سألت رافع بن خديج رضي الله تعالىٰ عنه عن كراء الارض، فقال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عنه. فقلت: أبالذهب والورق؟ قال: فلا بأس له.[1]

ترجمہ: حنظلہ بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن

(۱) صحيح بخاری، ابواب الحرث والمزارعة، باب كراء الأرض بالذهب والفضة. نسائی: السنن، ج ۲، كتاب الايمان والنذور، باب الشروط فيه المزارعة

(۲) حنظلہ بن قیس الزرقی انصاری کبار تابعین میں سے ہیں۔ بعض محدثین نے انہیں صحابی قرار دیا ہے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ پایا اور ان دونوں بزرگوں سے روایت بھی کیا ہے۔ مدینہ منورہ میں ہی وفات پائی۔ (دیکھئے: مظاهر حق، تتمہ ربع الرابع، واسماء الرجال، تذکرہ حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زمین کو اجارہ پر لینے کی بابت دریافت کیا، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ تب میں نے کہا کہ چاندی اور سونے کے بدلے یعنی نقد لگان پر بھی منع ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

❷ عن إبن عمر رضی اللّٰه تعالٰی عنهما أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم أعطی خیبر الیهود علی أن یعملوها و یزرعوها ولهم شرط ما خرج منها.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو خیبر کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کریں اور جو پیداوار ہو وہ نصف بٹائی پر ہو۔

❸ عن سعد بن أبي وقاص رضی اللّٰه تعالٰی عنه أن المزارع فی زمن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کانوا یکرون مزارعهم الخ.[2]

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مالکانِ زمین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی زمینوں کو کرایہ پر دیا کرتے تھے۔

❹ عن أبي جعفر رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال: ما بالمدینة أهل بیت هجرة إلّا یزرعون علی الثلث والربع وزارع علی وسعد بن مالك، وعبداللّٰه بن مسعود رضی اللّٰه تعالٰی عنهم وعمر بن عبدالعزیز والقاسم وعروة وآل ابی بکر وآل علی وابن سیرین رحمهم اللّٰه تعالٰی (وقال عبدالرحمٰن بن الأسود رحمه

(۱) صحیح بخاری، ابواب الحرث والمزارعه، باب المزارعة مع الیهود

(۲) نسائی: کتاب الایمان والنذور، باب من الشروط فیه المزارعة

اللّٰہ تعالٰی: كنت أشارك عبدالرحمٰن بن يزيد رضى اللّٰه تعالٰى عنه فى الزرع. وعامل عمر رضى اللّٰه تعالٰى عنه على أن جاء عمر رضى اللّٰه تعالٰى عنه بالبذر من عنده فله الشطر، وإن جاؤ ابالبذر فلهم كذا.) [۱]

ترجمہ: ابو جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۲] فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ کی بٹائی پر زمین کی کاشت نہ کرتا ہو اور حضرت علی، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، آل ابوبکر، آل عمر، آل علی، اور ابن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ سب اپنی زمینیں اسی طرح کاشت پر دیا کرتے تھے۔

(حضرت عبدالرحمٰن بن اسود (تابعی رحمہ اللہ) کہتے ہیں: میں نے حضرت عبدالرحمٰن بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شرکت میں مزارعت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں سے اس شرط پر معاملہ (مزارعت) کیا کرتے تھے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیج (Seed) اپنے پاس سے دیں گے تو (پیداوار کا) نصف حصہ ان کا ہوگا اور اگر بیج وہ

---

(۱) صحیح بخاری، ابواب الحرث والمزارعة باب المزارعة بالشطر

(۲) ابو جعفر، اس کنیت کے دو بزرگ تابعی ہیں: ابو جعفر عمیر بن یزید الخطمی رحمہ اللہ اور ابو جعفر القاری المدنی المخزومی رحمہ اللہ۔ ابو جعفر یزید بن القعقاع انصاری المدنی رحمہ اللہ مولی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ محدث، فقیہ اور مہموز قرأت کے قاری تھے۔ ثقہ اور معتبر تھے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حدیث سنی اور آگے ان سے حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کی۔

دوسرے ابو جعفر عمیر بن یزید الخطمی رحمہ اللہ ہیں۔ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت سے سماعت حدیث کی اور ان سے امام شعبہ، امام حماد اور یحییٰ بن سعید رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔

(دیکھئے: الکمال فی اسماء الرجال ذیل مشکوۃ المصابیح، ترجمہ ابو جعفر رحمہ اللہ تعالیٰ)

(دوسرے فریق) لوگ دیں گے تو پیداوار اس کے مطابق ان کا (نصف یا تہائی یا چوتھائی) حصہ ہو گا۔)

۵ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جو بات سب سے بہتر ہم نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کو نصف تہائی یا چوتھائی بٹائی کے ہر طریق پر دینا جائز ہے یہی منقح (Verified) اور صحیح ہے اور میرے نزدیک زمین کا یہ معاملہ "مال مضاربۃ" کی طرح کا معاملہ ہے (یعنی جیسا کہ وہ باتفاق جائز ہے اسی طرح یہ بھی جائز ہے) اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بٹائی ان تمام صورتوں کو ناجائز فرماتے ہیں (اور صرف نقد لگان پر جائز سمجھتے ہیں)۔ (۱)

یہ تمام روایات حدیثی و فقہی (Juristic) اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ صاحبِ زمین اگر خود کاشت نہ کرے تو دوسرے کو نقد لگان یا بٹائی پر دے سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

متضاد روایات کی تطبیق:

دونوں قسم کی احادیث میں جو تضاد اور تخالف (Contrasty & Controversy) ہے جب تک وہ صاف نہ ہو جواز و عدم جواز کا فیصلہ ناممکن ہے۔ چنانچہ تین جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے اس تضاد کو دور کرنے کے لیے جو ارشاد فرمایا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

۱ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو عدمِ جواز کی روایت کے روای ہیں، فرماتے ہیں کہ زمین کو اجارہ پر دینے کی یہ ممانعت اس بات سے متعلق ہے کہ مزارعۃ (بٹائی) میں زمیندار اور کاشتکار کے درمیان زمین کے حصص (Parts) متعین ہوں کہ اس جانب کے حصہ کی پیداوار ہماری ہو گی اور اس دوسرے حصہ کی کاشت کار کی۔ کیونکہ یہ معاملہ مناقشہ (Controversy) کا باعث ہے، نہیں معلوم کہ زمین کے کس حصہ میں پیداوار ہو جائے اور کس حصہ میں بالکل نہ ہو۔ اور یہ بات اس سے

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی اجارۃ الارض البیضاء وذات النخیل

بھی متعلق ہے کہ صاحبِ زمین یہ شرط لگائے کہ نہر سے متصل حصہ زمین کی پیداوار میری ہوگی اس لیے کہ اس میں بھی کاشت کار کے حق میں سخت نقصان کا اندیشہ ہے اور معاملہ مجہول (Unknown) ہو جاتا ہے۔

عن رافع بن خديج رضى الله تعالىٰ عنه قال: حدثني عماي أنهم كانوا يكرون الأرض على عهد النبى صلى الله عليه وسلم بما ينبت على الأربعاء أو شي يستثنيه صاحب الأرض. فنهى النبى صلى الله عليه وسلم عن ذالك الخ.[1]

ترجمہ: رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم سے ہمارے چچا (حضرت زہیر بن رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فرمایا: وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے اور یہ شرط لگایا کرتے تھے کہ نہر کے قریب کے حصۂ زمین کی پیداوار ہماری ہوگی یا اس معین حصۂ زمین کی پیداوار ہماری رہے گی، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زمینداری کی ممانعت سے متعلق جو روایت بیان کی ہے وہ اسی قسم کے مناقشات کے پیشِ نظر ہے نہ کہ نفسِ مسئلہ کی ممانعت کی بناء پر۔

۲ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ معاملہ حرام یا ناجائز ہے بلکہ ازراہِ اخوت و مواساۃ باہمی (Brotherhood & Fratinity)، آپ کی رغبت یہ ہے کہ زمین سے متعلق اجارہ یا مزارعۃ کا معاملہ نہ ہو بلکہ مسلمان یا تو خود کاشت اور یا باہمی رفاقت

---

(۱) امام بخاری: صحیح، ج ۲، ابواب المزارعه والحرث، باب كراء الأرض بالذهب والفضة

و مروت کے پیشِ نظر دوسرے ضرورت مند بھائی کو کاشت کے لیے مفت دے دیں اور اس طرح حسنِ سلوک کریں۔ اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس کو نہی [۱] تنزیہ وارشاد (Prohibition for Purity & Guidance) سے تعبیر کیا ہے۔

❶ قال إبن عباس رضی اللہ عنھما: أن النبی صلی اللہ علیه وسلم لم ینه عنه، ولکن قال: أن یمنح أحدکم أخاہ خیر له من أن یأخذ شیئا معلوما. [۲]

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو جارہ پر دینے کو ممنوع نہیں قرار دیا بلکہ یہ پسند فرمایا کہ اپنے بھائی (کاشتکار) سے معاوضہ لینے کی بجائے مفت حسنِ سلوک کے طور پر دے دے۔

❷ أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لم یحرم المزارعة ولکن أمر أن یرفق بعضھم ببعض الخ. [۳]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعۃ کو حرام نہیں کیا مگر یہ ترغیب دی کہ باہم حسنِ سلوک اور رفق کا معاملہ کریں، لین دین کا معاملہ اس بارہ میں نہ کریں۔

❸ اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۴] فرماتے ہیں چونکہ آپ کے زمانہ میں زمین

---

(۱) ایسی نہی (روک) جس کا مقصد کسی معاملہ کو ازروئے شریعت صاف و شفاف بنانا ہو نہ کہ اس معاملہ کو حرام قرار دینا ہو۔ یوں کہیے کہ زراعت اور مزارعت کا معاملہ کے لیے نہی (روک) نہیں ہے بلکہ اس میں قدیم اور جدید بعض ناجائز شرائط و رسوم کی موجودگی میں اس کے لیے نہی ہے۔ جب یہ ناجائز شرائط اور استحصالی حربے ختم کر دیئے جائیں "نہی" نہ رہی گی، ایسی نہی کو "نہی تنزیہ" (پاکیزگی کے لیے نہی) کہتے ہیں۔

(۲) بخاری، ابواب المزارعة والحرث

(۳) ابن ماجه: السنن، باب الرخصة فی المزارعة بالثلث والربع. صحیح مسلم، سنن ابی داود اور جامع ترمذی میں دیکھئے کتاب المزارعة

(۴) حضرت زید بن ثابت انصاری (م ۴۵ھ) فقیہ، محدث، علم الفرائض کے عالم اور قاری تھے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں یہود کی زبان صرف پندرہ دن میں سیکھ لی۔ آپ نے علم الفرائض =

سے متعلق بہت سے مناقشے اور قضیے پیش ہوتے اور اس معاملہ میں کثرت سے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص وقت تک کے لیے مصلحۃً ممانعت فرمادی ورنہ بذاتہ اس کو حرام نہیں کیا۔

أو علی مصلحة خاصة بذلك الوقت من جهة كثيرة مناقشتهم فی هذه المعاملة حينئذ وهو قول زيد رضی اللّٰه تعالٰی عنه الخ.[1]

ترجمہ: یا یہ ممانعت اسی وقت کے لیے خاص تھی اور اس لیے تھی کہ اس معاملہ میں اس زمانہ میں کثرت سے مناقشات پیش آتے رہتے تھے اور یہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔

حضرت رافع، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ توجیہات اگرچہ اس باب میں متفق ہیں کہ زمین کو اجارہ اور مزارعہ پر دینا اصل معاملہ کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے لے کر خیر القرون کے پورے دور کا "متواتر تعامل" (Continuous Practice) بھی اس عدمِ ممانعت کا مؤید ہے تاہم حدیثِ ممانعت نے اس سلسلہ میں فقہاء اسلام پر جو اثر ڈالا وہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ ہے

(وراثت کی تقسیم کے مسائل) پر سب سے پہلی کتاب تحریر کی۔ امام زہری رحمہ اللہ کہا کرتے تھے: اگر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "علم الفرائض" پر کتاب نہ لکھی ہوتی تو شاید یہ علم لوگوں سے غائب ہو جاتا۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر آپ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد پر قرآن مجید کی تدوین کی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں اسے مصحف شریف کی صورت میں نقل کیا۔ دراصل یہ آپ پر پوری امت کا اعتماد تھا اور یہ اسی اعتماد کا ثمرہ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ پر فرمایا اور آپ کو کاتب وحی مقرر کیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علامه ذهبی: تذكرة الحفاظ. ابن سعد: طبقات، ۱۱۵/۲، محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحديث النبوی و تاريخ تدوينه، تذكره زيد بن ثابت رضی اللّٰه تعالٰی عنه)

(۱) بحواله شاه ولی اللّٰه رحمه اللّٰه تعالٰی: حجة اللّٰه البالغه، ج ۲، باب البر والتقوی، ص ۱۱۷

کہ افراد امت کے درمیان زمین کا اجارہ اور اس کی مزارعۃ دونوں ناجائز ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نقد لگان (اجارہ پر دینا درست ہے اور مزارعۃ و بٹائی) نادرست اور طاؤس رحمہ اللہ [۱] اور ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بٹائی (مزارعۃ) پر زمین کا دینا جائز ہے اور نقد لگان (اجارہ) پر نادرست اور جمہور علماءِ امت فرماتے ہیں کہ زمین کو نقد لگان اور بٹائی دونوں صورتوں میں اجارہ پر دینا جائز ہے اور یہی سلف و خلف (Forerunners and their Successors) کا تعامل رہا ہے گویا اس مسئلہ میں جس قدر بھی عقلی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی کسی نہ کسی فقیہہ کا مختار (Option) ہیں اور اس پر مستزادیہ ہے کہ نقد لگان کے جواز سے متعلق جو روایت کتبِ احادیث میں مذکور ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں وہ جملہ کہ جس سے صراحۃً نقد لگان پر زمین کا دینا ثابت ہوتا ہے "مدرج" (Included by Someone other than the Original Narrator) ہے اور سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے۔ [۲]

اسی طرح زمین کو بٹائی پر دینے کے جواز میں جو فقہاء، یہود خیبر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان "مخابرہ" معاملہ خیبر کو وجۂ استدلال (Base of Argumentation) قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کے متعلق یہ جواب دیتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ "یہود" خیبر کی زمینوں کے مالک تسلیم کیے گئے اور اس لیے مخابرہ (مزارعۃ) کا یہ معاملہ دراصل حکومت اور ذمی رعایا کا معاملہ تھا اور یہ خراج مقاسمہ (بٹائی کے ذریعہ خراج) کہلاتا ہے اور معاملہ زیر بحث افرادِ امت کے درمیان زمینداری و کاشت کاری سے متعلق ہے اور اس کے لیے حدیث میں صریح ممانعت ہے۔

---

(۱) طاؤس بن کیسان رحمہ اللہ کا تعارف باب ۱۱ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ: فتح الباری و شرح صحیح بخاری، مطبوعہ مصر، ج ۵، باب المزارعۃ

خلاصہ: اسلام کے اقتصادی نظام میں جاگیردارانہ نظام کی گنجائش نہیں:

❶ ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانۂ نبوت سے زمانۂ خلافتِ راشدہ تک زمین کو نقد لگان یا بٹائی پر دینا اگرچہ معمول بہ رہا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوضاحت اس کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ زمینداری کے اس معمولی اور سادہ طریق کو بھی ناپسند فرماتے اور اخلاق مروت سے نازل (گری ہوئی) سمجھتے ہیں یا ایسے حالات میں کہ اس سلسلہ میں باہمی مناقشات کی کثرت افرادِ امت کے درمیان بغض و عداوت اور جنگ و جدل کی صورت پیدا کر دے، امام کو اس کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں کہ وہ اس سسٹم کو مصلحۃً ایک مدت کے لیے ممنوع قرار دے دے۔[1]

❷ پس اسلام کے اقتصادی نظام میں زیادہ سے زیادہ ایسی زمینداری کے جواز کی شکل تو پائی جاتی ہے جس میں "زمیندار اور کاشت کار" معاملہ زمینداری میں دو شریک کار کی حیثیت سے شمار ہوتے ہوں مگر دنیا کے دورِ قدیم اور دورِ جدید کا یہ جاگیردارانہ سسٹم جس میں زمینداری تعلقہ داری، جاگیرداری، اسٹیٹس اور ریاستوں (Empires) کی شکل میں نظر آتی یا بڑے بڑے زمیندار کاشت کاروں کی جان و مال تک پر متصرف نظر آتے ہیں، اسلامی معاشی نظام سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا اور اسلام کا اقتصادی قانون اس سسٹم کو قطعاً حرام اور ناجائز قرار دیتا ہے۔

❸ علاوہ ازیں اسلام کے نظامِ حکومت سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی نظام میں اسلام کا نمایاں امتیاز یہ رہا ہے کہ زمین کے متعلق اقطاع (جاگیر) اور عطیہ (مربعہ جات) کے ثبوت کے باوجود مملکتِ مفتوحہ کی زمینوں کا بہت بڑا حصہ حکومت کے ہاتھ میں تھا پبلک کے ہاتھ میں نہیں تھا چنانچہ اس زمانہ میں انصار اور مہاجرین رضی

---

(۱) اگر خلیفۂ اسلام مصلحتِ عامہ یا اسلامی مصلحت کے پیشِ نظر خود کاشت مملوکہ زمینوں کو مستثنیٰ کر کے زمینداری سسٹم کو ممنوع قرار دینا چاہے تو خرید کردہ زمینوں کے متعلق ازبس ضروری ہے کہ مالکِ زمین کو زمین کی واجبی قیمت بیت المال سے ادا کرے۔

اللہ تعالیٰ عنہم کے صاحبِ املاک و جائیداد ہونے کے صرف یہ معنی تھے کہ بعض صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عطیہ "جاگیر" کے طور پر کچھ زمین دے دی تھی جو ان کی سادہ گذر کے لیے کام دے یا انہوں نے محنت کر کے بنجر زمینوں کو پیداوار کے قابل بنا لیا تھا جو پیمائش کے اعتبار سے آج کی طرح بڑے بڑے گاؤں نہ تھے بلکہ مزروعہ زمینیں تھیں۔ انہی کو بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم دوسروں کو اجارہ پر دیتے تھے اور بعض خود کاشت کیا کرتے تھے اور ان ہی کے درمیان خرید و فروخت کا سلسلہ جاری تھا باقی ممالک مفتوحہ کی تمام تر آراضی حکومت کی جانب سے اصل باشندوں کے قبضہ میں رہیں اور ان کی مالگذاری شخصی ملکیت کی بجائے بیت المال کا مال قرار پایا۔

۴ یہ شکل کہ دیہات کے دیہات اور رقبے کے رقبے اشخاص و افراد کے قبضہ میں اس طرح ہوں کہ ان کے ساتھ کاشتکاروں اور انسانی ہستیوں کی بھی ایک طرح کی بیع و شری ہوتی ہو اور وہ غلاموں اور محکوموں کی طرح زمینداروں کے اغراض کا آلۂ کار بنتے ہوں تو اس قسم کی جائیدادوں اور زمینداریوں کا اسلامی نظامِ حکومت میں کہیں شائبہ بھی نظر نہیں آتا، بلکہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رومیوں کے اس طرزِ زمینداری کو ظالمانہ کہہ کر بالکل ختم کر دیا تھا۔ اور ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دے دیا تھا، بلکہ دورِ فاروقی میں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ جو ممالک ایران، روم، مصر، شام، عراق فتح کیے گئے ان میں ایرانی بادشاہ کی مختصر ذاتی املاک کے علاوہ جو مسلمانوں کو جاگیر میں دے دی گئیں۔ عام کاشت کاری ان ہی لوگوں کی رہی جو سابق میں اس کے مالک تھے اور خراج کے نام سے غیر مسلموں کی زمینوں سے اور عشر کے نام سے مسلمانوں کی مملوکہ زمینوں سے "حکومت" لگان و مالگذاری وصول کرتی رہی اور ان کا حقِ زمینداری حکومت کے علاوہ افراد و اشخاص کو نہیں بخشا گیا۔

عراق و شام کی مفتوحہ آراضی سرکاری ملکیت رہیں:

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں عراق اور شام فتح ہوا تو صحابہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مطالبہ کیا کہ ان ملکوں کے زمینوں کو ہم پر تقسیم کر کے ہمیں ان کا مالک بنادیا جائے۔ حضرت بلال اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خصوصیت کے ساتھ اس پر اصرار تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ اگر ان زمینوں کا تم مجاہدین کو زمیندار بنا دیا جائے تو سرحدوں کے انتظامات شہروں اور ملکوں کے انتظامات، لشکروں کی ضروریات، بعد میں آنے والے مسلمانوں کی حاجات اور دیگر غرباء کی ضروریات کے لیے اس قدر کثیر آمدنی کہاں سے آئے گی لہذا یہ ہرگز نہ ہوگا بلکہ یہ سب حکومت کے ہاتھ میں ہی رہیں گی اور ان کی آمدنی تمام مسلمانوں کی ضروریات اور مذکورہ بالا حاجات کے لیے وقف ہوگی۔

استصواب رائے عامہ:

اراضی کے متعلق یہ ایک خاص قسم کا معاملہ تھا اس لیے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ اس بارہ میں اختلاف ہے تو اول جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مجلسِ مشاورت منعقد کر کے اس مسئلہ کو ان کے سامنے پیش کیا اور بعد میں استصواب رائے عامہ کے لیے مجلسِ عام منعقد کی اور فرمایا:

فإني واحد كأحدكم. وأنتم اليوم تقرّون بالحق. خالفني من خالفني ووافقني من وافقني وليست أريد أن تتبعوا الذى هو هوأى. معكم من الله كتاب ينطق بالحق. فو الله لئن كنت نطقت بأمر أُريده ما أردتُ به إلا الحق.[1]

ترجمہ: میں تمہاری ہی طرح ایک فرد ہوں اور تم کو آج حق کا فیصلہ کرنا ہے بعض میری رائے کے مخالف ہیں اور بعض موافق اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کی پیروی کرو، تمہارے پاس خدا کی دی ہوئی سچی کتاب ہے جو حق کو واضح کرتی ہے۔ بخدا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس میں بجز حق کے ارادہ کے میرا کوئی دوسرا ارادہ ہرگز نہیں ہے۔

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الفیٔ والخراج ص ۶۹

اس کے بعد مسطورہ بالا تقریر فرمائی اور اپنے دعوی کو قرآنی دلائل سے مدلل کیا۔ ان دلائل کو سن کر سب نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا۔

فقالوا جميعا: الرای رایك. فنعم ما قلت وما رأيت. (۱)

ترجمہ: ان سب نے کہا رائے وہی صحیح ہے جو آپ فرماتے ہیں۔ جو آپ نے فرمایا اور مناسب سمجھا ہے وہی بہتر اور خوب ہے۔

اس طویل واقعہ کو نقل کر کے امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ انہوں نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان اراضی کو تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی رائے کی موافقت میں قرآن عزیز کے دلائل پیش کیے یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق کا نتیجہ تھا۔ اور دراصل اس ہی میں تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ اور خراج کا جمع ہونا اور اس کا مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہونا جماعتی مفاد کے اعتبار سے تقسیم آراضی کے مقابلہ میں بدرجہا مفید تھا۔" (۲)

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جس قدر ممالک بھی فتح کیے گئے، ان کی اراضی کا معاملہ بیشتر حکومت ہی کے ہاتھ میں رہا اور کاشتکاروں سے حاصل شدہ لگان (خراج) حکومت کے ذریعے بیان کردہ ضروریات پر صرف ہوتا رہا اور باوجود مجاہدین و فاتحین کے اصرار کے ان کا کوئی حصہ بطورِ جائیداد کے فاتحین کو نہیں دیا گیا۔

اور ایک زمانہ تو ایسا گذرا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام مسلمانوں کو زمینداری اور کاشتکاری دونوں سے یک قلم روک دیا اور فرمایا کہ جب کہ مسلمانوں، ان کے اہل و عیال اور ان کے غلاموں تک کا وظیفہ بیت المال سے دیا جا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب حکومت (خلافت) کے کارآمد

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا

پرزے نہ ہیں اور جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ کے رضا کار (Volunteers) ہونے کی بجائے بیلوں کی دم سے لگے پھریں۔ چنانچہ "نظام العالم والامم" میں "طنطاوی" میں تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے فرماتے ہیں:

"جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں مال بہت بڑھ گیا اور لوگوں کے روزینے مقرر ہو گئے اور رجسٹر مرتب ہو گئے تو عاملوں اور قاضیوں کے مشاہرے بھی مقرر کر دیئے گئے اور پونجی جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی، زمینداری کو ممنوع کر دیا گیا اور زراعت اور مزارعۃ دونوں ہی کی ممانعت کر دی گئی اس لیے کہ ان کے اور ان کے اہل و عیال اور ان کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں تک کے وظائف بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ہر وقت ایک لشکری (Soldier) کی حیثیت سے کوچ کے منتظر رہیں اور ان کو نہ کھیتی کا انتظار روک سکے اور نہ خوش عیشی اور عیش کوشی اس سے باز رکھ سکے۔ اور یہ حکم یہاں تک آگے بڑھا کہ اگر ملک کا کوئی قدیم ذمی باشندہ بھی مسلمان ہو جاتا تو اس کی تمام جائیداد و املاک اس کی بستی کے ذمیوں میں تقسیم کر دی جاتی اور وہی ان املاک کا خراج ادا کرتے اور صرف اس کا مال اور حیوان اس کے سپرد کر دیئے جاتے تھے اور خلافت کی جانب سے اس کا وظیفہ (ماہانہ) بیت المال سے مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور اس حکم کو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے بھی اپنی خلافت کے دور میں جاری کیا کیونکہ وہ ہر معاملہ میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیروی کے عادی تھے۔"(۱)

عن عبداللہ بن هبیرہ رحمه اللہ تعالٰی قال: ان عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالٰی عنه أمر منادیا أن یخرج إلی امراء الأجناد یقدمون الی الرعیة أن عطاؤهم قائم وأن الرزق عیالهم سائل

---

(۱) علامه طنطاوی رحمه اللہ تعالٰی: نظام العالم والامم، مطبع رحمانیه، قاهرة، ۲/۱۸۳، ص ۱۸٤

فلا یزرعون.[1]

ترجمہ: عبد اللہ بن ہبیرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر میں تمام اسلامی لشکر کے سرداروں میں یہ منادی کرادی کہ تمام مسلمانوں کے وظائف مقرر ہیں اور ان کی اولاد کے بھی لہذا کوئی مسلمان نہ کاشت کاری کرے اور نہ زمینداری۔

شریک بن سمی غطفی رحمہ اللہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ عذر کر کے کہ وظیفہ میری معاش کی پوری کفالت نہیں کرتا بغیر اجازت کاشتکاری شروع کر دی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی اطلاع کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دربارِ خلافت میں بلا بھیجا اور فرمایا: میں تجھ کو ایسی سزا دوں گا کہ آئندہ کے لیے یاد رہے گا۔ شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں تائب ہوتا ہوں، آپ معاف فرما دیجئے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معافی دی۔[2]

---

(۱) علامہ سیوطی، جلال الدین: حسن المحاضرۃ، ص ۷

(۲) حوالہ بالا: ص ۹۳ اسی طرح یزید بن ابی حبیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ملی کہ حضرت عبد اللہ بن حر عنسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام میں کھیتی باڑی شروع کر دی ہے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے وہ زمین لے کر دوسروں کو دے دی اور فرمایا: جو ذلت اور خواری ان بڑے لوگوں (زمینداروں) کی گردن میں پڑی ہوئی تھی تم نے جا کر اپنی گردن میں ڈال لی۔ (ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ: اصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۸۸/۳، ترجمہ عبد اللہ بن حر عنسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس دور اندیشانہ فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غیر قوموں کے ساتھ انصاف کرنے میں اپنی قوم کی حق تلفی کی کہ ان کو زراعت اور فلاحت (کاشتکاری) سے روک دیا۔ درحقیقت اس سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بڑی انجام بینی کا ثبوت ملتا ہے۔ عرب کے اصلی جوہر دلیری، بہادری، جفاکشی، ہمت و عزم اس وقت تک قائم رہے جب تک وہ کاشتکاری اور زمینداری سے الگ رہے، جس دن انہوں نے زمین (کاشتکاری وغیرہ) کو ہاتھ لگایا اسی دن یہ تمام اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے۔ (شبلی: الفاروق، حصہ دوم، عنوان: قانون مالگذاری میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اصلاحات)

مباحث کا خلاصہ:

الحاصل، اسلام میں "زمینداری" کے ناپسندیدہ ہونے اور بیشتر حصہ زمین کے حکومت (خلافت) کے قبضہ میں رہنے کے باوجود سلف و خلف (Forerunners & Successors) کے تعامل اور علماءِ امت کے اجماع کے پیشِ نظر یہ مسلم ہے کہ مالکِ زمین اپنی زمین کو کرایہ پر دے سکتا ہے اور "زمیندار" کی اصطلاح بھی اس پر صادق آسکتی ہے مگر یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کے اس حکم جواز میں زمیندار کا وہ تصور جو آج ظالمانہ نظام میں پایا جاتا ہے مطلق نہیں ہے اور نہ اس میں موجودہ تعلقہ داری اور اسٹیٹ کی کوئی گنجائش ہے جو کہ "اکتناز" کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ اس لیے کہ علاوہ ان تمام مظالم و مفاسد کے جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے ان دونوں کی بنیاد تقسیمِ دولت (وراثت کی بجائے جمع دولت اور مخالف تقسیمِ وراثت) پر قائم ہے۔

بلکہ وہاں لگان پر زمین دے کر زمیندار کہلانے کے صرف اس قدر معنی تھے کہ سادہ اور ضروری معاش کو حاصل کرنے کے زیادہ بہتر اور عمدہ طریقہائے کار کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ بعض اصحاب زمین خود کاشت کرنے کی بجائے اپنی زمین کو لگان یا بٹائی پر اس طرح اٹھا دیتے تھے جس طرح تجارت میں "مضاربت" کا معاملہ کیا جاتا تھا اور بس۔ وہاں آقائی اور غلامی تھی نہ حاکمی و محکومی اور نہ یہ حالت تھی کہ زمیندار صرف زمین کے لگان سے عیش و راحت کی اونچی کرسی پر صدر نشین ہو اور زمین میں محنت کرنے والا کاشت کار معمولی معاش کے لیے بھی تباہ حال رہے۔

اسی قسم کی زمینداری اور کاشت کاری کا معاملہ اسلام کے دورِ اول میں مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان بھی رہا ہے جب کہ بیشتر مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کاشت کار اور انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم صاحبِ زمین و املاک تھے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں (ذمیوں) کے مابین بھی رہا ہے۔ اور کسی ایک معاملہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہاں زمیندار اور کاشت کار کے یہ معنی تھے جو آج کے

ظالمانہ دور میں پائے جاتے ہیں۔

اور جس طرح اسلام ”تعلقہ داری“ (Ermpire) اور ”جاگیر داری“ کے موجودہ جابرانہ سسٹم کو جائز نہیں رکھتا اسی طرح کاشتکار کو بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ صاحبِ زمین کی زمین میں اشتراکِ عمل کے بعد زبردستی قابض ہو جائے اور اس کو اپنی ذاتی ملکیت کی طرح سمجھنے لگے، اس لیے کہ اس قسم کی تمام شرکتوں میں اصل مال صاحبِ مال ہی کا ہے اور صاحبِ محنت کی شرکت منافع میں ہے نہ کہ اصل شے میں۔ چنانچہ ایسے شخص کے بارے میں جو کسی کی مملوکہ شے پر زبردستی قبضہ کر لے اور عدالت میں جا کر حاکم سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لے، سخت وعید آئی ہے:

عن أم سلمة رضی الله تعالٰی عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنّما أنا بشر وأنكّم تختصمون إلیّ، ولعل بعضكم أن يكون الحسن بحجته من بعض، فأقضى له على نحو ما أسمع فمن قضيت له بحق أخيه شيئا فلا يأخذه، فأنا أقطع قطعة من النار.[1]

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا[2] روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے لاتے ہو اور ایسا ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے کے

---

(۱) صحیح امام بخاری رحمه الله تعالٰی: كتاب الحيل، باب ١٠. صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب الحكم لا يغير الباطن

(۲) ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المؤمنین ام سلمہ ہند بنت حذیفہ ابی امیہ بن مغیرہ قرشیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے اور مسلمانوں کی ماں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد کا شرف پانے سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد ابو سلمہ عبد اللہ ابن عبد الرحمٰن بن ہلال رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں۔ ان کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف پایا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حبشہ اور مدینہ منورہ دونوں طرف ہجرت کی۔ آپ نے ۵۹ یا ۶۲ یا ۶۹ میں وفات پائی۔ اسد الغابة: ٧/ ٣٤٠، ٣٤٣. ابن قتيبه: المعارف، ص ١٣٦. ابن كثير: الفصول في اختصار سيرة الرسول صلى الله عليه وسلم، مطبوعه دار القلم، دمشق. بيروت، ص ٢١٩، ٢٢٠

مقابلہ میں کوئی اپنے معاملہ کی دلیل کسی زیادہ خوبی اور چرب زبانی سے
بیان کرے اور میں اس کی دلیل سن کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔
پس جس شخص کے لیے میں اس کے فریق بھائی کا حق دلاؤں وہ ہرگز اس
کو نہ لے، اس لیے کہ میں اس کو آگ (جہنم) کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔

البتہ حکومت کی ملکیت کے علاوہ خرید کردہ اراضی کے مالکوں کی اکثریت کی وجہ سے اگر پیداوار کی زمینوں پر قبضہ ہو چکا ہو اور بعض غریب کاشتکار زمین کے لیے محتاج ہوں تو اس حالت میں امام (خلیفہ) اور حکومت دو طریقے اختیار کرنے کے مجاز ہوں گے:

❶ غیر مملوکہ (Un - Occupied) افتادہ اور غیر مزروعہ (Waste & Uncultivated) زمینیں کاشتکاروں میں مفت تقسیم کر دیں۔

❷ جاگیرداروں کے پاس اگر ایسی زمینیں موجود ہوں جو زراعت کے کام نہ آرہی ہوں (Unarable) وہ ان کے قبضہ سے نکال کر کاشت کاروں میں تقسیم کر دے اور ان پر سرکاری (لگان) مقرر کر دے۔

باب — ⑨

تجارت، صنعت و حرفت

(الف) تجارت

وسائلِ معیشت میں سے دوسرا اہم وسیلہ "تجارت" ہے اس لیے اس کے ذرائع کی توسیع بھی اقتصادی نظام کا جزوِ اعظم ہے اور حکومت کے فرائض میں داخل۔ چنانچہ فقہائے امت فرماتے ہیں:

فالبيع والشراء من أكبر الوسائل المباعثة على العمل فى هذه الحيوة الدنيا وأجلّ اسباب الحضارة والعمران.[1]

ترجمہ: تجارت اس دنیا میں معاشی اعمال میں سب سے بڑا وسیلۂ معاشی ہے اور تمدن و حضارت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ہے۔

لہٰذا اسلام نے بھی اپنے معاشی نظام میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے ① صحیح (Valid) اصولِ تجارت ② فاسد (Invalid) اصولِ تجارت۔ پہلے حصہ کے بارہ میں وہ افرادِ ملک و ملت کو ترغیب بھی دیتا ہے اور ان اصول کے ماتحت ذرائع اور وسائلِ تجارت کی توسیع کے لیے آئین و قوانین بھی ذکر کرتا ہے اور دوسرے حصہ کی مذمت بھی کرتا ہے اور ان کے انسداد کے لیے احکام بھی بیان کرتا ہے۔

---

(۱) الجزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقه على المذاهب الاربعة، قسم المعاملات، ۲۰۲/۳

تجارت کی ترغیب

تجارت کی معاشی اہمیت:

اقتصادی نظام کی ترقی و برتری کا راز سب سے زیادہ تجارت میں مضمر ہے جو قوم یا ملت جس قدر اس سے دلچسپی لیتی ہے وہ اسی قدر اپنی اقتصادی بہبود کی زیادہ کفیل بنتی ہے اور جس قوم یا جس ملک کے باشندے تجارت سے دلچسپی نہیں رکھتے وہ اقتصادی نظام میں ہمیشہ دوسروں کے دستِ نگر رہتے ہیں اور اسی راہ سے دوسری اقوام ان کے تمدن، تہذیب معیشت اور سیاست بلکہ "مذہب" پر قابض ہو جاتی اور ان کو غلام بنا کر مطلق العنانہ حکومت (Absolute Dictatorship) کرتی ہے۔

ہندوستان جیسا بڑا ملک اور ایشیا و یورپ کے دوسرے چھوٹے بڑے ملک آج غیروں کے استبداد اور مظالم کے شکا اسی راہ سے ہوئے ہیں۔ انگریزوں کے ہاتھ میں ہندوستان تجارت ہی کی راہ سے آیا۔ مصر پر اسی اجارہ داری کے نام سے قبضہ کیا گیا ایران کی سابقہ غلامی تیل کی تجارت ہی کی رہین منت تھی اور آج بھی اسی راہ سے اس پر پنجہ استبداد (Clutch of Dispotism) گاڑا جا رہا ہے عراق و شام پر قبضہ کی تہہ میں یہی اصول کار فرما ہے موصل میں چشمے اور دمشق میں کانیں ظاہر ہونے سے پہلے "ماہرین دریافت" کی سیاحانہ (Exursionistic / Touristic) تگ و دو کا نتیجہ آخر وہی ہوا جو معاشی دستبرد کی صورت میں ظالم طاقتوں کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔

جرمنی اسی تجارت کے فروغ اور اپنی قوم کی اقتصادی و معاشی ترقی کی خاطر نو آبادیات کا بھوکا ہے اور آہستہ آہستہ ان کو ہضم کرتا جاتا ہے۔ اٹلی نے حبشہ کو اسی کی خاطر تباہ و برباد کیا اور ہسپانیہ کی تباہی و بربادی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ مشرق بعید میں جاپان کے چین پر بے پناہ مظالم اسی داستان کا ایک ورق ہیں اور فلسطین میں برطانیہ کے سفاکانہ مظالم کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

غرض شرق و غرب اور ایشیا و یورپ کی موجودہ جنگ دپیکار اور ہوسِ ملک گیری

غیر مہذب ممالک کو مہذب بنانے کے لیے وجود پذیر نہیں ہوئی بلکہ تجارتی منڈیوں کے اضافہ اور اپنے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لیے مظلوموں پر معاشی دستبرد کی خاطر عمل میں لائی جارہی ہے جس قوم میں تجارت نہیں ہے وہ آج نہیں تو کل ضرور غلام بن کر رہے گی، اور جو ملک تجارت کی برکتوں سے محروم ہے وہ صبح نہیں تو شام تک ضرور قعر ہلاکت میں گر کر تباہ ہو جائے گی۔ (۱)

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے طاقت ور تجارتی ممالک کا معاشی طور پر کمزور ممالک پر جبر و استبداد کا یہ نقشہ تقریباً ۷۰، ۸۰ سال پہلے کھینچا تھا، مگر آج دنیا کے معاشی و سیاسی حالات پر نگاہ ڈالیں تو صورتِ حال کچھ زیادہ مختلف نہیں صرف ظالم اور مظلوم کے چند نام ہی بدلے ہیں۔ برطانیہ، فرانس تو کوئی تعجب کی بات نہیں، انہوں نے امریکہ کو اپنا رہبر و رہنما مان کر ظلم کے سارے دھندے اس کی ہدایت اور منظوری سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پھر جو ظالمانہ کارروائی وہ نہ کر سکیں یا امریکہ ان سے کرانا چاہے وہ خود ظلم کے تمام سابقہ ریکارڈز کو مات دے کر ظلم و جبر کی ایک نئی تاریخ رقم کرتا ہے۔ وہ تجارت اور ظلم دونوں کا عالمی چمپئن ہے۔ جرمنی، اٹلی، جاپان کا دیو استبداد اگر آج پوری طرح پائے کوب نہیں ہے تو برصغیر میں ہندوستان نے اپنی پوزیشن بدل لی ہے وہ مظلوم کی بجائے ظالم بن کر کشمیری مسلمانوں پر اپنا آہنی پنجہ گاڑے ہوئے ہے اور تجارتی طور پر ترقی کر کے دنیا کی ایک دوسری سوپر طاقت (Super Power) بننے کے خواب دیکھ رہا ہے مشرق بعید (Far East) میں چین نے تجارت میں اپنا لوہا منوا کر جاپان کو مات دے دی ہے۔ حبشہ اٹلی سے گو آزاد ہے، ہسپانیہ (Spain) آزاد اور تجارتی ترقی یافتہ ملک بن گیا ہے مگر ایک مظلوم قوم ـــــ جو مسلمان نام سے جانی جاتی ہے اس ـــــ نے اپنی جگہ کسی دوسرے کے لیے خالی نہیں کی، حیرت ہے مدتوں سے مسلسل ظلم برداشت کر رہے ہیں مگر اپنی حالت بدلنے کو تیار نہیں۔ متواتر امریکہ اور اس کے حواریوں کے استحصال کا شکار مگر ٹلنے کو تیار نہیں، نقصان پہ نقصان اٹھا رہے ہیں، مگر ظالموں سے وفاداری کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں، لگتا ہے ظالم سے سمجھوتہ اور ظلم سے نبھا کا ارادہ کر کے بیٹھے ہیں۔

اگر مصنف رحمہ اللہ کے تحریر کے وقت (یعنی آج سے ۷۰، ۸۰ سال قبل) فلسطین، عراق، ایران، شام، مصر، ترکی، یمن ۱۹۴۶ء کا پاکستان تجارتی استحصال اور مظلومیت کا شکار تھے تو آج بھی مظلوم ہیں، حالانکہ یہ ترقی کر کے اپنے ظالموں کے برابر ہو سکتے تھے، جس طرح چین، جاپان وغیرہ نے کیا ہے۔ اللہ کریم نے معاشی وسائل، معاشی ترقی کے ذرائع اور معاشی ترقی کے مواقع سے انہیں مالا مال کر رکھا ہے، یہ تیل اور دیگر معدنیات کی دولت میں بڑے امیر ہیں۔ دنیا کی تمام تجارتی آبی گذر گاہیں (مثلاً باب المندب عدن میں، نہر سویز مصر میں، ہرمز کی گذر گاہ خلیج میں، مراکش کے سرے پر جبل الطارق کی آبی گذر گاہ، ترکی میں آبنائے باسفورس پر درّہ دانیال، مالدیف میں زیبۃ المنہل کی گذر گاہ، ملا کا کی گذر گاہ اور جزیرہ مالٹا) مسلمانوں کے علاقوں میں ہیں، میں نے "قبضہ میں ہیں" یہ حقیقت جان کر نہیں لکھا کہ مسلمان اتنے کمزور ہیں کہ ان کے علاقوں میں بھی

تجارت کی اہمیت وفضیلت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

اسلام نے اسی لیے بار بار تجارت کی ترغیب دی، اس کے فضائل وبرکات سنائے دنیوی فوائد بتائے اور دینی بشارتیں سنائیں۔

❶ ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُواْ فِى ٱلْأَرْضِ وَٱبْتَغُواْ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ﴾ (۱)

ترجمہ: جب نماز پوری ہو جائے، تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال تجارت ورزق) کو تلاش وحاصل کرو۔

یہاں ''فضل'' سے مراد طلبِ رزق ومال ہے اور آیت کا شانِ نزول ترغیبِ تجارت پر مبنی ہے۔

❷ ﴿لَا تَأْكُلُوٓاْ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ (۲)

ترجمہ: اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضا کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔

❸ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم خرچ کرو ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

ان کا قبضہ قبضہ نہیں۔ نہ وہ اپنے وسائل اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہیں، نہ اپنی مرضی سے اپنا بجٹ تیار کر سکتے ہیں نہ اپنی بیرونی تجارت کی پالیسی طے کر سکتے ہیں۔ بھلا وہ تجارت میں ترقی کیونکر کر سکتے ہیں؟

(۱) القرآن الکریم، سورۃ الجمعة (٦٢): ١٠

(۲) سورۃ النساء (٤): ٢٩

(۳) سورۃ البقرہ (٢): ٢٦٧

مشہور تابعی مفسر مجاہد رحمہ اللہ [1] آیت کے جملہ "مَا کَسَبْتُمْ" کی تفسیر میں کسب سے مراد تجارت لیتے ہیں۔ [2]

❶ (عن أبي سعيد الخدری رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال:) قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم: التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء. [3]

ترجمہ: (حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچے اور امانت دار تاجر کا حشر نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔

کنز العمال کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص تجارت کرتا ہے اس کے یہاں خیر و برکت اور رفاہیت پیدا ہوتی ہے۔

❷ عن اسمعيل بن عبيد بن رفاعة عن أبيه عن جده رضی اللّٰه تعالٰی عنه عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم قال: التجار يحشرون يوم القيمة فجارا إلا أن اتقی وبرّ وصدّق. [4]

ترجمہ: حضرت اسماعیل بن عبید بن رفاعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد اور دادا رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن تاجر فاسق و فاجر اٹھیں گے مگر یہ کہ انہوں نے پرہیز گاری، بھلائی اور سچائی سے کاروبار کیا ہو۔

تجارت کے بنیادی اصول:

اسلام کے اقتصادی نظام میں تجارت اور باہمی کاروبار کی صحت اور درستی کا مدار

---

(۱) حضرت مجاہد تابعی رحمہ اللہ کا تعارف باب ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) امام بیهقی، ابو بکر احمد بن حسین: السنن الکبری، ج ۵، کتاب البیوع

(۳) ترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسی: الجامع، ج ۲، باب البیوع

(۴) علی المتقی: کنز العمال، الفصل الثالث فی انواع الکسب وآدابه. بیهقی: شعب الایمان

حسبِ ذیل اصول پر مبنی ہے:

باہمی تعاون:

❶ تجارت کا جواز چونکہ باہمی تعاون پر قائم ہے اس لیے تمام معاملات سے تجارت میں جانبین سے تعاون (Mutual Co- Operation) کا وجود ضروری ہے یعنی یہ نہ ہونا چاہیے کہ متعاقدین (Contractors) (دو معاملہ داروں) میں سے ایک کا زیادہ سے زیادہ نفع دوسرے کے زیادہ سے زیادہ نقصان پر موقوف ہو۔

﴿وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ﴾ (۱)

ترجمہ: بھلائی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر ہرگز کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔

حقیقی رضا:

❷ معاملہ میں جانبین سے حقیقی رضا (Real Consent) کا وجود ضروری ہے اضطراری رضا معتبر نہیں یعنی یہ نہ ہو کہ ایک شخص برضاء ورغبت اس معاملہ کے لیے آمادہ نہیں ہے مگر اس کی اضطراری کیفیت اس کی رضاء کی قائم مقام بن گئی ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ﴾ (۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل کی راہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت کی راہ سے باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ ہو۔

اہلیت معاہدہ:

❸ اہلِ معاملہ، معاملہ کی اہلیت بھی رکھتے ہوں، یعنی عاقل، بالغ یا ممیز

---

(۱) سورۃ المائدۃ (۵): ۲

(۲) سورۃ النساء (٤): ۲۹

(Discriminator) اور آزاد ہوں یعنی ناسمجھ بچہ، مجنوں (Insane) معتوہ (Idiot) اور مجبور و مکروہ (Coerced) نہ ہوں۔

❶ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: رفع القلم عن ثلثة: عن المجنون المغلوب حتی یئبر، وعن النائم حتی یستیقظ، وعن الصبی حتی یحتلم. الحدیث.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین شخصوں پر تکلیف شرعی (Sharia Obligation) عائد نہیں ہے: ایک مجنون و مغلوب (جس پر دیوانگی غالب ہو خواہ عارضی بذریعہ نشہ وغیرہ) یہاں تک کہ اس کی عقل لوٹ آئے یا بحال ہو جائے۔ دوسرے سونے والا یہاں تک کہ بیدار (ہو کر ہوشیار) ہو جائے کہ تیسرا چھوٹا بچہ حتیٰ کہ بلوغت (Puberty) کو پہنچ جائے۔

❷ نہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن بیع المضطر.[2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔

❹ معاملہ میں کسی قسم کا دھوکہ، خیانت اور معصیت کا دخل نہ ہو یعنی ان اشیاء کا کاروبار نہ ہو جن کا استعمال شریعتِ اسلامی نے معصیت اور حرام قرار دیا ہے۔

❶ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: أفضل الکسب بیع مبرور وعمل الرجل بیده.[3]

---

(۱) ابوداؤد: السنن، ج ۲، کتاب البیوع، باب النہی عن بیع المضطر

(۲) حوالہ بالا۔ اس ضمن میں سنن ابن ماجہ میں ہے:

انما البیع عن تراض. (ابن ماجہ: السنن، کتاب التجارات، باب ۱۸)

ترجمہ: بیع باہمی رضا (Mutual Consent) سے ہوتی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس طرح نقل کیا ہے:

لا تتفرقن عن البیع الا عن تراض. (جامع ترمذی، ابواب البیوع، باب ۲۶)

ترجمہ: بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں آپس کی رضامندی کے بغیر جدا نہ ہوں۔

(۳) مشکوۃ المصابیح، باب الکسب وطلب الحلال، حدیث ۵

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہترین کسب "بیع مبرور" ہے اور دستکاری سے معاش پیدا کرنا۔

۲ والبیع المبرور هو البیع الذی یبر فیه صاحبه، فلم یغش، ولم یخن، ولم یعص الله فیه الخ.[1]

ترجمہ: اور بیع مبرور ایسی بیع و شرا کو کہتے ہیں کہ جس میں متعاقدین ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں یعنی نہ اس میں دھوکہ ہو نہ خیانت اور نہ خدا کی معصیت لازم آتی ہو۔

۳ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا ضرر ولا ضرار.[2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا۔

ناجائز اور باطل اصولِ تجارت:

اور ان اصول کے خلاف حسبِ ذیل اصول تجارت کے مقصد کو فاسد (Vitiate) اور باطل (Voidable) کرتے ہیں اور اس لیے اسلام کے معاشی نظام میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ ان اصولوں کے ماتحت کاروبارِ تجارت کو فاسد اور باطل قرار دیتا ہے (مثلاً):

۱ مثلاً جوا (میسر) لاٹری اور سٹہ (Gambling) کے تمام انواع و اقسام۔ اس لیے کہ ان کی بنیاد و اساس بے شبہ ایسے معاملہ پر مبنی ہے کہ متعاقدین میں سے ایک جانب سے نفع دوسری جانب کے سر تا سر نقصان کا سبب بنتا ہے۔ (اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں):

۱ ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ

(۱) الجزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة، ج ۲ قسم المعاملات، ص ۲۰۲

(۲) احمد ابن حنبل: مسند، ۲۱/۲۱۲

كَبِيرٌ ﴾[1]

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار (Gambling) کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے ان دونوں باتوں میں بڑا گناہ ہے۔

❷ ﴿إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾﴾[2]

ترجمہ: بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے (Arrows) کارِ شیطان ہیں، پس ان سے بچو، تاکہ تم کو فلاح نصیب ہو۔

مالی نمو (Increase) اور حصولِ نفع کا وہ معاملہ جس میں جانبین سے کسی ایک جانب میں حقیقی رضا نہ پائی جاتی ہو بلکہ اضطراری اور جبری (Coercive) رضا کو حقیقی رضا کے قائم مقام رکھا گیا ہو۔ مثلاً سود (بیاج) یا کسی اجیر کی اس کی محنت کے مقابلہ میں غیر واجبی اجرت۔ (اسی طرح ارشاد ہے):

❸ ﴿وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰا۟ ﴾[3]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے بیع (جائز تجارت) کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

(مجبوری اور اضطرار (Duress) کی نہج کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے):

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع المضطر.[4]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضطرار سے مجبور کی خرید و فروخت (معاملہ) کو منع فرمایا ہے (یعنی اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے)۔

حضرت شاہ ولی اللہ (رحمہ اللہ) جبری و اضطراری رضا کو اسلامی نقطۂ نظر سے غیر

---

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۲۱۹

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۹۰

(۳) سورۃ البقرہ (۲): ۲۷۵

(۴) ابوداود: السنن، ج ۲، ابواب البیوع

معتبر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

فأن المفلس يضطرّ إلى أن إلتزم مالا يقدر على إيفائه، وليس رضاه رضا فى الحقيقة فليس من العقود المرضية ولا الأسباب الصالحة و إنّما هو باطل وسحت الخ.[1]

ترجمہ: اس لیے کہ مفلس مضطر اور مجبور ہوتا ہے کہ جس چیز کے پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا اس کو اپنی بے چارگی کی وجہ سے اپنے ذمہ کر لے اور یہ رضا ہرگز حقیقی رضا نہیں ہے۔ لہٰذا ایسا معاملہ (مثلاً ربوا جیسا) معاملہ نہ پسندیدہ معاملات میں سے ہے، اور نہ کاروبار کے صالح اور درست معاملات میں سے ہے اور بے شبہ اس قسم کا ہر معاملہ باطل اور ظلم ہے۔

۳ ایسا کاروبار جو اسلام کی نگاہ میں "معصیت" ہو۔ مثلاً شراب، مردار، اصنام (بت) خنزیر وغیرہ کی بیع و شراء یا ان اشیاء کی خرید و فروخت جو اپنی ذات میں نجس اور ناپاک ہوں۔ (اللہ کریم کا ارشاد مبارک ہے):

﴿حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ ٱلۡمَيۡتَةُ وَٱلدَّمُ وَلَحۡمُ ٱلۡخِنزِيرِ﴾[2]

ترجمہ: اے مسلمانو! تم پر مردار خون اور خنزیر کا گوشت حرام کر دیا گیا ہے۔

(اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے):

عن جابر رضى الله تعالىٰ عنه: أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: أن الله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام الخ.[3]

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، من ابواب ابتغاء الرزق

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۳

(۳) الشوکانی، محمد بن علی بن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ: نیل الاوطار، ج ۵، کتاب البیوع

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام کر دیا ہے۔

۴ وہ معاملات کہ جن میں جانبین سے عقد ہو جانے کے باوجود بھی نزاع (Tussel) اور مناقشہ (Controversy) کی صورتیں باقی رہیں اور کسی بھی فریق کے لیے ضرر ونقصان کا باعث ثابت ہوں کیونکہ یہ مقصد تجارت کے منافی ہے۔ مثلاً بیع یا ثمن (Sale & Price) یا دونوں میں ابہام (Ambiguity) رکھا گیا ہو اور تصریح نہ کی گئی ہو کہ کس قیمت میں خریدا ہے۔ یا ایک معاملہ کو دو معاملے بنالے۔ یعنی یہ کہے اگر نقد خریدے گا تو اس شے کی قیمت سو روپیہ ہے اور اگر ادھار لے جائے گا تو دو صد روپیہ اس کی قیمت ہے۔ یا جن معاملات میں بیع (مال) کو دیکھنا ضروری ہے اس کو دیکھے بغیر سودا کر لیا۔ یا بیع وشرا میں ایسی شرط لگادی جو معاملہ کا جزء یا رکن (Essential) نہیں ہے یا بیع مجہول کر لی یعنی دونوں جانب صرف باتیں ہی رہیں اور بیع و ثمن (Sale & Price) دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا، تو یہ اور اسی قسم کے معاملات میں تعاون باہمی کے بجائے نزاع اور مناقشہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ (اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات موجود ہیں، مثلاً):

۱ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: نهى النبی صلی الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة. [1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملہ بیع کو دو معاملات بیع بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔

باب ماجاء في بيع النجاسة الخ، حدیث نمبر ۱

(۱) رواه مالك والترمذی وابوداود والنسائی، کتاب البیوع. مشکوۃ المصابیح، باب المنهی عنها من البیوع، حدیث نمبر ٣٤

❷ نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع و شرط.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ (اضافی) شرط لگانے کی ممانعت فرمائی ہے۔

❸ عن حکیم بن حزام رضی الله تعالٰی عنه قال: نهانی رسول الله صلی الله علیه وسلم أن أبیع ما لیس عندی.[2]

ترجمہ: حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ[3] سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو منع فرمایا ایسی شے کے فروخت کرنے سے جو بیع کے وقت میری ملکیت میں نہیں ہے۔

❺ وہ معاملہ جس میں دھوکہ اور فریب مضمر ہو مثلاً ایک شے کی خرید یا فروخت منظور ہے مگر خاص غرض کے ماتحت معاملہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا اور ایک دوسری شے کے ضمن میں اس کو لے لیا گیا ہے اس طرح کہ اگر ضمنی شے جو بہت ناقص ہے یا سب سے بہتر ہے اس معاملہ کے اندر شامل ہو گئی تو معاملہ کر لیا ورنہ معاملہ کے تمام شرائط مکمل ہو جانے کے بعد معاملہ سے انکار کر دیا۔

---

(۱) الهیثمی، نورالدین علی بن ابی بکر: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، مکتبه القدسی، قاهرة، ۱۳۵۲ھ، ۸۵/٤

(۲) نسائی، کتاب البیوع. ترمذی، کتاب البیوع. مشکوۃ المصابیح، کتاب البیوع، حدیث نمبر ۳۲. طبرانی: معجم الاوسط

(۳) حکیم بن حزام بن خویلد ابو خالد القرشی الاسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھتیجے ہیں۔ آپ عام الفیل سے ۱۳ سال قبل بیت اللہ شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ اللہ کریم نے آپ کو جاہلیت اور اسلام دونوں حالتوں میں وجاہت عطا فرمائی تھی آپ نے فتح مکہ کے موقع پر دولت اسلام پائی۔ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ رہائش اختیار کر لی۔ آپ نے ایک سو بیس (۱۲۰) سال عمر پائی۔ ۶۰ سال جاہلیت میں اور ۶۰ سال اسلام کے سایہ عاطفت میں گزرے۔ بڑے بلند پایہ کے عاقل، فاضل اور متقی تھے۔ جب کبھی قسم کھانا پڑتی تو کہتے: اس عظیم و جلیل اللہ کی قسم! جس نے مجھے بدر میں بچا لیا آپ کی روایات صحاح ستہ میں منقول ہیں۔ آپ نے مدینہ منورہ میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔ (علامہ ولی الدین خطیب رحمه الله تعالٰی الکمال فی اسماء الرجال، مشکوۃ المصابیح کے ذیل میں اسد الغابه، تذکرہ حکیم بن حزام رضی الله تعالٰی عنه)

❶ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة و بيع الغرر.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکے کے معاملہ کو بھی حرام قرار دیا ہے اور کنکری پھینک کر کسی شے کی خریداری کرنے کو بھی۔

❷ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الملامسة والمزابنة.[2]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع ملامسہ (یعنی جب مشتری یا خریدار شے کو چھو لے تو اس پر اس کی بیع لازم ہو جائے) اور منابذہ (یعنی جب بائع فروخت کرنے والا) مشتری کی طرف کپڑا پھینک دے تو بیع لازم ہو جائے) سے منع فرمایا۔

❸ نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن النجش.[3]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ لین دین میں کھوٹ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

چونکہ یہ اور اسی قسم کے دوسرے معاملات میں یا قمار کے جرائم پائے جاتے ہیں اور یا متعاقدین (Contractors) میں سے کسی ایک کے ضرر و نقصان کا باعث بن کر

(۱) صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب بطلان بيع الحصاة الخ. الشوكاني: نيل الاوطار، ج ٥، كتاب البيوع، باب النهي عن بيوع الغرر

(۲) صحيح بخاری، ج ۱ كتاب البيوع، بيع الملامسة، باب بيع المنابزة. صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب ابطال بيع الملامسة الشوكاني، حواله بالا

(۳) صحيح بخاری، ج ۲، البيوع، باب النجش. الشوكاني: حواله بالا باب عن النجش.
نجش کے فقہی اصطلاحی معنی ہیں صرف مبیع (Good or Property for Sale) کی قیمت بڑھانے کے لیے بولی دینا تاکہ ضرورت مند صارف یا خریدار زیادہ دام دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس طرح ضرورت مند کو زیادہ قیمت دینے پر آمادہ کر کے اس کی ضرورت اور حاجت سے غلط فائدہ اٹھایا جائے۔

بد معاملگی، رنجش اور مناقشہ کا باعث ہوتے ہیں اس لیے معاشی نظام نے اس قسم کے تمام معاملات اور کاروبار کو فاسد و باطل کہہ کر ممنوع قرار دیا ہے۔

نھی رسول اللہ من تلقی الرکبان.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے نکل کر باہر تجارت کے قافلہ سے جا ملنے کو منع فرمایا ہے۔

تلقی الجلب یا تلقی الرکبان اور اس ممانعت کی وجہ:

اس ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی شہر میں قحط پڑ رہا ہے اور لوگوں کو مثلاً غلہ کی سخت حاجت ہے۔ یہ دیکھ کر چند ارباب دولت شہر سے باہر نکل کر کسانوں، کاشت کاروں اور سادہ لوح تاجرین غلہ کے پاس پہنچے اور غلہ کو سستی قیمت پر خرید لیا تاکہ شہر میں اس کو من مانی گراں قیمت پر فروخت کریں یا ناواقف کاشت کاروں اور تاجروں کو شہر کے نرخ کا پتہ نہ دیتے ہوئے باہر ہی سستے سے سستے داموں غلہ خرید لیا، اور جب وہ فروخت کرنے والے شہر میں داخل ہوئے تو ان کو معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ فریب کیا گیا۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی اصطلاح میں اس کو "تلقی جلب" اور "تلقی رکبان" کہتے ہیں اور اس کے نزدیک یہ طریقہ خرید و فروخت چونکہ بیجا نفع خوری پر مبنی ہے اس لیے ممنوع ہے۔

اس ممانعت کی حکمت:

حنفی فقہ نے اس ممانعت کی حکمت و علّت پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ یہ ممانعت جب مؤثر ہوتی ہے کہ ایسے کاروبار سے یا شہر اور کسب کو نقصان پہنچتا اور بازار کے نرخ پر برا اثر پڑتا ہو یا فروخت کرنے والوں کو دھوکے میں ڈالا اور بازار کے نرخ کے بارے میں ان کو مغالطہ دیا گیا ہو اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر یہ بیجا نفع خوری میں داخل نہیں ہوگا اور اسی قسم کی ایک شکل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ

---

(۱) حوالہ بالا

وسلم نے ان جملوں میں ظاہر فرمایا ہے۔

عن جابر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لا یبیع حاضر لباد[۱]

(۱) بخاری، کتاب البیوع، باب من کرہ ان یبیع حاضر لباد بأجر. الشوکانی: نیل الاوطار، ج ۵، کتاب البیوع، باب النھی ان یبیع حاضر لباد. حضرت مصنف رحمہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حدیث مبارکہ پر اکتفا کیا کیونکہ مقصد کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ مگر اس اہم معاشی موضوع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وافر تعلیمات امت کر دی ہیں دراصل یہ موضوع قیمتوں کی میکانیت (Prices Mechanism) طلب اور رسد کی قدرتی قوتوں (Natural Forces of Demand & Supply) کو متاثر کرتا ہے اور مصنوعی قلت (Artificial Scarcity) کو جنم دیتا ہے جو مصلحت عامہ کے لیے ضرر رساں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استحصالی عمل سے روکنے کے لیے بہت زور دار انداز اختیار فرمایا ہے۔ یہ ارشاد گرامی پڑھیے:

عن انس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: نھینا أن یبیع حاضر لباد ولو کان اخاہ لأبیہ وامہ. (بخاری، کتاب البیوع، باب بیع حاضر لباد)

ترجمہ: حضرت انس (بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت ہے کہ ہمیں اس سے منع کر دیا گیا کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت کرے، خواہ وہ اس کا (باپ اور ماں کی طرف سے) سگا بھائی ہی ہو

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مصلحت عامہ (Public Welfare) انفرادی مفاد اور ذاتی تعلقات سے بھی زیادہ عزیز تھی اور اس میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جا سکتی ہے۔ اس مصلحت عامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

لا یبیع حاضر لباد. دعو الناس یرزق اللّٰہ بعضھم من بعض. (صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الحاضر للباد)

ترجمہ: کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اللہ کریم ان کو ایک دوسرے کے ذریعہ رزق دیتا ہے۔

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس ممانعت کے بعد کیا دلالی (Agency Brokerage) کا پیشہ جائز ہے؟ دراصل یہ سوال اس وقت ذہن میں آتا ہے جب ہم بیع حاضر لباد اور دلالی کو ایک ہی عمل کے دو نام یا ایک ہی سکہ کے دو رخ قرار دیں "بیع حاضر لباد" دراصل احتکار (Hoarding) کا ذریعہ ہے، یہ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ (Prices Flactuation) کا سبب بن کر گرانی اور مصنوعی قلت اور بعض اوقات قحط کے حالات پیدا کرتا ہے جبکہ اسلامی معاشیات میں دلال (Broker / Agent) کا کام فریقین بیع یعنی بائع اور مشتری (Saler & Buyer) میں واسطہ بن کر عادلانہ قیمت (Equitable Price) کا تعین کرنا ہے بلکہ ناواقف اور اناڑی (Unfamiliar) فریق کو نقصان سے بچانا ہے۔ موجودہ معاشی معاملات کی پیچیدگی (Complexity) میں دلال کا کردار بہت اہمیت کا =

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شہری، گاؤں والوں کے لیے بیع و شراء کا معاملہ نہ کرے۔

بیع حاضر للبادی:

اسلام کے اقتصادی نظام کی اصطلاح میں "بیع حاضر للبادی" کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا تجارتی مال شہر میں موجود ہے مگر وہ بیجا نفع خوری کے لیے شہر والوں کی حاجت و ضرورت کے باوجود ان کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا بلکہ سادہ لوح دیہاتیوں میں جا کر گراں قیمت پر فروخت کرتا ہے یا شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان خرید و

حامل ہو گیا ہے۔ عام بازار کے خوردہ فروش (Ratailer) اور تھوک فروش (Whole Saler) سے لے کر بین الاقوامی تجارت میں درآمدات و برآمدات (Imports & Exports) تک دلال کا عمل دخل ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا علم معاشیات کے ایک عام طالب علم کو بھی ہوتا ہے۔ دلالی کا مفید عمل کہیں ایجنٹ، کہیں مڈل مین (Middle Man)، کہیں بروکر (Broker) اور کہیں مرکزی بنک (Central Bank) کے ذریعہ سر انجام پاتا ہے۔ اس خدمت (Service) کے نتیجہ میں دلال جو فیس یا اجرت جا کمیشن کے نام سے لیتا ہے وہ جائز ہے۔ اس ضمن میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں لکھا ہے۔

ولم یر ابن سیرین و عطاء وابراهیم والحسن (رحمهم الله تعالیٰ) بأجر السمسار بأسا. وقال ابن عباس (رضی الله تعالیٰ): لا باس ان یقول: بع هذا الثوب فما زاد علی کذا کذا فهو لك. وقال ابن سیرین رحمهم الله تعالیٰ: اذا قال: بعه بکذا فما کان من الربح فهو لك أو بيني و بينك، فلا بأس به. وقال النبی صلی الله علیه وسلم: المسلمون عند شروطهم.
(صحیح بخاری کتاب الاجارات، باب اجرة السمسرة)

ترجمہ: حضرت ابن سیرین، ابراہیم (نخعی) اور حسن (بصری) رحمہم اللہ تعالیٰ کے مطابق دلال کی اجرت یا فیس یا کمیشن میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: (ایجنٹ یا بروکر کو) یہ اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ کپڑا (یا کوئی سامان) فروخت کر دو اور اس (جو قیمت میں لینا چاہتا ہوں) سے اوپر جو کچھ وصول ہو گا وہ تمہارے لیے ہو گا۔ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ مزید کہتے ہیں: (ایجنٹ یا بروکر کو) یہ اختیار دینے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اس سامان کو فلاں قیمت پر فروخت کر دے اس پر جو منافع ہو گا وہ تمہارے لیے ہو گا یا میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المسلمون عند شروطهم.

ترجمہ: مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں۔

فروخت میں مانع ہو کر دیہاتیوں کی جانب سے خود ذمہ دار بن جاتا اور گراں قیمت پر اشیاء خرید کراتا ہے، پس اگر یہ معاملہ جانبین میں سے کسی کے لیے بھی نقصان اور ضرر کا باعث ہے تو اس قسم کا کاروبار ممنوع ہے ورنہ اگر محض سمسار (دلال) کی حیثیت سے حصول نفع مقصود ہے اور متعاقدین کے لیے باعث مضرت نہیں ہے تو درست ہے۔

بہرحال اسلام کے اقتصادی نظام میں ایسے تمام تجارتی کاروبار کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جن میں یا قمار کی صورت بن جاتی ہو یا سود کی، اور اگر یہ دونوں امور نہ ہوں تو پھر وہ نزاع اور مناقشہ (Tussel & Controversy) کی شکلیں پیدا کرنے کا باعث اور سبب بنتے ہوں جن سے تعاونِ باہمی اور ہر دو جانب میں جائز نفع کا فقدان لازم آتا ہو اور بے جا نفع خوری کے لیے راہیں پیدا ہوتی ہوں۔

(ب) صنعت و حرفت

اہمیت:

❶ وسائل معیشت کے شعبوں میں تیسرا اہم شعبہ "صنعت و حرفت" ہے اور بے شبہ تمدن و حضارت (Civilization) کی ترقی میں صنعت و حرفت کو بھی نمایاں دخل ہے اور تجارت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی برکات بھی بہت زیادہ ہیں بلکہ یہ خود تجارت کا ہی ایک اہم حصہ ہے اور تجارت کا بہت بڑا مدار اسی کی ترقی پر ہے۔

❷ اسلام کا ابتدائی دور مشینوں کا دور نہ تھا اس لیے اس ذریعہ سے صنعت و حرفت کی جو ترقیاں ہو رہی ہیں ان کا تذکرہ ملوں اور کارخانوں کی بحث میں آئے گا، مشینیں جن صنعتی اغراض کے لیے بھی استعمال کی جائیں اور آئندہ ایجادات میں کام میں لائی جائیں اور ان کے استعمال کے جو طریقے بھی بن پڑیں اسلام کے اقتصادی نظام میں ان سے متعلق اساسی و بنیادی احکام بھی آئندہ صفحات میں بیان ہوں گے لیکن دستی مصنوعات اور دستی کاروبار کے لیے اسلام نے ترغیبات کا سلسلہ بھی رکھا ہے اور اس

کی انواع و اقسام اور بعض جزئی تفصیلات تک کا بھی ذکر کیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ معاشی زندگی کی ترقی میں یہ ایک نہایت مرغوب اور پسندیدہ عملی جدوجہد ہے۔

عن المقدام عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما اکل أحد طعاما قط خیرا من أن یأکل من عمل یدہ وأن بنی اللہ داود علیہ السلام کان یأکل من عمل یدہ۔ (۱)

ترجمہ: حضرت مقدام رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲) کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا کسی نے نہیں کھایا ہے اور اللہ کریم کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام ”زرہ بناتے تھے اور جنگ کے لیے لوہے کی قمیص کی صنعت کا کام کرتے تھے، حدیث میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

”خالد کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ انسان کے لیے کسبِ معاش کا کون سا ذریعہ بہتر ہے؟ فرمایا: دستکاری۔“(۳)

اور مستدرک حاکم (۴) میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بسند

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ

(۲) حضرت مقدام بن معدیکرب الکندی ابو کریمۃ شامی رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ہیں۔ نامور بزرگ، محدث اور مجاہد تھے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ احادیث روایت کی ہیں جو صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث میں منقول ہیں۔ آپ نے شام میں ۸۷ھ میں ۹۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (اکمال فی اسماء الرجال از شیخ ولی الدین خطیب رحمہ اللہ تعالیٰ مؤلف مشکاۃ المصابیح تذکرہ مقدام رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۳) ابن ماجہ: السنن، ابواب التجارات، باب الحث علی المکاسب. مشکوۃ المصابیح، باب الکسب وطلب الحلال، فصل اول، حدیث نمبر ۱

(۴) حاکم، حافظ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری معروف بابن البیع رحمہ اللہ کا بڑے حفاظ حدیث صحیح احادیث کو سب سے زیادہ جاننے والوں اور مصنفین حدیث میں شمار ہوتا ہے۔ آپ نیشاپور میں پیدا ہوئے، تحصیل علم کے لیے عراق، خراسان اور ماوراء النہر کا سفر کیا۔ بڑے ہو کر اپنے ملک نیشاپور کے جج (قاضی) =

منقول ہے۔

کان داؤد زرّادا، وکان آدم حراثا، وکان نوح نجارا، او کان إدریس خیاطا وکان موسیٰ راعیا.[1]

ترجمہ: حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے، آدم علیہ السلام کاشتکاری کرتے تھے، نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے، حضرت ادریس درزی کا پیشہ کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے کا کام کرتے تھے۔

اسلام سے پہلے "قریش" اگرچہ تجارت کے خوگر تھے اور سورہ "ایلاف"[2]

بنے۔ آپ نے بہت سی کتب تصانیف کیں جن میں "المستدرک علی الصحیحین" "تاریخ نیشابور" اور "الاکلیل" مشہور ہیں۔ آپ نے ۴۰۵ھ میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: الزرکلی، خیر الدین: الاعلام، مطبوعہ مکتبہ عربیۃ، دمشق حاکم نیشا پوری، حافظ ابوعبداللہ بن محمد بن عبداللہ، المستدرك، عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

(۱) ابن حجر عسقلانی: فتح الباری ج ٤ کتاب البیوع

(۲) اس سورۃ میں اللہ کریم نے قریش پر اپنے احسان و کرم کا تذکرہ کیا ہے، جس میں انہوں نے اس وقت کی دنیا میں عزت و امن عطا فرمایا، جب دیگر اقوام کے تجارتی قافلے لٹتے تھے۔ اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے اسفار جاری نہیں رکھ سکے، جنہیں اپنے تجارتی قافلوں کو چلانے کے لیے بقاعدہ مسلح دستے رکھنا پڑتے تھے، پھر ایک قوم کو دوسری قوم سے تجارت کرنے کے لیے بڑی سیاسی اور معاشی مشکلات درپیش تھیں، مگر قریش مکہ کے تجارتی قافلے پر امن ہر جگہ آتے جاتے تھے، تمام اقوام نے ان سے تجارتی معاہدے (جنہیں ایلاف کہا جاتا تھا) کر رکھے تھے، اور ہر مقام پر انہیں عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہاشم بن عبد مناف بن قصی وہ پہلے سردار قریش تھے جنہوں نے روم کے بادشاہ قیصر اور پھر قیصر کی سفارش پر حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے تجارتی معاہدات کیے۔ اسی طرح وہ فلسطین تک سفر کرتے اور غزہ سے ہو کر مکہ مکرمہ واپس آتے۔ وہ سردیوں میں یمن کا پر امن تجارتی سفر کرتے اور گرمیوں میں شام کا۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر: تاریخ، ص ۱۰۸۹. ابن سعد: طبقات ۷/۲. یعقوبی احمد بن ابی یعقوب: تاریخ، مطبوعہ نجف، ۱۳۵۸: ۱/ ۲۰۱

یہ سب بیت اللہ شریف کے ہمسائے اور متولی ہونے کی وجہ سے تھا، جس کا ذکر اللہ کریم نے بطور اپنے احسان عظیم کے فرمایا ہے۔ لیجئے سورۃ کی تلاوت کیجئے:

﴿لِإِيلَٰفِ قُرَيْشٍ ۝١ إِۦلَٰفِهِمْ رِحْلَةَ ٱلشِّتَآءِ وَٱلصَّيْفِ ۝٢ فَلْيَعْبُدُوا۟ رَبَّ هَٰذَا ٱلْبَيْتِ

میں سردی اور گرمی کے کاروانِ تجارت کی آمد و رفت کا اسی لیے تذکرہ کیا گیا ہے، تاہم اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے ذرائع آمدنی ان کی معاش کا ذریعہ تھے، بلکہ بعض اوقات وہ ان کو تجارت پر بھی ترجیح دیتے تھے، یعنی "جوا" غارت و لوٹ اور سودی لین دین۔

اسلام نے ان غلط راہوں کو بند کر کے صرف جائز طریقہ، تجارت کو باقی رکھا، اس کی ترغیب دی اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بصری کی منڈی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا[1] کے مال کی خرید و فروخت فرمائی اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اسوۂ حسنہ بن کر ان کو با اخلاق تاجر بنایا، بننے، سینے، جوتیاں بنانے، برتن بنانے اور اسی قسم کی گھریلو ضروریات کو خود تیار کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی، عورتوں کو کاتنے کی ترغیب دی تو مردوں کو بننے کی تلقین کی اور اس طرح دستکاری سے

---

(۳) ﴿ٱلَّذِىٓ أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَءَامَنَهُم مِّنْ خَوْفٍۭ ﴿٤﴾﴾ (سورة القريش (١٠٦): ١، ٤)
ترجمہ: چونکہ قریش کو خوگر بنانا تھا، وہ خوگر ہوگئے، گرمی اور سردی کے سفر کے۔ لہذا (اس خوگر بننے کے لیے ہماری طرف سے دی گئی سہولتوں اور عزت و احترام کی نعمت کے شکریہ میں) ان کو چاہیے کہ اس خانہ کعبہ کے (عظیم و جلیل) پروردگار کی عبادت کریں، جس (کریم) نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور (سفر کے) خطرہ سے امن میں رکھا۔

(۱) ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ بنت خویلد المخزومیۃ القریشیۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت ذی وجاہت و وقار اور مالدار خاتون تھیں۔ ۴۰ سال کی عمر میں اللہ کریم کے کرم و احسان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اور فضائل پسندیدہ اور بالخصوص آپ کی تاجرانہ دیانت داری سے متاثر ہو کر آپ کی زوجہ محترمہ بننے کی سعادت پائی، اس وقت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پچیس (۲۵) سال تھی۔ پھر زندگی بھر آپ کے دکھ سکھ، مشکلات و مصائب اور خوشی و غمی کا ساتھی بن کر رہیں۔ آپ کی دولت نے بظاہر فقیر (دراصل شاہِ کون و مکان) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی دکھ کم کر دیئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آپ سے ہوئیں۔ آپ کی زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکاح نہیں کیا کیونکہ آپ ایسی ستودہ صفات، غم گسار اور خیر خواہ بیوی محض اللہ کریم کے کرم ہی سے ممکن تھی۔ آپ نے ۱۰ سن بعثت میں وفات پائی اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تین دن قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غمخوار، باوفا اور محسن چچا ابو طالب نے وفات پائی۔ ان کا صدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا کہ تاریخ نے اس سال سانحہ غم کا نام ہی عام الحزن رکھا۔

روزی کمانے کو دنیوی فلاح بھی بنایا اور اخروی شادکامی کی بشارتوں سے بھی نوازا۔ (۱)

اسلام نے اس بارہ میں بھی صرف ترغیبات اور ضروری اصلاحات ہی تک اپنی رفتار کو محدود نہیں رکھا، بلکہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ذرائع کو وسیع کیا اور خلافتِ راشدہ اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دورِ حکومت میں عرب سے باہر ایران، شام، عراق، مصر اور روم میں تجارتی منڈیاں قائم کی گئیں اور ان کی ترقی کے لیے بہتر سے بہتر سہولتیں مہیا کی گئیں۔

(ج) تجارت و صنعت کے عملی وسائل

مادی ترقی کے اس دور میں تجارت و صنعت کی ترقی و کامیابی میں دو چیزوں کا بہت دخل ہے۔ ① شرح تبادلہ (Rate of Exchange) ② محصولات درآمدات و برآمد (Custom Duties)

شرح تبادلہ:

اسلامی اقتصادی نظام کے دورِ اول میں ان میں سے پہلی چیز کا وجود نہیں تھا اس لیے کہ اس زمانے کی تجارت بیشتر اشیاء کے بدلے میں اشیاء (Barter System) ہی کے ذریعہ ہوا کرتی تھی اور کہیں کہیں ٹکسالی سکہ اور چاندی، سونے کی غیر مسکوک

---

(۱) انہی ایمان افروز بشارتوں اور ہاتھ سے کما کر کھانے کی عظمت کا احساس دلانے کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دستکاریوں اور صنعتوں کو بطورِ پیشہ اپنا کر جہاں اپنے روزگار کے مسئلہ کا حل کیا، وہاں رہتی دنیا تک انسانوں کو یہ سبق دے گئے کہ دستکاری اور صنعت معاشی تگ و تاز کا ضروری جزو ہے، اور کوئی بھی ہنر اپنی ذات میں حقیر نہیں ہوتا، غلط انسانوں کی غلط سوچ اسے برا بناتی ہے۔
صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پارچہ باف تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیر ساز تھے، حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد محترم حضرت عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ خیاط (درزی) تھے، کعبہ کے کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی درزی تھے، حضرت ابو سفیان بن صخر بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ چمڑا کی دستکاری کرتے تھے، حضرت عقبہ بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑھئی تھے، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوہار تھے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: ابن قتیبہ، ابو محمد عبداللہ بن مسلم الدینوری: کتاب المعارف، عنوان صناعات الاشراف)

(Uncoined) ڈلیوں کے ذریعے بھی لین دین ہو جایا کرتا تھا، اس لیے تبادلہ سکہ جات کے جو اثرات آج کل کی تجارت پر پڑتے ہیں اور اقتصادی فلاح و بہبود یا تباہی و بربادی لاتے ہیں اس زمانے میں ان کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

محصولات درآمد و برآمد:

درآمد و برآمد پر محصول کا سسٹم اسلام کے اقتصادی نظام کے دور اول میں بھی رائج تھا۔ ایک قومی و ملکی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی تجارتی ترقی کے لیے شرح مبادلہ اور محصولات کو اس طرح قائم کرے جس سے نقصان کی بجائے فائدہ اور ناکامی کی جگہ کامیابی کے ساتھ ملک مالا مال ہو، چاہے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام کو اس کی وجہ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

لیکن چونکہ اسلام عالمگیر پیغام ہے اور وہ اخوتِ عالم کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس لیے اس معاملہ میں وہ ایسے ترجیحی سلوک کا قائل نہیں ہے جس سے ملکوں اور قوموں کے درمیان تجارت کے نام سے معاشی دستبرد اور تجارتی حسد و بغض پیدا ہو اور نتیجہ میں ایک کی غلامی اور دوسرے کی آقائی، یا ایک کی خوشحالی اور دوسرے کی تباہی ظاہر ہو اس لیے اس نے تجارت کے محصولات کے بارے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے اور درآمد برآمد پر اس قسم کی پابندیاں عائد نہیں کیں جو اس مہذب دور کی حکومتوں نے استحصال بالجبر (Exploitation By Force) کے لیے نکال رکھی ہیں، اس نے تو فطری تقاضا کے مطابق یہی فیصلہ دیا ہے کہ ''تجارت'' معاشی ذرائع میں سے ایک بہترین ذریعہ ہے لہذا اس کو اپنے اور پرائے کا فرق کیے بغیر ٹیکسوں اور محاصل سے معاف رکھا جائے تاکہ خدا کی کائنات کے مختلف حصوں کی مخصوص اشیاء دوسرے حصوں میں آسانی کے ساتھ لی دی جا سکیں اور خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق محبت اور پریم کے ساتھ ایک دوسرے کا تعاون حاصل کر سکے اور خالقِ کائنات کی یہ ساری کائنات ایک برادری اور ایک ہی کنبہ بن جائے،

لیکن جب تک یہ صورتِ حال پیدا نہ ہو اس وقت تک اپنی جماعتی زندگی کی فلاح کے لیے مساویانہ سلوک پر عملدر آمد کیا جائے، لہٰذا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب عراق اور شام کے گورنروں نے یہ اطلاع دی کہ نصاریٰ و یہود کے ممالک میں جب مسلمان تاجر جاتے ہیں تو ان سے مالِ تجارت پر محصول لیا جاتا ہے، تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی یہ حکم دیا کہ اگر وہ ہمارے ملکوں میں مالِ تجارت لے کر آئیں تو جس حساب سے وہ ہمارے تاجروں سے محصول لیتے ہیں اسی حساب سے ان سے بھی محصول لیا جائے اور اس کا اصطلاحی نام عشور رکھا گیا۔

وكان مذهب عمر رضى الله تعالٰى عنه فيما وضع من ذلك أنه كان يأخذ من المسلمين الزكوة، ومن أهل الحرب العشر تاما لأنهم كانوا يأخذون من تجار المسلمين مثله إذا قدموا بلادهم.[1]

---

(۱) ابو عبید: کتاب الاموال (مطبوعہ قاهرة، ۱۳۵۲ھ) ص ۵۳۱۔ امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلہ —— کہ مسلمان تجار سے جو لیا جائے گا وہ ان کے اموال تجارت کی زکاۃ ہو گی البتہ ذمی اور حربی سے تجارتی محصول لیا جائے گا —— کی وضاحت اس طرح کی ہے:

كتب عمر بن الخطاب (رضى الله تعالٰى عنه) الى عمّاله أن يأخذوا من المسلم ربع العشر، ومن الذمى نصف العشر ومن الحربى العشر وما يؤخذ من المسلم من ذلك فهو الزكاة المفروضة الواجبة، تعتبر فيها شرائط وجوبها من حول، ونصاب، وصحة الملك، فان لم تكن الزكاة قد وجبت لا تؤخذ منه. (احکام القرآن: ج ۲، مطبوعہ مصر ۱۳۳۵ھ، ص ۱۵۵

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ وہ مسلمان (تجار) سے چالیسواں حصہ، ذمی سے بیسواں حصہ اور حربی سے دسواں حصہ وصول کریں۔ مسلمان (تاجر) سے جو کچھ لیا جائے گا یہ وہی مقررہ زکاۃ ہو گی جو (شرعاً) واجب ہے، اس ضمن میں وجوب زکاۃ کی شرائط مثلاً سال کا گزرنا، (مال کا بقدر) نصاب ہونا، صحیح ملکیت (یعنی عاقل، بالغ مسلمان) ہونا ملحوظ رکھا جائے گا۔ ہاں اگر کسی مسلمان پر زکاۃ واجب نہیں (بنتی) ہے تو اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔

اسی طرح یہی امام جصاص رحمہ اللہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

كتب عمر بن عبدالعزيز —— رحمة الله عليه —— إلى عمّاله أن يأخذوا مما يمّر به =

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مذہب ہے کہ وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لیتے تھے اور اہل حرب سے عشور وصول کرتے تھے اس لیے کہ حربی حکومتوں کا دستور تھا، کہ جب مسلمان تاجران کے ملکوں میں جاتے تو اسی طرح کا محصول وہ ان سے وصول کرتی تھیں۔"

اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فیصلہ تھا کہ ایک تاجر سے سال میں صرف ایک ہی مرتبہ لیا جائے، خواہ وہ سال کے اندر متعدد بار مال درآمد برآمد کیوں نہ کرے، نیز پھلوں پر محصول معاف تھا۔

(د) تجارت وصنعت کو ترقی دینے کے طریقے:

مسطورہ بالا امور کے علاوہ خلافتِ اسلامیہ نے اور دوسرے طریقوں سے بھی تجارت وصنعت کو فروغ دیا اور اقتصادی حالت کو ترقی دینے کی راہ اختیار کی۔ مثلاً:

المسلم من التجارات من كل عشرين دينارا نصف دينار، ومما يمّر به الذمي يؤخذ منه من كل عشرين دينارا دينار، ثم لا يؤخذ منه شئ إلا بعد حول، أخبرني بذلك من سمع النبي صلى الله عليه وسلم. (حواله بالا)

ترجمہ: حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے گورنروں کے نام حکم جاری کیا کہ جو اموال تجارت مسلمان (تجار) لے کر گزرے اس سے (اگر وہ) بیس دینار (کا ہو تو) نصف دینار وصول کیا جائے۔ اور جو مال ذمی لے کر گزرے اس کے بیس دینار میں سے پورا ایک دینار لیا جائے۔ پھر سارا سال اس سے اس مال سے کچھ بھی وصول نہ کیا جائے۔ مجھے اس (عمل اور اس پر حکم) کی خبر ایسے شخص نے دی ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ رزیق بن حکیم رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے گورنروں کو لکھا تھا: مسلمانوں کے اموال تجارت سے چالیس دینار پر ایک دینار (یعنی ۴۰/۱ حصہ) لیا کرو اس سے آگے اگلے چالیس دینار پر اسی حساب سے وصول کرو اور اگر (چالیس دینار سے) ایک تہائی بھی کم ہو تو اسے چھوڑ دیا کرو۔ اور ٹیکس کلکٹر یہ خوب نوٹ کرے گا تاکہ سال گزرنے پر اس (مال) کی زکاۃ وصول کر سکے گا، اور جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس مال پر سال گزر چکا ہے، ان تجار سے کچھ نہ لے گا۔ (کتاب الام: ۳۹/۲)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان تاجروں سے جو عاشور (Customs) کے نام پر لیا جاتا تھا وہ ان کے اموال تجارت پر زکاۃ ہوتی تھی، مگر ذمی اور حربی کافر سے محصول لیا جاتا تھا۔ البتہ سال میں صرف ایک بار اور بس۔

❶ اسلام سے پہلے عرب کی تجارت کا بہت بڑا تعلق مصر، روم، ایران اور ہندوستان کے ساتھ تھا، اور اس کے لیے انہوں نے حسبِ ذیل مقامات میں منڈیاں قائم کر رکھی تھیں۔

دومۃ الجندل، مشقر، ہجر، صحار، ریا، شحر، عدن، صنعاء، رابیہ، حضر موت، عکاز، ذوالمجاز اور بصری۔"[1]

---

(۱) کرد علی محمد: الاسلام والحضارة العربية، مطبوعه قاهرة، ۱۳۳۹ھ، ۱۱۶/۲۔ یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب رحمہ اللہ: تاریخ، مطبوعہ نجف، ج ا۔ ان تجارتی بازاروں میں سے بعض کا تذکرہ کتب تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، البتہ بعض کا ذکر ماضی کا قصہ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ مثلاً

❶ دومۃ الجندل شام اور مدینہ منورہ کے درمیان عرب کے شمال میں واقع ہے۔ بڑا تجارتی مرکز اور تجارتی کاروانوں کی گذر گاہ بھی رہا ہے۔ عرب اسی راستہ سے شام سے تجارت کیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد عرب کا مشہور قبیلہ بنو کنانہ یہاں آباد تھا۔ اس کا آج کل نام "جوف" ہے۔ یاقوف حموی: معجم البلدان، مطبوعه مصر: ۱۰۷/٤

❷ صنعاء اور عدن کے بازار موجودہ مسلم ملک یمن میں ہیں اور آج بھی مشہور تجارتی مراکز ہیں۔ عدن تجارتی شہرت کے ساتھ ساتھ عالمی بحری گزر گاہ بھی تھا اور ہے بھی۔

❸ رابیہ، حضر موت، شحر موجودہ مملکت سعودی عرب اور یمن کی سرحد پر واقع تھے، البتہ حضر موت دور جاہلیت اور ابتداء اسلام میں یمن کا شہر تھا۔ (یاقوت حموی: معجم البلدان)

❹ ہجر بحرین ہی کا دوسرا نام تھا، شقر بھی بحرین کا ایک مشہور تجارتی مرکز تھا۔ (سید محبوب رضوی: مکتوبات نبوی علی صاحبها الصلوة والسلام، مکتوب بنام منذر ساوی گورنر بحرین)

❺ صحار اور ریا بھی یمن اور عرب کے درمیانی علاقہ میں تھے۔ البتہ گردش ایام نے ان کے نام اور مقام بدل دیئے۔

❻ عکاز کا بازار جاہلیت کا سب سے بڑا بازار تھا۔ یہ وادی نخلہ اور طائف کے درمیان میدان عرفات میں لگتا تھا۔ یہ وسط ذوالقعدہ سے شروع ہو کر ۲۰ روز تک لگا رہتا تھا۔ یہ بازار ۱۲۹ھ تک باقی رہا۔ (کتاب الامكنة الازمنة، مطبوعه حیدر آباد، هند)

❼ ذوالمجاز کا بازار مکہ مکرمہ کے قریب یکم ذوالحجہ سے لگتا تھا اور ۸ ذوالحجہ کو یہاں سے منی منتقل ہو جاتا، گویا یہ حجاج کرام کا بازار تھا۔ (حواله بالا. یاقوت حموی: معجم البلدان)

❽ بصری شام کی مشہور تجارتی منڈی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ اور دوسری بار حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سامان تجارت لے کر تشریف لے گئے۔ اسی سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت، شرافت، معاملہ فہمی اور لیاقت کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والے حضرت خدیجہ

اسلامی خلافت نے بھی ان کو باقی رکھا اور جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خود بھی کاروبار کیا اور قرآن نے ''وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ'' کہہ کر اس کو اور زیادہ مضبوط بنا دیا، مدینہ طیبہ کے مقام سنح میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کپڑے کا گودام اور کارخانہ تھا،[1] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تجارت کا تعلق ایران تک وسیع تھا۔[2] حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی کپڑے کی تجارت تھی اور شام کے ساتھ بیوپار کرتے تھے، حاص حجاز میں ''عکاظ'' کی منڈی ۱۲۹ھ تک قائم رہی۔[3]

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمارہ بن الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تجارتی کاروبار حبشہ میں نجاشی اور اس کے اعیانِ سلطنت کے ساتھ چلتا

رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے غلام میسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں آنے کا شرف حاصل کیا۔ (شبلی نعمانی: سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۱، عنوان: سفر شام، تزویج خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)

(۱) ابن سعد: طبقات، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۹۹۷ء، ۱۳۸/۳، ذکر ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۲) احمد بن حنبل: مسند، ۱/۶۰۲، ۳/۳۴۷

(۳) ابن حجر عسقلانی: فتح الباری: ۳/۲۶۹

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں نو آباد شہر کوفہ میں ایک بڑی تجارتی منڈی قائم کرائی۔ جس میں دور دراز سے آنے والے تجار اور مقامی کاروباری حضرات مخصوص ایام میں سودوں کے طے کرنے میں اس قدر غل پڑتا کہ گورنر کوفہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ــــــ جن کا مکان اس منڈی کے قریب واقع تھا ــــــ کو اپنے مکان کے سامنے ایک ڈیوڑھی تعمیر کرنا پڑی۔ جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک لمحہ برداشت نہ ہوئی کہ سائلوں اور گورنر کے درمیان آڑ بن رہی ہوگی، اسے آگ لگوا دی۔ (ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ: البدایة والنهایة: ۷/۷۵) اس منڈی سے خلافت کو اس قدر آمدن ہوتی کہ بعد کے ایام میں اس سے اس علاقہ میں موجود اسلامی لشکر کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ (یعقوبی: کتاب البلدان، ۱۸۹۱ء، ص ۳۱۰، ۳۱۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گورنر ابن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ کی اجازت سے بصرہ میں ایک تجارتی بازار قائم کیا۔ اس بازار نے تجارتی مرکز کا درجہ حاصل کیا۔ جس کے تین شعبہ جاتے تھے، ایک شعبہ صرف اونٹوں اور دیگر حیوانات کی خرید و فروخت کے لیے مخصوص تھا۔ (ابن سعد: طبقات، ۵/۳۳. یعقوبی: کتاب البلدان، ص ۳۱۰، ۳۱۱)

تھا،[۱] اور اس طرح بیشتر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تجارتی کاروبار میں مشغول تھے۔

اسی طرح مدینہ طیبہ میں یہود کی تجارتی منڈیاں اور صنعت و حرفت کے کارخانے تھے، انصار مدینہ نے صنعت و حرفت کا کام ان ہی سے سیکھا اور اسلام قبول کرنے کے بعد پھر انہی کے ہاتھ میں یہ کام آگیا، یہود نے ان کو کپڑا ابنا، رنگ سازی، تلواریں بنانا، زرہ بنانا آلات جنگ بنانا اور کاشت کاری کا کام سکھایا۔[۲]

بحری تجارت:

بری تجارت کے علاوہ بحری تجارت کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ اسلام سے پہلے اور اسلام کے زمانے میں اہل عرب کی تجارتی برآمد میں سونا، چاندی، تانبا، موتی، لوہا، جواہرات خوشبوئیں، کھانے کا مصالحہ، چمڑا، کھال، زین پوش، بھیڑ اور بکری تھے اور درآمد میں دوسرے ملکوں سے کپڑا، غلہ، ہتھیار، آئینہ اور دوسری آرائش کی چیزیں، مشک، سیاہ مرچ، عود ہندی، قسط ہندی، کافور، زنجبیل، صندل، ناریل اور لونگ وغیرہ اشیاء تھیں، قرآن عزیز نے بحری تجارت کے متعلق ایک جگہ اس طرح ترغیب دی ہے:

﴿وَتَرَى ٱلْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا۟ مِن فَضْلِهِۦ﴾[۳]

ترجمہ: اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ سمندر میں پانی پھاڑ کر چلتی ہیں تاکہ تلاش کرو اس کے فضل (تجارت) کو۔

ان تفصیلات کے ذکر سے یہ مقصد ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت جو اقتصادی نظام کی جان ہے، اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کو فروغ دینے اور کامیاب بنانے میں امکانی کوشش کی، بلکہ اسلامی حکومت نے کہ جس کا ابتدائی مرکزِ حکومت سرزمینِ حجاز تھا، تجارت و صنعت و حرفت ہی کو اقتصادی زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ تسلیم کیا اور اسلامی روایات نے

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) کرد علی، محمد: الاسلام والحضارة العربية، ۱۲۰/۱

(۳) سورة الفاطر (۳۵): ۱۲

مذہبی بشارات کے ساتھ اس کی پرزور تائید کی۔

حاصلِ کلام یہ کہ اسلام کے معاشی نظام نے تجارت کے بارے میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ تجارت و صنعت اصولاً محاصل کی پابندی سے آزاد ہوں ورنہ کم از کم سخت پابندیوں، سخت ڈیوٹیوں اور سخت محصولات سے آزاد ہونی چاہئیں تاکہ دنیا میں عام خوشحالی اور فارغ البالی پیدا ہو اور ہر شخص کو سامانِ معیشت مہیا کرنے میں آسانی ہو لیکن اس کے مقابلے میں تہذیب کے اس دورِ جدید میں دنیا کی خوشحالی اور انسانوں کی فارغ البالی کے لیے کیا کیا سامان فراہم کیے گئے ہیں اور اقتصادیات کو مستقل علم و فن بنانے کے مدعیوں نے دنیا کی اقتصادی بدحالی کو کس حد تک دور کیا ہے اس کا جواب مجھ سے زیادہ آپ دے سکتے ہیں۔

دارالضرب یا ٹکسال (Coinage):

تجارتی کاروبار اور تمام قسم کے لین دین میں سکہ بہت اہمیت رکھتا ہے انسان کے ابتدائی دورِ تمدن میں چیزوں کا لین دین عموماً چیزوں ہی کے ذریعے سے ہوا کرتا تھا، اس کے بعد سونا چاندی، تانبا قسم کی دھاتوں کے ٹکڑوں کے ذریعہ ہونے لگا اور تیسرے دورِ ترقی میں ''سکہ'' نے ان دونوں کی جگہ لے لی، سکہ کے وجود میں آنے کے بعد ترقی کا ایک درجہ یہ آیا کہ دارالضرب کا مطبوعہ کاغذ ''نوٹ'' کے نام سے دھات کے سکہ کا قائم مقام ہو گیا اور اب یہ بحث چھڑ گئی کہ کسی ملک کی اقتصادی ساکھ جب قائم رہ سکتی ہے کہ اس کے دارالضرب میں وہ دھات جو سکہ کا معیار قرار دی گئی ہو، اتنی مقدار میں موجود ہو جس مقدار میں نوٹ جاری کیے گئے ہیں۔

لیکن اس ترقی کے نتائج جس قدر تباہ کن ثابت ہوئے ہیں وہ آفتاب کی طرح روشن ہیں کیونکہ یہ ایجاد نو ایک ایسا حربہ ہے کہ محض اقوام کی اقتصادی حالت ہی کو برباد نہیں کر رہا ہے بلکہ رقیب حکومتیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے ان دو حربوں ہی سے کام لیتی رہتی ہیں جو بیجا شرح مبادلہ اور کاغذی سکہ کے نام سے مشہور ہیں، ممکن ہے کہ زمانہ کی بعض ضروریات اس مہلک ایجاد کے جواز کے لیے معقول

دلائل و وجوہ بیان کر دیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اس کا نقصان اور ضررِ عظیم اس کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے۔

"واثمھما اکبر من نفعھما."

ترجمہ: اور ان دونوں کا نقصان ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے۔

اسلامی اقتصادیات میں کاغذی نوٹ کی حیثیت:

اس لیے اسلامی اقتصادی نصام ایسے کاغذ کو سند تو تسلیم کر سکتا ہے لیکن "سکہ" تسلیم نہیں کر سکتا تاکہ کسی وقت بھی اس کاغذ کی اصل سے محروم نہ رہ جائے اور کسی قوم یا ملک کو اس راہ سے تباہ و برباد کرنے کا حیلہ ہاتھ نہ آجائے جیسا کہ آج محکوم قوموں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ (۱)

یہی وجہ تھی کہ جب غلام آباد برصغیر پاک و ہند میں نوٹ رائج ہوا تو علمائے اسلام کے مابین یہ علمی بحث چھڑ گئی کہ یہ سکہ ہے یا اس کی سند ہے اور نوٹ کے ذریعے زکوٰۃ ادا ہو سکتی ہے یا نہیں اور منی آرڈر کے ذریعہ "زکوٰۃ" یا کسی امانت کی رقم کو نوٹوں کی وساطت سے پہنچایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ہندوستان کے مشاہیر علماء عدم جواز کے قائل تھے۔

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے کاغذی نوٹ کے ذریعہ استحصال کا یہ ظالمانہ طریقہ آج سے ۷۰، ۸۰ سال قبل بیان کیا تھا مگر آج جب کہ دنیا ایک عالمی بستی (Global Village) کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، جبکہ اقتصادی تعاون، انسانی حقوق اور بین الاقوامی برادری کا زور سے راگ آلاپا جا رہا ہے۔ دنیا کا مضبوط ترین ظالم امریکہ اور اس کے حواری آج بھی کمزور اور معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں ممالک کے ساتھ یہی استحصالی حربہ (Exploitative Toll) استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جب مرحوم شاہ فیصل رحمہ اللہ نے تمام تیل برآمد کرنے والے مسلمان ممالک کے تعاون سے تیل کی عرب مخالف اور اسرائیل حامی ممالک کو برآمد پر پابندی کو بطورِ ہتھیار جنگ (War Weapon) اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو امریکہ نے اپنے کاغذی نوٹ ڈالر کی شرح تبادلہ گھٹا دی، یوں عربوں کے اربوں ڈالرز جو امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں پڑے تھے، ان کی قیمت ڈالرز سے گھٹ کر کاغذ کے اوراق کے برابر ہو گئی۔

نیز جب یہ ترقی یافتہ ممالک کسی غریب ملک کو اس کی قومی غیرت، خودداری، یا نظریہ کی سزا دینا چاہتے ہیں اس کے کاغذی نوٹ کی شرح تبادلہ گھٹا دیتے ہیں، یہ تماشہ دنیا کے عالمی اقتصادی سٹیج روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔

ہمارے روشن خیال حضرات کو جب اس بحث کا علم ہوا تو انہوں نے حسبِ عادت اس کا کافی مذاق اڑایا اور اس جانب مطلق توجہ نہ فرمائی کہ آخر اس بحث و مذاکرہ کی بنیاد کیا ہے؟ تاہم اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے جب اس فیصلہ سے بہت حرج ہونے لگا تو ان علماء نے مجبوراً "عموم بلوی" (عام ابتلاء) کی فقہی اصطلاح کے مطابق جواز کا فتویٰ دیا، ورنہ اصل حکم کے اعتبار سے اس کو سکہ تسلیم نہیں کیا۔(۱)

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ کی یہ رائے آج سے ۷۰ سال قبل (۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۸ء میں) تھی۔ اس وقت مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی نظریات سے وابستہ رکھنے اور انگریزی اقتدار کی شریعت اسلامیہ پر روز افزوں فکری یلغار سے بچانے کے لیے یہی رائے زیادہ درست تھی، علاوہ ازیں ابھی خلافت عثمانیہ کو زوال آئے (۱۹۲۳ء) زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور مسلمان مفکرین اپنے جہاد اور اخلاص کی وجہ سے اس کے احیاء (Revival) کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ اسلام کا پھریرا عالم پر لہرائے گا، اور مسلمان ایک بار پھر اپنی میراث (Heritage) سونا اور چاندی (نقدین) کے سکوں کو بے وقار کاغذی نوٹوں کی جگہ اصل سکہ بنائیں گے، مگر

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مسلمانوں کو مزید معاشی مشکلات سے بچانے کے لیے فقہاء نے کاغذی نوٹوں کو "زر کاغذی" (Paper Currency) ہونے کا فتوی دیا اس ضمن میں مجمع الفقہ الاسلامی الہند (Islamic Fiqa Academy of India) کے دوسرے سیمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء نیو دہلی ــــــ میں تمام علماء ہند کا اجتماعی فیصلہ بڑا اہم ہے، لکھتے ہیں:

"موجودہ دور میں سونا چاندی ذریعہ تبادلہ نہیں رہا اور کاغذی نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونا، چاندی کی جگہ لے لی ہے۔ حکومت کے قوانین بھی کاغذی نوٹوں کو مکمل طور پر ثمن (Price) کی حیثیت دیتے ہیں اور بحیثیت ثمن نوٹوں کو قبول کرنا لازم قرار دیتے ہیں، غرضیکہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت عرف اور رواج میں زر قانونی (Legal Currency) کی ہو گئی ہے۔ کرنسی کے اس ہمہ گیر رواج نے شرعی اور فقہی مسائل پیدا کیے ہیں، ان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور غور و خوض کرنے کے بعد شرکاء درج ذیل نکات پر متفق ہوئے:

❶ کرنسی نوٹ سند و حوالہ (Certificate & Transfer) ہی نہیں بلکہ ثمن ہیں اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی و قانونی (Termimolagical & Legal Currency) کی ہے۔

❷ عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ (Medium of Exchange) ہونے کی مکمل طور پر زر خلقی (سونا، چاندی) کی جگہ لے لی ہے، اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے، اس لیے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی (Real Price) کے مشابہ (Similiar) ہے، لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار۔ (سہ ماہی رسالہ "بحث و نظر" پھلواری شریف، پٹنہ، ہند جنوری تا مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۱۲)

سکہ سازی کی اسلامی تاریخ:

خلافتِ راشدہ کے دورِ خلافت میں دارالضرب موجود تھا اور اس میں سکے ڈھالے جاتے تھے، سونے اور چاندی کے سکے قسم قسم کے رائج تھے، جو درہم و دینار کے نام سے موسوم تھے۔

وضرب الدراهم على الخط الفارسي و زاد في بعضها الحمد لله و في بعضها "محمد رسول الله".[1]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکومت فارس کے طرز پر سکوں کے لیے دارالضرب قائم کیا اور بعض سکوں پر "الحمد للہ" اور بعض پر "محمد رسول اللہ" کے نقش کا اضافہ کیا ہے۔

مقریزی نے کتاب النقود الاسلامیہ میں تصریح کی ہے کہ دورِ اسلام میں

اس بارے سابق جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی —— جو پاکستان کے علماء احناف کی نمائندگی کرتے ہیں —— کے مضمون "کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم" کا یہ اقتباس نقل کرنا نہایت مفید ہے:

نوٹوں کے بارے میں یہ مسئلہ بعینہٖ فلوس (پیسوں) کے سکوں کی طرح ہے، سکّے اصلا دھات کے ہونے کی وجہ سے وزنی ہیں، لیکن فقہاء نے انہیں عددی قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان فلوس کے حصول سے ان کی ذات یا دھات یا تعداد مقصود نہیں ہوتی، بلکہ وہ قیمت مقصود ہوتی ہے، جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی بڑا سکہ جس کی قیمت دس فلس (پیسہ) ہو، اس کا تبادلہ ایسے دس چھوٹے سکوں سے کرنا جائز ہے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک فلس ہے، اور اس کے وہ فقہاء بھی جواز کے قائل ہیں جو ایک سکہ کا دو سکوں سے تبادلہ کو ناجائز کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں ایک سکہ کی قیمت بعینہٖ وہی ہے جو دس سکوں کی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دس فلس کا سکہ اگرچہ بظاہر ایک ہے۔ لیکن حکما وہ ایک ایک فلس کے دس سکے ہیں۔ لہٰذا وہ دس واقعی سکوں کے مساوی ہے، بعینہٖ یہی حکم ان کرنسی نوٹوں کا ہے کہ ان میں بھی ظاہری عدد (Apparent Number) کا اعتبار نہیں، اس عدد حکمی (Ruling Number) کا اعتبار ہے، جو ان کی قیمت (Face Value) سے ظاہر ہوتا ہے، لہٰذا اس میں مساوات ضروری ہے۔ (ماہوار البلاغ، نومبر ۱۹۸۸ء، عنوان: کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم: ص ۳۱)

(۱) مقریزی، تاج الدین احمد بن علی: النقود الاسلامیه المسمی به شذور العقود فی ذکر النقود، مطبوعه نجف (عراق)، ۱۹۶۷ء، ص ۹، ۱۵، مطبوعه جوائب، ۱۲۹۸ھ، ص ٤،٥

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے چاندی، سونے کی سادہ ڈلیوں کو مدوّر سکوں (Round Coins) میں تبدیل کیا، جو نوشیروانی سکوں کے مشابہ تھی اور بعض پر ''لا الہ الا اللّٰہ وحدہ'' بعض پر ''الحمد للہ'' اور بعض پر ''محمد رسول اللّٰہ'' نقش کرایا۔ اور یہ کہ ان کے زمانہ میں دس درہم کا مجموعی وزن چھ مثقال کے برابر ہوا کرتا تھا۔ (۱)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے بصرہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۴۰ ھ میں چاندی کا سکہ ڈھالنے کے لیے دار الضرب (۲) قائم کیا اور بستانی کی دائرۃ المعارف میں ہے:

درهم أودرهما أسم لمضروب مدور من الفضة والمشهور ان تدو يره فی خلافة الفاروق وكان قبله على شكل النواة بلا نقش الخ. (۳)

ترجمہ: درہم چاندی کے سکہ کو کہتے ہیں جو دار الضرب میں ڈھالا گیا ہو اور مدور ہو مشہور یہ ہے کہ اس کو گول سکہ کی شکل حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں دی گئی ہے ورنہ اس سے قبل وہ غیر منقش کھجور کی گٹھلی کی شکل میں تھا۔

اور عام کتبِ سیرت میں عبد الملک بن مروان (۴) کا نام لیا جاتا ہے اور بعض نے

---

(۱) حوالہ بالا۔ نقش بندی، نصیر الدین محمود: الدینار الاسلامی فی المتحف العراقی، بغداد، ۱۹۵۳، ص ۱۱، ۱۵۔ البتہ علامہ ماوردی رحمہ اللہ (ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی رحمہ اللہ) کی رائے میں ایران میں تین طرح کے دراہم کا چلن تھا۔ بغلی (آٹھ دانگ کا) طبری (چار دانگ کا) اور مغربی (تین دانگ کا)۔ ان میں سے پھر بغلی اور طبری زیادہ رواج پذیر تھے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ ان دونوں کو ملا کر نصف اسلامی درہم قرار دیا جائے۔ لہٰذا اس طرح اسلامی درہم چھ دانگ کا ٹھہرا۔ (الاحکام السلطانیہ: ص ۱٦٧)

(۲) حوالہ بالا

(۳) بستامی، معلم بطرس: دائرۃ المعارف، ٧/٦٧

(۴) عبد الملک بن مروان ۲٦ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ مدینہ منورہ میں تربیت پائی اور یہاں کے اہل علم و

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] کی جانب ابتداء کی نسبت کی ہے، چنانچہ ماوردی کی "الاحکام السلطانیہ" بلاذری کی فتوح البلدان اور ابن جریر رحمہ اللہ و ابن کثیر رحمہ اللہ کی تاریخ میں تفصیلات مذکور ہیں۔

میرے نزدیک یہ اختلاف حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ شہرت و عدم شہرت پر مبنی ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چاندی سونے کو خام سکوں کی شکل میں ڈھالنے کی ابتدا اگرچہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہوئی تھی لیکن سادہ ڈلیوں کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے عبدالملک کے زمانہ میں صرف دارالضرب (ٹکسال) کا سکہ ہی استعمال ہونے لگا، چنانچہ مذہب و اخلاق کی دائرۃ المعارف سے یہی پتہ چلتا ہے۔ [2]

دارالضرب (ٹکسال) کی حیثیت:

چونکہ سکہ عوام کی کاروباری زندگی کی سہولت کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اس کے دارالضرب کا مقصد نفع عوام ہے نہ کہ حکومت کا مخصوص شعبہ آمدنی۔ اس لیے اسلامی نظامِ اقتصادی میں ٹکسال کو صرف حکومت کے خزانہ ہی کے لیے

فضل سے فیض پایا۔ بہت بڑے فقیہ، محدث اور سیاست دان تھے۔ امام شعبی رحمہ اللہ کے بقول جب کبھی ان کی ملاقات عبدالملک رحمہ اللہ سے ہوئی انہیں علم کا منارہ پایا۔ عبداللہ بن ابوزناد رحمہ اللہ کے مطابق اس زمانے میں چار محترم شخصیات کو مدینہ منورہ کے فقہاء سمجھا جاتا تھا، جن میں حضرت سعید بن مسیب، قبیصہ بن زویب، عروہ بن زبیر اور عبدالملک بن مروان رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ وہ ۳۵ سال کی عمر میں ۶۵ھ میں تخت نشین ہوئے اور ۸۶ھ میں وفات پائی۔

(۱) حضرت عبداللہ بن زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سن ۲ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (ذات النطاقین) کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بیٹے ہونے کی وجہ سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حقیقی بھانجا تھے۔ سات سال کی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سعادت بیعت پائی۔ بہت سی جہادی مہمات میں شامل رہے۔ طرابلس کی فتح اللہ کریم نے آپ کے ہاتھوں کرائی۔ ۶۴ھ میں خلیفہ بنے۔ امویوں کے مخالف تھے، حجاز، عراق، شام، مصر آپ کے حامی تھے۔ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ میں امویوں کے محاصرہ کے دوران شہید کر دیئے گئے۔

(۲) Encyclopedia of Raligions & Ethics, vol Ed., P. 1939, 3rd, 709

مخصوص نہ ہونا چاہیے بلکہ عوام کو یہ سہولت ہونی چاہیے کہ اگر وہ اپنی مملوکہ دھات سے مروجہ سکہ سے مسکوک (Coined) کرانا چاہیں تو کرا سکیں، چنانچہ فتوح البلدان میں مروان بن الحکم کے دارالضرب سے متعلق تصریح ہے کہ وہ حکومت اور عوام دونوں کے لیے عام تھا۔[۱]

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں:

❶ شرح مبادلہ "امام" اور اس کی "مجلس شوری" کی رائے پر اصول بالا کی روشنی میں موقوف ہے اور وہ عام اقتصادی ترقی کے لیے جو صورت بھی مفید سمجھیں اختیار کریں۔

❷ محصولات یعنی کسٹم ڈیوٹی وغیرہ میں وہ اپنی جانب سے سختی کا قائل نہیں ہے اور اپنے نظام میں تجارت کو وسعت دینے کے لیے "بے قید تجارت" (Free Trade) کا حامی ہے لیکن اس نظریہ کی ہمہ گیری اسی وقت ممکن ہے کہ اس کی تعلیم حق کی طرح اس کا نظامِ حکومت بھی عالمگیر ہو اور جب تک یہ صورت حال موجود نہیں ہے اس وقت تک کے لیے وہ دوسرے ممالک اور اپنے ممالک کے درمیان انصاف کے مطابق معاملہ کو اختیار کرنا پسند کرتا ہے، وہ نہ دوسروں کو نقصان دینے کا خواہش مند ہے اور نہ خود اپنے لیے مضرت قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

علی پاشا مصری رحمہ اللہ[۲] اقتصادی بحث میں لکھتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ ان جیسے اقتصادی مسائل میں مشہور و معروف مذاہب دو ہیں: اول مذہب حریت (آزاد تجارت) اس مذہب کا دعوی یہ ہے کہ اجنبی برآمد پر کسی قسم کا ٹیکس نہ لگایا جائے اور تجارت کو آزاد چھوڑا

(۱) بلاذری، احمد بن یحیی بن جابر: فتوح البلدان، مطبوعہ مصر، ص ٤٥٤

(۲) علی پاشا، علی مبارک پاشا مصری ۱۲۴۱ھ (مطابق ۱۸۲۳ء) میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے عالم محقق، مؤرخ اور سیاسی مدبر تھے۔ مصر کے وزیر بھی رہے۔ اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے انہوں نے ہی "دارالکتب المصریۃ" قاہرہ میں قائم کیا، جہاں کئی اسلامی کتب شائع ہوئیں، انہوں نے ۱۳۱۱ھ (مطابق ۱۸۹۳ء) میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ ورحمۃ واسعۃ

جائے۔ اجنبی پیداوار اور حاصلات کی چونکہ انگریزوں کو بہت ضرورت ہے اس لیے ان کے اکثر ممالک کی اقتصادی پالیسی یہی ہے۔ اور جب اس مذہب کے مدعی غیر ممالک کے مال پر ٹیکس کے قابل نہیں ہیں تو اندرون ملک کی مصنوعات پر تو کسی طرح ٹیکس کو جائز نہیں سمجھتے۔ دوسرا مذہب حمایت (Proctection) (ترجیحی تجارت) کا اس مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ جب کسی ملک میں مصنوعات کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس کی قوت اور نفوذ قوت بہت ترقی کر جاتی ہے اور بہت مؤثر ہو جاتی ہے اس لیے قومی حکومت کا فرض ہے کہ اپنی ملکی مصنوعات کی حفاظت کرے اور ان کو مقدم رکھے اور اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے (یعنی غیر ملکی تجارت پر بھاری ٹیکس لگائے)۔"[1]

ان میں سے دوسرے نظریہ میں اقتصادی کشمکش اور ملکی و بین الاقوامی عناد و بغض (Retaliation) کی بو آتی ہے اور پہلا نظریہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کو تسلیم کرنے والی اقوام کا عمل اس کے خلاف سخت منافقانہ ہے۔ اور وہ دوسرے نظریئے کے قائلین سے زیادہ محکوم اقوام سے اپنے لیے ترجیحی سلوک کرانے اور ان سے فائدہ اٹھانے بلکہ ان کو تباہ کرنے کے لیے آزاد تجارت کی حمایت کرتی ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی تجارتی پالیسی اس کی روشن مثال ہے۔

اس لیے جب تک تمام دنیا کی قومیں اخلاق کے اس "مثل اعلیٰ" (Highest Description) تک نہ پہنچ جائیں جو بمصداق فرمان مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم):

❶ كلكم بني آدم وآدم خلق من تراب.[2]

(۱) مصری، علی پاشا: خواطر فی القضاء والاقتصاد والاجتماع، مطبوعه قاهرة، ص ۲۱۱، ۲۱۲

(۲) ابن كثير تفسير، سورة الحجرات (٤٩) آیت نمبر ۱۳. رواه الترمذی، وابوداؤد وكذا فی المشكوة، باب المفاخرة والعصبية. الهيثمی: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، باب البر والصلة.

ترجمہ: تم سب ایک باپ آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔

❷ (عن انس وعبداللّٰہ رضی للّٰہ تعالٰی عنہما قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم) الخلق عیال اللّٰہ (فأحب الخلق إلی اللّٰہ من أحسن إلی عیالہ).[1]

ترجمہ: (حضرت انس بن مالک اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مخلوق ساری کی ساری اللہ کریم کی عیال ہے۔ (پس اللہ کریم کو وہ شخص بہت محبوب ہے جو اس کی عیال کے ساتھ احسان کرے۔)

اخوت اور مساواتِ انسانی کا بلند درجہ ہے، اس وقت تک اقتصادی نظام کے لیے بہتر طریق کار یہ ہے کہ ایک طرف اسلام کے معاشی نظام کی جانب سے یہ سعی رہنی چاہیے کہ تجارت جیسی مفید چیز ''آزاد'' ہو اور اس سے اسلامی حکومت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملے اور اس مبارک وقت کے آنے تک دوسری جانب غیر مسلم اقوام سے عدل و انصاف کے ساتھ مساویانہ تجارتی تعلقات قائم ہوں، فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ذی شان ہمارے اس دعوی کی روشن مثال ہے۔''[2]

(س) تجارتی بدعنوانیوں کا انسداد:

تجارت کو اقتصادی نظام کا اہم جزو قرار دینے اور اپنے نظام میں تجارتی سہولتیں اور جائز آسانیاں بہم پہنچانے کے باوجود اسلام کا اقتصادی نظام ان تمام بدعنوانیوں کا سدباب کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے جو درحقیقت ''اقتصادی نظام'' کے مقصد اور نصب

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان کذا فی المشکوۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق، الفصل الثالث.

(۲) ابو عبید: کتاب الاموال (۱۳۵۲ھ)، ص ۵۳۱.

العین کو تباہ و برباد کرنے کا باعث بنتی ہیں اور تجارت کے نام سے عام بد حالی اور قابلِ نفرت سرمایہ داری کو فروغ دیتی ہیں، اقتصادی نظام کو برباد کرنے اور اس کو کھوکھلا بنانے میں بد عنوانیوں کی جس قدر بھی تفصیلات و جزئیات ہو سکتی ہیں وہ صرف دو بنیادوں پر قائم ہیں، اسلام نے اپنی اصطلاح میں ان کو دو خصوصی ناموں سے موسوم کیا ہے:

1. احتکار (Hoarding)
2. اکتناز (Concentration)

احتکار سے مراد یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ میں محصور و محدود ہو جائے اور اکتناز کے معنی یہ ہیں کہ دولت کے عظیم الشان خزانے چند افراد کے پاس جمع ہو جائیں اور ان کے پھیلاؤ اور تقسیم (Circulation & Distribution) کی کوئی راہ باقی نہ رہے، اسلام نہ اس کو منظور کرتا ہے اور نہ اس کو، اس لیے وہ ہر معاشی و اقتصادی شعبہ میں ان دونوں کے خلاف قانون سازی کے ذریعے جہاد کرتا اور دونوں ملعون راہوں کو بند کرتا ہے، احتکار کے سلسلہ میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ ہو:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من أحتكر فهو خاطئ وفی روایة المحتكر ملعون.[1]

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقات والمزارعة، باب تحريم الإحتكار فی الأقوات. ابن ماجه: السنن، ج ۲، ابواب التجارات، باب الحكرة والجلب. جامع الترمذی، کتاب البیوع. مشكوة المصابيح، کتاب البیوع، باب الاحتکار. دراصل معاشیات کی دنیا میں احتکار (Hoarding) ایک نہایت ہی مضر اور مکروہ فعل ہے نہ صرف اسلامی معاشیات بلکہ جدید لا دینی معاشیات (Secular Economic) نے بھی اسے اجتماعی مفاد (Social Welfare) کے خلاف قرار دے کر اسے رد کیا ہے۔ مگر اسلام نے روز اول سے اس عمل کو ناجائز قرار دیا اور اس کو بالکل ممنوع قرار دیا۔ اللہ کریم نے قرآن کریم میں محتکر یا ذخیرہ اندوز (Hoarder) کی مذمت کرتے ہوئے ایک پوری سورہ نازل فرمائی آپ بھی تلاوت کر لیں:
﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴿١﴾ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ﴿٢﴾ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ﴿٣﴾ كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿٤﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿٥﴾ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ﴿٦﴾ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى

ٱلْأَفْـِٔدَةِ ۝٧ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ۝٨ فِى عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩ ﴾ (سورة الهمزة (۱۰٤) : ۱، ۹)

ترجمہ: خرابی (عذاب اور ذلت) ہے ہر بہتان طرزا، چغل خور کے لیے (یہ عذاب اور ذلت میں اس شخص کی مانند ہے) جس نے مال (روپیہ اور اشیاء کو) اکٹھا کیا اور اسے شمار کرتا رہا۔ اور وہ (نادان، انسانیت کا دشمن) یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال (ومتاع) اس کو ہمیشہ کی زندگی دے دے گا۔ ہرگز (اس کا گمان پورا) نہیں ہو گا بلکہ (اسے موت آئے گی اور مرنے کے بعد اسے "حطمہ" میں پھینک دیا جائے گا)۔ بھلا تمہیں معلوم بھی ہے کہ "حطمہ" کیا ہے؟ وہ اللہ (عظیم وجلیل) کی دہکائی ہوئی آگ ہے، جس کی گرمی (اور سوزش ان ذخیرہ اندوزوں کے) دلوں تک پہنچ جائے گی۔ پھر یقیناً اسے ان (ذخیرہ اندوزوں) پر بڑے بڑے ستونوں کے ذریعہ بند کر دیا جائے گا (تا کہ اس کی حرارت ٹھنڈی نہ پڑ جائے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکیمانہ ارشادات گرامی میں اس قبیح حرکت کی مذمت فرمائی ہے۔ (حضرت مصنف رحمہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات نقل کیے ہیں چند اور قابل توجہ ہیں) مثلاً:

❶ الجالب مرزوق والمحتكر ملعون. (ابن ماجه: السنن، ابواب التجارات، باب الحكرة والجلب)

ترجمہ: بازار میں سامان لا کر (یا درآمد کر کے) بیچنے والا (اللہ کریم کی طرف سے) رزق دیا جانے والا بنتا ہے مگر ذخیرہ اندوزی کرنے والا لعنتی بنتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

❷ لا يحتكر إلا خاطي. (صحيح مسلم، كتاب البيوع، كتاب المساقاة، والمزارعة، تحريم الاحتكار في الأقوات)

ترجمہ: ذخیرہ اندوزی تو صرف خطا کار کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

ذخیرہ اندوزی کی تہدید آمیز الفاظ میں ممانعت کرتے ہوئے فرمایا:

❸ من احتكر الطعام أربعين ليلة فقد برئ الله منه. (رواه احمد والحاكم وابن ابى شيبه)

ترجمہ: جس نے غلہ (Food Stuff) چالیس رات تک روکے (ذخیرہ کیے) رکھا، اللہ کریم (کی رحمت وشفقت اور وعدہ رزق) کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

یہ وعیدیں اور تہدید آمیز انداز اس حقیقت کا غماز ہیں کہ احتکار انسانیت کی دشمنی ہے۔ یہ انسانوں کو ان کے حق "رزق" سے محروم کرنے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا ذریعہ ہے، دراصل محتکر (ذخیرہ اندوز) کی یہ فطرت ثانیہ بن جاتی ہے کہ وہ بھاؤ چڑھنے پر فرحاں وشاداں اور گرنے پر لرزاں وترساں ہوتا ہے۔ اس کی یہی سوچ اسلام کے کریمانہ نظام میں مذموم اور قابل نفرت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذخیرہ اندوز کی اس مذموم سوچ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

❹ بئس العبد المحتكر إن سمع برخص ساءه، وإن سمع بغلاء فَرِحَ. (رزين بحواله مشكاة المصابيح، باب الاحتكار، الفصل الثالث)

ترجمہ: ذخیرہ اندوزی کرنے والا شخص کتنا برا ہے کہ جب ارزانی ہوتی ہے (جو اللہ کریم کے بندوں کے لیے

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احتکار کرنے والا خطا کار ہے اور ایک جگہ فرمایا کہ اس پر خدا کی پھٹکار ہے۔

"فقہ" میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص "غلہ" وغیرہ کو بہت بڑی مقدار میں اس لیے خریدے کہ بازار گراں ہو جائے اور پبلک میں اس چیز کی مانگ کا "مرکز" صرف وہی بن جائے اور پبلک اس کے مقررہ نرخ پر مجبور ہو جائے اور وہ من مانی گراں فروشی کرے۔

اس احتکار کی مثال کے لیے اس زمانے میں زیادہ کنج و کاؤ کی چنداں ضرورت نہیں ہے مہاجنوں کا وہ گروہ جو کاشت کاروں کو قرض کے نام سے سود پر روپیہ دے کر ان کی کمائی کو "غلہ" کی شکل میں دستبرد کرتا اور ان سے ارزاں نرخ پر خرید کر کھیتوں (غلہ کے خزانوں) میں بھر رکھتا ہے اور اس طرح ارزانی و گرانی کا کفیل بن جاتا ہے، یہ "احتکار" کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اس گروہ کے اس عمل سے کاشتکار اور عوام الناس جس قدر پریشان ہوتے اور بعض موسموں میں اقتصادی بدحالی کے شکار بنتے ہیں اس کا اندازہ ہندوستان کے باشندوں کے سامنے شاہد عدل ہیں۔ سودی لین دین کے بعد اگر کوئی معاملہ عام بدحالی کا باعث ہے تو وہ یہی تجارتی کاروبار ہے جو اجناس و اشیاء کے احتکار کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

قمار یا سٹہ:

"احتکار" کی دوسری جزئی "قمار" ہے اس سے ہماری مراد صرف "جوئے" (Gambleng) کی وہ عام شکل نہیں ہے جو نقد کے ذریعہ کھیلا جاتا ہے بلکہ وہ تمام صورتیں اس میں شامل ہیں جو تجارت کے نام سے کی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں قمار ہی کی قسمیں کہلاتی ہیں، مثلاً "سٹہ" آپ اگر کاروبار سے واقف ہیں تو اندازہ لگا سکتے

موجب خوشی ہے) تو وہ مایوس ہونے لگتا ہے۔ اور جب گرانی ہوتی ہے (جو اللہ کریم کے بندوں کے لیے موجب پریشانی ہے) تو وہ خوش ہوتا ہے۔

ہیں کہ یہ "تجارتی جوا" ملک کے اقتصادی نظام کو کس طرح تباہ اور پراگندہ کرتا ہے اور بغیر محنت نفع حاصل کرنے کے لالچ میں کس طرح ہزاروں گھروں کو خانماں برباد کر کے چھوڑتا ہے، زمانۂ جاہلیت میں اس کی بہت سی شکلیں رائج تھیں، مثلاً ملامسۃ، منابذہ، بیع حصاۃ وغیرہ۔

ملامسۃ کا طریقہ یہ تھا کہ بائع و مشتری کے درمیان یہ طے ہو جاتا تھا کہ بغیر دیکھے اور حقیقت معلوم کیے ہوئے مشتری جس کپڑے یا شے کو چھو دے گا وہ اس کا مالک ہے۔ اور منابذہ میں یہ طے ہوتا تھا کہ جو کپڑا یا شے بائع مشتری کی جانب پھینک دے گا وہ بغیر معاملہ کے مشتری کی چیز سمجھا جائے گا۔ اور بیع حصاۃ یہ ہوتی تھی کہ متعدد اشیاء فروخت کے نام سے رکھ دی جائیں اور لوگ ٹھیکری یا اسی قسم کی کسی شے کو ان کی طرف پھینکیں جس چیز کو وہ ٹھیکری چھو جائے خواہ وہ کسی قیمت کی ہو مشتری کی ملکیت ہو جائے گی، موجودہ دورِ ترقی کے مہذب تجارتی جوئے، لاٹری (Lottery) اور ریس (Race) سب اسی قسم کے معاملات میں داخل ہیں۔

اسلام ان کو "میسر" قمار اور جوا اقرار دیتا ہے اور اس قسم کے تمام معاملات کو باصول تجارت کے لیے تباہ کن سمجھتا ہے اور معاشرتی تباہی کا پیش خیمہ یقین کرتا ہے اور ان باتوں کے علاوہ سوسائٹی کے اخلاق اور کیرکٹر کے لیے باعثِ ذلت و رسوائی جانتا ہے۔

کیونکہ یہ معاملات اکثر جنگ و جدل کا باعث بنتے ہیں، مواساۃ، رواداری، ہمدردی اور مروت کو تباہ اور دوسرے کی تباہی میں اپنا فائدہ سمجھنے کی ترغیب دے کر انسانی جوہر کو برباد کرتے ہیں۔ (اسی لیے شریعت اسلامیہ اور اسلام کے عادلانہ معاشی نظام نے ان تمام مضر اشکال کی نفی فرمائی ہے اور اپنے پیرو کاروں کو ان سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ ارشاد باری ہے):

❶ ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ

كَبِيرٌ ﴾[1]

ترجمہ: (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وہ آپ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے: ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔

❷ ﴿إِنَّمَا ٱلۡخَمۡرُ وَٱلۡمَيۡسِرُ وَٱلۡأَنصَابُ وَٱلۡأَزۡلَٰمُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ ٱلشَّيۡطَٰنِ فَٱجۡتَنِبُوهُ ﴾[2]

ترجمہ: بلاشبہ شراب جوا، بت پانسے یا سب سرتاسر نجاست ہیں اور کارِ شیطان ہیں، پس تم ان سے بچو۔

❸ ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيۡطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيۡنَكُمُ ٱلۡعَدَٰوَةَ وَٱلۡبَغۡضَآءَ فِي ٱلۡخَمۡرِ وَٱلۡمَيۡسِرِ وَيَصُدَّكُمۡ عَن ذِكۡرِ ٱللَّهِ وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِۖ فَهَلۡ أَنتُم مُّنتَهُونَ ۝٩١﴾[3]

ترجمہ: بلاشبہ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کی راہ سے تمہارے درمیان بغض و عداوت قائم کر دے اور تم کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پس کیا تم ان برائیوں سے باز رہو گے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمہ اللہ)[4] اس قسم کے معاملات قمار کی مضرت کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور بساطِ ارض پر ان کی معاش کا انتظام فرمایا اور اس سے نفع حاصل کرنے کا ان کو موقع بہم پہنچایا تو انسانوں کے درمیان جنگ و جدل اور کشمکش بپا ہوئی۔ تب خدا تعالیٰ کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی محنت، وراثت یا دوسرے کسی جائز

---

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۲۱۹

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۹۰

(۳) سورۃ المائدۃ (۵): ۹۱

(۴) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

اور صحیح طریق سے کسی چیز کا مالک ہے اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کشمکش کا حقدار نہیں ہے۔ البتہ دوسرے کو بدل (Substitue or Compensation) کے ذریعے خریداری اور معتبر و صحیح رضا مندی کے ساتھ معاملت (Dealing) سے اس چیز کو حاصل کرنے کا حق ہے بشرطیکہ خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم و یقین ہو اور فریب چالبازی اور دغل فصل (Hush- Hush Corruption) کا اس میں ہرگز کوئی شائبہ نہ ہو اور جبکہ انسان مدنی الطبع (Social Being) ہے اور اس کی معیشت باہمی تعاون کے بغیر ناممکن ہے تو حق تعالیٰ نے باہمی تعاون و معاونت کو بھی ضروری قرار دیا ہے، پس اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود ہو اور نہ باہمی تعاون پایا جاتا ہو بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا متصور ہو جیسے ''قمار'' یا اس میں صحیح رضامندی موجود نہ ہو جیسے سود۔ تو یہ تمام طریقے باطل اور ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں۔''(۱)

بہرحال اسلام کے اقتصادی نظام میں اس قسم کے تمام تجارتی کاروبار کے لیے مطلق کوئی جگہ نہیں ہے جو یا صریح ''قمار'' ہوں اور یا ان کی تہہ میں مالی ترقی کا وہی جذبہ کارفرما ہو جو ''قمار'' میں پایا جاتا ہے اور اگر علم الاقتصاد اور علم الاخلاق دونوں کے ماہرین سے اس بارہ میں دریافت کیا جائے تو بغیر کسی اختلاف کے وہ بھی یہی رائے دیں گے بلکہ رائے دے چکے ہیں کہ ''قمار'' کی قسم کے تمام معاملات اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کے لیے تباہ کن ہیں۔(۲)

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ قاہرۃ، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق، ص ۱۰۳

(۲) محمد فرید وجدی: دائرۃ المعارف القرن العشرین، نصف دوم، ج ۷، مطبوعہ حیدر آباد (ہند)، ص ۹۴۳، ۹۴۴

باب ـــــــ ⑩

سود اور بنکاری

احتکار (Hoarding) کی سب سے معلوم قسم ''سودی لین دین'' ہے جس اقتصادی نظام میں اس کا عمل دخل ہے وہ یکسر برباد و تباہ ہے۔ یہ کروڑوں انسانوں کو مفلس و محتاج بنا کر ایک مخصوص طبقہ میں دولت سمیٹتا اور ان کو اس کا واحد اجارہ دار (Menoplist) بنا دیتا ہے۔

تاریخ انسانی کے دو نظریئے

ابتداءِ عالم انسانی سے دو نظریے کار فرما رہے ہیں: ایک ''عادلانہ نظام کار کا نظریہ'' دوسرا ''سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ''

عادلانہ نظام کا نظریہ:

پہلے نظریہ کا یہ مطالبہ ہے کہ انسانوں میں ایک ایسا اجتماعی نظام (Social Order) قائم ہو جس میں نہ بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں اور نہ مفلس و محتاج طبقے، بلکہ ایک درمیانی حالت ہو جس میں معیشت کے درجات کا فطری تفاوت (Natural Gap) اگرچہ موجود ہو لیکن حقِ معیشت کی مساوات ضرور قائم رہے، وہ اس کا طالب نہیں ہے کہ سب کی معیشت کے سامان ایک ہی طرح کے ہوں لیکن اس کا ضرور خواہش مند ہے کہ سب کو حسبِ ضرورت ملے اور ترقی و سعی کی راہیں سب پر یکساں طور پر کھلی ہوں۔ حق اور خدا کے فرستادہ سچے مذاہب ہمیشہ اسی نظریئے کے داعی رہے ہیں اور اسلام نے اس نظریہ کو کامل اور مکمل نقشہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ:

دوسرے نظریہ کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیا کے کارخانے میں قدرت کے ہاتھوں نے انسانی مخلوق کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے کچھ خدائی اور آقائی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور کچھ بندگی اور محکومی کے لیے۔ اسی طرح قدرت کا یہ منشاء ہے کہ بعض انسانی گروہ دولت و ثروت کے مستقل اجارہ دار ہوں، جائز و ناجائز طریقوں سے دولت کو فراہم کریں اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص کر لیں۔ اور بعض طبقے مفلس، محتاج، دریوزہ گر (Beggars) اور نان جویں سے ہمیشہ مجبور و مقہور (Forced & Coerced) ہیں اور تفاوتِ درجات کے اس ہولناک فرق (Un-Natural Gap) کو اعتدال پر لانے کا کسی کو بھی حق نہ ہو، یہ نظریہ طاغوتیوں اور آدم رو شیاطین کا ہے اور ان کے اس نظریہ کی عملی کامیابی کی سب سے بڑی بناء یہی مہاجنی سود (Usury) ہے جو مہذب اور غیر مہذب شکلوں میں بڑے بڑے گروہوں اور جماعتوں کا خون چوس چوس کر ایک چھوٹی جماعت کو قارون کا خزانہ بخشتا ہے اور خدا تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک کو دوسرے کا محکوم بناتا ہے، بہرحال "سود" ملعون سرمایہ داری کے لیے ہمیشہ سے بہت بڑا پشت پناہ رہا ہے۔

اسلام کی دعوت کا مرکز اولین "عرب" بھی اس لعنت میں گرفتار تھا اور مشرکین عرب "تجارت" اور "سود" میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے اور ہندوستان کے مہاجنوں اور دنیا کے سود خوار یہودی گروہوں کی طرح وہ بھی اس لین دین کو اپنی فرزانگی اور بیدار مغزی کا ہنر جانتے تھے (اور اس کاروبار کی حمایت میں جو دلیل دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم اسے یوں بیان فرماتا ہے):

﴿قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلۡبَيۡعُ مِثۡلُ ٱلرِّبَوٰاْۗ﴾ (۱)

ترجمہ: وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار اسی طرح کی چیز

(۱) القرآن الکریم، سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۵

ہے جیسا سود کا لین دین ہے۔

گویا ان کی نگاہ میں "سود" کا کاروبار ایسا صحیح کاروبار تھا کہ وہ بیع و شرا اور تجارتی لین دین کے جواز کے لیے اس کو دلیل بناتے تھے چہ جائیکہ اس کو ناجائز اور حرام سمجھتے یا معذرت کے طور پر یہ کہتے کہ جس طرح تجارت درست ہے اسی طرح سودی لین دین بھی کیوں درست نہ ہو، اگر آج بھی سود خوار جماعتوں سے سود کے جواز میں دلیل طلب کرو گے تو ساڑھے تیرہ (چودہ) سو برس کے بعد ان کا بھی وہی جواب ہو گا جو ان کے پیشرووں نے دیا تھا۔

ربوا یا سود کی حقیقت

"ربوا" کے لغوی معنی کسی شے کے بڑھنے یا زیادہ ہونے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی شے کے مطلق بڑھنے زیادہ ہونے کو "اصطلاحی ربوا" (Termimological Interest) نہیں کہہ سکتے اور نہ اس پر حرمت کا اطلاق جائز ہو سکتا ہے بلکہ ربوا مال میں ایک خاص قسم کے نفع یا زیادت[1] (اضافہ) کا نام ہے جو کاروباری دنیا کی نگاہ میں بیع و

(۱) ربا ایک ایسی تعریف جس پر تمام مکاتب فکر (All Schools of Thought) کے فقہاء کرام کا اجماع (Consensus of Opinon) ہے۔ وہ علامہ ابن عبد البر (م ۴۶۳ھ) کے الفاظ میں اس طرح ہے:

وقد أجمع المسلمون نقلا عن نبيهم أن اشتراط الزيادة في السلف ربا ولو كان علف أو حبة. (ابن عبدالبر، حافظ ابن عبدالبر المالكي الاندلسي، التمهيد، مطبوعه لاهور ١٩٨٣ء: ٦٨/٤)

ترجمہ: مسلمانوں نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی بنا پر اجماع کر لیا ہے کہ ادھار کے اصل زر (Capital) پر اضافہ (یا زیادتی) کی شرط عائد کرنا سود ہے، اگرچہ یہ اضافہ (کم از کم یعنی) ایک مٹھی گھاس یا ایک دانا ہی ہو۔

اس سے ملتی جلتی بات امام ابو بکر الجصاص رحمہ اللہ (م ۳۷۰ھ) نے کی، لکھتے ہیں:

وهو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة على المقترض. (احكام القرآن، ج ١ مطبوعه مصر، ١٣٤٧ھ، ص ٤٢٩)

ترجمہ: سود قرض کا وہ معاملہ ہوتا ہے، جس میں مدت مقرر کی جاتی ہے، اور قرض لینے والے پر (اصل زر پر) زیادتی کی شرط لگائی جاتی ہے۔

شرا کی طرح ایک جائز معاملہ سمجھا جاتا تھا، مگر اسلام نے کائناتِ انسانی کی فلاح و بہبود اور نظامِ معیشت میں رفعتِ اخلاق اور باہمی اخوت و مساوات کی بقاء کی خاطر حرام قرار دیا ہے اور نہ صرف ان ہی خاص شکلوں کی ممانعت کی ہے جو دعوتِ اسلام سے قبل جاری تھیں بلکہ اپنی جانب سے ایسے اصول بیان کیے جن کے زیر اثر قرض اور بیع و شراء دونوں میں شائبہ سود و ربوا کا کلیۃ انسداد کر دیا تاکہ اسلام کا معاشی نظامِ ربوا اور شائبہ دونوں سے پاک اور بالاتر ہو جائے، کیونکہ اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں اہل عرب ربوا یا سود کو صرف قرض ہی کے اندر محدود سمجھتے تھے، اور بیع و شرا یا تجارتی کاروبار کو غیر مشروط طور پر جائز قرار دیتے تھے، اس لیۓ جب ان کے سامنے اسلام کا نظریہ "حرمت سود" آیا تو کفارِ عرب نے فوراً کہہ دیا کہ بیع (خرید و فروخت) جس سے نفع کی توقع کی جاتی ہے، بھی سود ہی طرح کا ایک معاملہ ہے۔ پس اگر نفع و زیادت سود کو حرام قرار دیتی ہے تو بیع و شرا کو بھی حرام ہونا چاہیے ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ قرض کے سوا کاروبارِ تجارت میں بھی ربوا (سود) کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔

غرض اسلام کے معاشی نظام میں "اصطلاحی ربوا" (Termenalogical Interest) کا اطلاق مروجہ مہاجنی سود (Usury) سے زیادہ وسیع اور معاملۂ قرض اور معاملۂ تجارت دونوں سے وابستہ ہے۔

مہاجنی سود (Usury)

ابھی ذکر ہو چکا کہ اہل عرب قرض اور دَین کے ذریعہ جو نفع کماتے تھے اس کو ربوا یا سود سمجھتے تھے اور اس کے جواز کے قائل تھے اور یہ وہی معاملہ ربوا تھا جس کو آج "مہاجنی سود" سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ آج کی طرح مشرکین عرب میں بھی اس لین دین کے مختلف طریقے رائج عاملہ ربوا تھا جس کو آج "مہاجنی سود" سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ آج کی طرح مشرکین عرب میں بھی اس لین دین کے مختلف طریقے رائج تھے۔

❶ ایک طریقہ یہ تھا کہ صاحب ضرورت کو نقد روپیہ قرض دیتے اور ایک مدت معین کر کے فی روپیہ کچھ مقدار سود کی لگاتے تھے۔

❷ دوسری صورت یہ تھی کہ جب معین مدت ختم ہو جاتی تو سود اور اصل قرض (Capital) کو ملا کر اپنی اصل رقم (Capital) قرار دیتے اور پھر اس مجموعہ پر سود شروع کر دیتے، اسی کا نام سود در سود ہے۔

❸ زیور ہتھیار یا اسی قسم کی اشیاء رہن (Pledge) رکھتے اور ان کے عوض قرار دیتے اور اگر معین مدت میں قرض دار قرض ادا نہ کرتا تو روپیہ پر سود لگاتے اور اشیاء کی قیمت کم سے کم قرار دے کر ان کو ہضم کر جاتے۔[1] فقہاء کی اصطلاح میں اس کو ''ربا نسیہ'' کہا جاتا ہے۔

ممانعتِ سود قرآن کریم میں:

اسلام نے سودی کاروبار کی ان تمام اقسام کو حرام قرار دیا اور بے محنت کی اس کمائی کو ظلم و سحت سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ قرآن عزیز نے جس خوبصورت سے اس کی حرمت اور دلائل حرمت کو ادا کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔

❶ ﴿لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوٰٓا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً﴾[2]

ترجمہ: مسلمانو! تم سود در سود (Compound Interest) کو ذریعہ معاش ہرگز نہ بناؤ۔

اور صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا:

❷ ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوٰا﴾[3]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تجارتی خرید و فروخت کو جائز کیا ہے اور سود کو ہر حیثیت سے حرام قرار دیا ہے۔

---

(۱) جصاص ابو بکر: احکام القرآن، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۷ھ، ۵۵۱/۲

(۲) سورۃ آل عمران (۳): ۱۳۰

(۳) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۵

اور حرمت سود کے اعلان کے ساتھ ساتھ گذشتہ واجب الادا سودی رقوم کے متعلق بھی یہ بتادیا کہ اب تک جو کچھ کر چکے ہو وہ کر چکے مگر حرمتِ سود کے بعد اب قرض داروں پر جو سود رہ گیا ہے اس کو چھوڑو اور ہرگز نہ لو اور نہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ مول لو۔

۳ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَذَرُوا۟ مَا بَقِىَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓا۟ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ﴾[1]

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر واقعی تم مسلمان ہو تو (سود کی حرمت کے بعد) جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس سے درگزر کرو اور اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کا اعلان قبول کرو۔

اور اگر باز آجاؤ اور اس "بد کرداری" سے توبہ کر لو تو تمہارا اصل سرمایہ بہرحال واجب الادا ہے۔

۴ ﴿وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾﴾[2]

ترجمہ: اور اگر تم باز آجاؤ تو تمہارا اصل سرمایہ دلایا جائے گا (اللہ کی مرضی یہ ہے کہ) نہ تم لوگوں پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اور یہ سب اس لیے ہے کہ:

۵ ﴿يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰا۟ وَيُرْبِى ٱلصَّدَقَٰتِ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾[3]

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۸

(۲) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۸، ۲۷۹

(۳) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۶

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کافر بدکار کو کسی طرح پسند نہیں کرتا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق یہ آخری حد ہے کہ سود کو کفر میں شامل کیا گیا ہے۔

سود کے نقصانات:

(الف) معاشی نقصانات:

﴿وَمَآ ءَاتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِىٓ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ فَلَا يَرْبُوا۟ عِندَ ٱللَّهِ ۖ﴾[1]

ترجمہ: اور جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مالوں میں ترقی ہو تو وہ اللہ کے نزدیک ترقی نہیں پاتا (یعنی پاداش عمل کے قانون کے مطابق آخری نتیجہ گھاٹا اور نقصان ہے۔

گویا تمہاری نگاہوں میں اگرچہ سود سے مال میں ترقی ہو رہی ہے لیکن دنیا میں اس شخص کو عداوتوں کی کثرت اور مال کی بہتات کی وجہ سے دلی بے اطمینانی و بے چینی اور "هَلْ مِنْ مَّزِيْد" (Is there any more to Come?) کی مجنونانہ خواہش کی بدولت "سود" سے فائدہ کے مقابلہ میں نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس تو اس کے لیے نقصان ہی نقصان ہے اور صدقات میں اس کے برعکس ہے، یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ حرمتِ سود کا حکم دے کر سود کو مٹانا چاہتا ہے، اور صدقات کی ترغیب دے کر ان کی نشو ونما کرتا اور لوگوں میں ان کو عام کرنا چاہتا ہے لیکن ان تمام ہدایات واحکام کے باوجود جو شخص (اس ملعون عمل سے) باز نہیں رہتا، اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ "بداخلاقی" کے اس تاریک غار میں گر گیا ہے جہاں وہ انسانیت کی شمع فروزاں اور اس کی شعاعوں سے یکسر محروم ہے اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ سود خوار اپنے اس عمل سے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کے

---

(۱) سورۃ الروم (۳۰): ۳۹

لیے چیلنج کر رہا ہے اور اپنی دائمی بدبختی (Ever Wretching) اور خسران مبین (Evident Loss) پر مہر لگا رہا ہے۔ "فأذنوا بحرب من اللہ و رسولہ"

تم صفحۂ عالم پر مٹے ہوئے اس نقش کو ذرا غور سے دیکھو جو سامنے ایک خش پوش جھونپڑی میں نظر آرہا ہے یہ ایک غریب و نادار بیوہ کا مسکن ہے جس کے پاس دو یتیم و بیکس معصوم بچے شوہر کی زندہ یادگار ہیں، پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کچھ کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے چند برتن اس گھر کے کل کائنات ہیں۔ بچے بلک رہے ہیں، بیوہ آہ و زاری کے ساتھ گڑگڑا رہی ہے مگر کچہری کا سپاہی وارنٹ قرقی (Inhibition) ہاتھ میں لیے زبان کی گالیوں اور کبھی کبھی ہاتھ کے دھکوں اور مکوں سے بیوہ کی تواضع کرتے ہوئے اپنی سرکاری ڈیوٹی میں مشغول ہے، تھوڑے فاصلہ پر "زرق برق کار" میں ایک سفید پوش مہاجن ہنس ہنس کر یہ منظر دیکھ رہا ہے اور بار بار جوش میں آکر منیب جی سے کہتا جاتا ہے، دیکھو تو کس بے حیائی سے دوسرے کا مال مارنے کے لیے سوانگ بنا رہی ہے کہ میرے بچے بھوکوں مر جائیں گے للہ رحم کرو، ان یتیموں پر رحم کرو، ان کا کوئی والی وارث نہیں، جب جھونپڑی اور یہ ٹوٹا پھوٹا سامان بھی نہ رہے گا تو ان بیکسوں کا کیا حال ہو گا؟ جس روز شوہر کو پچیس روپے قرض لینے بھیجا تھا اس دن خیال نہیں آیا تھا کہ کسی کا دینا بھی پڑے گا، منیب جی سود اور سود در سود کے حساب سے پورے چار سو روپے بیٹھتے ہیں، میں نے اکٹھے سو روپے چھوڑ دیئے، مگر یہ بے حیا تو دینا ہی نہیں چاہتی، اب اس سے زیادہ اور کیا "دیا" ہو سکتی ہے، نا صاحب میں اپنی محنت کی کمائی اگر اس طرح چھوڑ دیا کروں تو ایک دن خاک ہی چھاننی پڑے۔

آخر جھونپڑی نیلام ہو گئی، برتن کپڑے قرق ہو گئے اور بیوہ اور بیوہ کے بچے روتے پیٹتے گھر سے بے دخل کر دیئے گئے۔

سود خوار کی زندگی کا یہ وہ معمولی سا تماشا ہے جو حکایات و قصص کی کتابوں میں نہیں بلکہ دنیا کے اسٹیج پر روزانہ واقعات کی شکل میں کھیلا جاتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی نقصانات:

دراصل سود خوار انسان روپیہ اور دولت کے خمار میں ایسا بد مست ہوتا ہے کہ وہ انسانی اخلاقی مروت، ہمدردی، بلکہ انسانیت کو بے معنی اور مہمل الفاظ سمجھنے لگتا ہے، اور خود غرضی، حرص و طمع اور دوسروں کو برباد کر کے اپنے مفاد کا حصول اس کی زندگی کا نصب العین بن جاتے ہیں، وہ ہر وقت اسی تگ و دو میں پاگل کتے کی طرح مجنون و مخبوط (Insane & Mad) پھرتا رہتا ہے اور مظلوموں اور بے کسوں کی فریاد و حالتِ زار سے اندھا، بہرا اور گونگا بن جاتا ہے، قرآنِ عزیز نے اسی لیے پاداشِ عمل کے قدرتی نتیجہ سے ڈراتے ہوئے عالمِ آخرت میں اس کی اصل کیفیت و حالت کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے۔

﴿ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْبَيْعُ مِثْلُ ٱلرِّبَوٰاْ ۗ﴾ (۱)

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (آخرت میں خدا کے حضور) ایسی حالت میں کھڑے ہوں گے کہ گویا ان کو بھوت پریت لپٹ گیا ہے اور وہ خبطی ہو گئے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود کے معاملہ ہی کی طرح ہے۔

تجارت اور سود میں فرق:

❶ عن جابر رضی اللہ تعالٰی عنه، قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اکل الربو ومؤکله وکاتبه و شاهدیه. قال: هم سواء. (۲)

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۵

(۲) مسلم بن حجاج القشیری: صحیح، ج ۲، باب الربو. نووی: ریاض الصالحین، باب

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خوار، سود دینے والے، سودی دستاویز لکھنے والے اور گواہی دینے والوں پر لعنت کی ہے، اور فرمایا: خدا کی پھٹکار میں یہ سب برابر ہیں۔

❷ عن فضالة بن عبيد — رضی اللّٰه تعالٰی عنه. — صاحب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم أنه قال: کل قرض جرّ منفعة فهو وجه من وجوه الربا.[1]

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو قرض بھی نفع کھینچتا ہے، وہ سود ہی کی اقسام میں سے ہے۔

مشرکین عرب نے اپنے خیال میں حلتِ ربوا کے لیے بہتر سے بہتر دلیل یہ بیان کی کہ ربوا اگر قدر زائد کی وجہ سے حرام ہے تو پھر بیع کیوں حلال ہے جبکہ کسی نہ کسی شکل میں نفع (قدرِ زائد) یہاں بھی موجود ہے۔ قرآن عزیز نے اپنے معجزانہ اسلوب کے ساتھ اس کا رد کرتے ہوئے کہا ﴿وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ﴾

تغليظ تحريم الربا. ترمذی: الجامع، ج ۱، کتاب البيوع، باب ماجاء فی أكل الربو عن عبداللّٰه بن مسعود رضی اللّٰه تعالٰی عنهما

(۱) امام بیهقی: السنن الکبری مطبوعه دکن، ج ۳، کتاب البیوع، باب کل قرض جر منفعة، ص ۳۵۰

(۲) حضرت فضالہ بن عبید انصاری اوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ صلح حدیبیہ کے سال ایمان لائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف تمام غزوات میں —— سوائے غزوہ بدر کے —— پایا۔ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ خلافت میں جہاد شام و مصر میں شریک رہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں امیر لشکر، پھر دمشق کے قاضی رہے۔ ایک بار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قائم مقام بن کر دمشق میں رہے۔ اکثر روایات کے مطابق ۵۳ھ میں وفات پائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے جنازہ کو اٹھایا (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)۔ (دیکھئے: ولی الدین خطیب رحمه اللّٰه تعالٰی: الكمال فی اسماء الرجال، تذکرہ حضرت فضالة رضی اللّٰه تعالٰی عنه)

یعنی تم دیکھتے ہو کہ تمام معاملات میں بیع (خرید و فروخت) میں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، جانبین (بائع و مشتری کے مابین) اصول کار فرما ہیں۔

❶ دونوں جانب سے ارادی رضا و رغبت۔

❷ باہم تعاون و اشتراک۔

❸ دونوں کے لیے منفعت کا حصول۔

اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں اصول قانون، اخلاق اور علم المعیشت کی نگاہ میں صحیح اور درست ہیں اس سے بہتر تعاون و اشتراک باہمی مواساۃ اور حسن سلوک جیسے فضائل کے حامل ہیں جو انسان کی انسانیت کا طغرائے امتیاز ہیں اور ''ربوا'' میں ان کے برعکس تین اصول جاری ہیں:

❶ ایک جانب میں رضا و رغبت اور دوسری جانب میں اضطرار و اکراہ۔

❷ باہمی تعاون و اشتراک کا فقدان بلکہ کاروبارِ ترقی کے لیے دوسرے کے اضطرار و افلاس کا انتظار۔

❸ ایک کے یقینی ضرر و نقصان پر دوسرے کے نفع کا مدار۔

پس اللہ تعالیٰ کہ جس کی صفاتِ کمالیہ ''رب العالمین'' ''الرحمٰن الرحیم'' ہیں اور جس کی رحمت عام اور ربوبیت تام تمام کائنات انسانی پر محیط ہے وہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس کی باعقل مخلوق انسان باہمی محبت و مساوات اور تعاون و اشتراک چھوڑ کر خونخوار درندوں کی طرح ایک دوسرے کا خون چوسنے پر آمادہ ہو جائے اس لیے اس نے بیع کو تو ''حلال'' اور ربوا کو ''حرام'' قرار دیا۔

غرض انسان کے وضع کردہ قوانین اور خدا کے فرمودہ احکام میں یہ بین فرق ہے کہ عام طور پر واضعین قوانین (Laws Givers) کے رجحانات پبلک کے رجحانات کے تابع ہوتے ہیں، کیونکہ وہ پبلک کے نمائندہ کہلاتے ہیں اور چونکہ ان کی عقل بہرحال محدود ہوتی ہے اس لیے وہ ان دور رس نتائج و ثمرات سے اس وقت تک کما حقہ واقف نہیں ہو سکتے جب تک تجربہ یا پبلک کا احتجاج اس کی موافقت یا مخالفت

نہیں کرتے، چنانچہ ربوا کے جواز کا مسئلہ بھی ایک کڑی ہے اس لیے کہ انسان کی حیوانی خواہشات میں سے ایک خواہش طلبِ زر (Demand of Money) بھی ہے اور اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کی یہ خواہش کسی غایت یا قید و بند کو برداشت نہیں کرتی، پس تمام دنیوی حکومتیں اور ان کے واضعین قوانین اپنے اپنے ماحول کے رجحانات کے مطابق "ربوا کے جواز" کے لیے قوانین بناتے رہتے ہیں اور اگرچہ وہ اس سلسلہ میں کچھ تحدید و تقیید (Limitation and Restriction) بھی کرتے جاتے ہیں، مگر عملاً ربوی معاشرتی نظام بے قید ہو کر افلاسِ عام اور کساد بازار پر منتج ہوتا اور ایک مخصوص طبقہ میں دولت کی اجارہ داری قائم کر دیتا ہے۔

اس کے برعکس قانونِ الٰہی چونکہ انسانی دسترس سے بالاتر خالقِ کائنات کی جانب سے آتا ہے جو مخلوق کے نفع و ضرر کا حقیقی علیم و خبیر ہے اس لیے وہ حیوانی اوصاف سے پاک اور برتر رہ کر اس حیوانی خواہش کے خلاف فیصلہ صادر کرتا اور "ربوی معاشی نظام" کو حرام ٹھہراتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کے بنائے قوانین کی طرح ان کی بے قید خواہشات کے زیر اثر نہیں ہوتا بلکہ حقیقی مصالح عامہ اور فلاحِ عام پر مبنی ہوتا ہے۔

تجارتی سود (CommercialInterest)

مہاجرنی سود کے علاوہ اسلام کے اقتصادی نظام میں صاحب شریعت نے یہ اور اضافہ کیا ہے کہ نہ صرف قرض و دین میں بلکہ تجارتی کاروبار کی بعض اقسام میں بھی سود (ربوا) پایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر سکہ کی بجائے جنس کا جنس کے ساتھ تبادلہ مقصود ہے تو ایسی صورت میں مسطورہ ذیل ہر دو اصول کی پابندی ضروری ہے، ورنہ یہ معاملہ ربوا (سود) میں شامل ہو کر حلال سے حرام کی جانب منتقل ہو جائے گا۔

(الف) اگر ہر دو جانب خرید و فروخت کی شے ہم جنس ہے یعنی سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے (اسی طرح) گیہوں، جو، نمک، کشمش، منقہ وغیرہ اشیاء کا ہم

جنس شے سے بیع و شرا مطلوب ہے تو کھوٹے اور کھرے، منقوش و غیر منقوش (Signed & Un- Signed) کم قیمت و بیش قیمت، عمدہ اور ردی کا لحاظ کیے بغیر دونوں جانب ناپ تول میں مساوات (Equality) بھی واجب ہے اور نقد خریداری بھی واجب وضروری، نہ کمی بیشی درست ہے اور نہ ادھار جائز ہے۔

(ب) اگر جانبین میں ہم جنس شے نہیں ہے یعنی سونے کا چاندی سے یا چاندی کا سونے سے، گیہوں کا جو سے جو کا گیہوں سے وغیرہ وغیرہ تبادلہ مقصود ہے تو ایسی حالت میں کمی و بیشی تو درست ہے مگر ادھار جائز نہیں ہے بلکہ واجب ہے کہ عقدِ بیع کے وقت دونوں جانب سے معاملہ بصورتِ نقد عمل میں آئے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بصراحت ارشاد فرمایا ہے:

عن عبادة بن الصامت رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعیر بالشعیر، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء یدا بید. فاذا اختلف هذه الأصناف، فبیعوا کیف شئتم إذا کان یداً بید.[1]

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت[2] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے

---

(۱) متفق علیه، کتاب البیوع، الشوکانی: نیل الاوطار، ج ۵، کتاب البیوع، باب ما یجری فیه الربا. مسلم: الصحیح، ج ۲، کتاب البیوع، باب الربوا. امام ترمذی: الجامع، ج ۱، ابواب البیوع، باب ماجاء ان الحنطة بالحنطة مثلا بمثل وباب ماجاء فی الصرف. ابن ماجه: السنن، ج ۲، ابواب التجارات، باب بیع الصرف وما لا یجوز متفاضلا یدا بید. یہ حدیث صحاح ستہ اور دیگر مجموعات احادیث میں باب البیوع، باب الربا وغیرہ کے تحت درج ہے۔

(۲) حضرت عبادہ بن صامت بن قیس ابو الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سعادت مند ستر (۷۰) انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں شامل تھے جنہوں نے حج کے موسم میں عقبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف بیعت پایا اور ان بارہ نقباء کرام میں شامل تھے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلیان مدینہ منورہ کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ آپ طویل القامت نہایت خوبصورت انسان تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہے۔

=

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سونے کا تبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جو کا جو سے اور خرما کا خرما سے اور نمک کا نمک سے یکساں برابر برابر درست بدست ہونا چاہیے (یعنی ناپ تول میں بھی مساوی ہوں اور ادھار بھی نہ ہوں) اور اگر ان اقسام کا تبادلہ ہم جنس قسم کے ساتھ نہ ہو تو کمی بیشی کے ساتھ جس طرح چاہو معاملہ کرو لیکن معاملہ ادھار کا نہ ہو بلکہ دست بدست ہونا ضروری ہے۔"

یہ حدیث جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے اور اصطلاحِ حدیث میں مشہور بلکہ تواتر [1] کا درجہ رکھتی ہے۔ مجتہدینِ امت نے اس حدیث صحیح کو

بڑی شان کے صحابی تھے، متقی، عابد، محدث اور فقیہ تھے۔ آپ مسجد نبوی میں اصحاب صفہ —— جن کی تعداد چار سو (۴۰۰) اور سات سو (۷۰۰) کے درمیان تھی —— کو قرآن کی تدریس اور لکھائی سکھانے پر مقرر کیے گئے۔ (دیکھئے: عبدالحی کتانی: التراتیب الاداریة: ۱/۳۴۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو صدقات کی وصولی کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ (ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی تحریم منع الصدقة الخ)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں شام میں معلم قرآن و حدیث بن کر تشریف لے گئے، پھر انہیں شام کا قاضی (جج) مقرر کیا گیا۔ آپ نے اسلامی فتوحات میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ شام کی فتوحات میں سالار سپاہ اسلام حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آپ ہمراہ تھے۔ حمص کی فتح کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا کنٹرول آپ کے سپرد کیا تھا۔ مصر کے محاذ پر اسکندریہ کی فتح کے دن آپ کو (صرف اللہ کریم کی رحمت و نصرت کے حصول کے لیے) اعزازی سالار بنا کر حملہ کیا گیا اور اللہ کریم نے مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار فرمایا۔ آپ نے ۳۴ھ میں رملۃ (موجودہ فلسطین) میں ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (دیکھیں: اسد الغابة، تذکرہ عبادة بن الصامت رضی اللّٰہ تعالٰی عنه. ابن سعد: طبقات، ج ۳، تذکرہ عبادة بن الصامت رضی اللّٰہ تعالٰی عنه —— شبلی نعمانی: الفاروق، واقعات فتح حمص، اسکندریہ)

(۱) مشہور اور متواتر (Mushhur & Mutawatir) روایت حدیث کی دو قسمیں ہیں:

❶ متواتر (Continuous) ایسی روایت (حدیث) کو کہتے ہیں جس کے راویوں (Narrators) کی تعداد آغاز روایتِ حدیث سے آخر تک (ہر دور میں) اتنی زیادہ رہی ہو کہ ان کا کسی جھوٹی خبر (بات) کے پھیلانے پر اتفاق غیر یقینی ہو۔ محدثین کے نزدیک حدیث متواتر کا تواتر (Continuity) (Tawatur) لفظی (Verbal) اور معنوی

تجارتی کاروبار میں ربو (سود) سے متعلق "اساس" (Base) قرار دیا ہے اور اپنے اجتہاد سے ان وجوہ کی تحقیق و تفتیش کی ہے جن کا وجود اس قسم کے معاملات میں حدیث کی بیان کردہ شرائط کی خلاف ورزی سے ربوا (سود) کا باعث بن جاتا ہے۔[1] فقہاء اس کو ربوا الفضل سے تعبیر کرتے ہیں۔

حرمتِ سود کی عالمگیریت:

حدیث ربوا ایک اور حقیقت کا بھی اعلان کرتی ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "اسلام کے معاشی نظام" کو وطنی اور ملکی عصبیت سے بالا تر بین الاقوامی اخوت و مواسات پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وحدتِ اسلامی کا پیغامِ حق اس راہ سے بھی بروئے کار آسکے کیونکہ عام طریقۂ بیع و شرا میں اگرچہ کوئی شخص چاندی کو چاندی کے اور سونے کو سونے کے عوض نہیں خریدتا، لیکن علمائے اقتصادیات کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ دورِ حاضر میں تبادلہ سکہ جات (Exchange) کا جو سسٹم جاری ہے وہ اسی ربوا کی ایک قسم ہے جس میں تبادلہ کے وقت دو ملکوں کے درمیان چاندی کے یا سونے کے ہم جنس سکوں میں بھی بٹاون کے نام سے کمی بیشی کا اصول قائم ہے اور ظاہر ہے کہ "ایکسچینج پالیسی" ایک ایسا فاسد طریق کار ہے جس کے ذریعہ دو ملکوں یا دو قوموں کے درمیان "معاشی دستبرد" (Economic Exploitation)

(Meaning) دونوں اعتبار سے ہو یعنی نہ کسی دور میں اس حدیث کے الفاظ کی روایت میں راویوں کا اختلاف رہا ہو نہ اس کے معنی میں کہیں اختلاف ہوا ہو۔

❷ مشہور (Well- Known) ایسی حدیث کو کہتے ہیں جس کی راویوں کی تعداد ابتدا یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ میں حدیث متواتر کے برابر نہ ہو مگر تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ (Tabiein) (Followers, Successors or Stundents of the Compenions of the Holy Prophet صلی اللہ علیہ وسلم) اور تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ (Followers or Successors or Students of the Successors of the Compenions رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے دور (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بعد دوسری اور تیسری نسل میں ان کی تعداد زیادہ ہو اور وہ آخر تک قائم رہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے اصول فقہ پر مدونہ کتابیں، بالخصوص ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے رسالہ "نخبۃ الفکر" کا مطالعہ انتہائی مفید ہو گا)

(۱) ملاحظہ ہوں کتب فقہ واصول فقہ

کی راہ کھلتی ہے، پس اگر اسلام کے اقتصادی نظام میں اس کو جائز رکھا جائے تو گویا یہ پیش خیمہ ہو گا معاشی دستبرد کے جواز کا جو بلاشبہ حقیقی تجارت اور صحیح نفع اندوزی کے قطعاً خلاف ہے۔ اسی طرح دور نہ جائیے قریب ہی سے اس دور جدید پر نظر ڈالیے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تجارت علمی نظریوں پر قائم اور کاروبار سائنٹفک اصولوں پر چل رہا ہے اس دور میں بنک سسٹم کا سود، تجارتی سود کہلاتا ہے لیکن کیا بین الاقوامی لیگ (League of Nations) کی روئداد اور یورپ و ایشیا کے تجارتی ملکوں کے حالات اس امر کے شاہد عدل نہیں ہیں کہ بنک سسٹم کا موجودہ کاروبار ہی بڑی حد تک ان ملکوں کی کساد بازاری اور عام افلاس کا باعث ہے [1] اور یہ سسٹم بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بے پناہ زر اندوزی اور بے قید نفع خوری کا بہترین ذریعہ ہیں اور ان کی بدولت غیر محسوس طریقہ پر دولت سمٹ سمٹ کر محدود طبقہ میں اس طرح پہنچ جاتی ہے کہ عوام کے لیے قوتِ لایموت کے لیے بھی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

جمیع انواعِ سود کی حرمت اور ان کے دلائل

تجارتی سود کی حرمت:

ممکن ہے کہ ایک فلسفی دماغ آفرینش خیال کرتے ہوئے یہ شبہ پیش کرے کہ سود (ربا) کی وہ خاص شکل جو قرض سے متعلق ہے اور مہاجنی سود کہلاتی ہے اس کی تمام جزئیات بلاشبہ اپنے اندر مسطورہ بالا قبائح اور مفاسد رکھتی ہیں اس لیے اسلام نے اس کو حرام قرار دے کر اخلاقی اور قانونی ذرائع سے جس طرح اس کا سدباب کیا ہے، معاشی نظام کی صلاح و خیر کے لیے ازبس ضروری اور کائنات انسانی کی اخلاقی اور معاشی فلاح و بہبود کے لیے احسانِ عظیم ہے، لیکن تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے معاملات میں اس قسم کے حصولِ نفع کو جس کی جانب مسطورہ بالا حدیث ممانعت کے ضمن میں اشارہ کرتی ہے حرام قرار دینا اور ربوا (سود) میں شامل کرنا کس

---

(۱) انور اقبال قریشی: اسلام اور سود، مکتبہ الہانیہ، لاہور کینٹ، لاہور، ص ۱۴۹

مصلحت پر مبنی ہے جبکہ اس میں مہاجنی سود کی طرح کے مفاسد کا فقدان ہے۔

اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ سطحی نظر میں اگرچہ تجارتی اصنافِ سود میں مہاجنی سود کی طرح کے مفاسد محسوس نہیں ہوتے لیکن غائر نظر کے بعد یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے کہ نتیجہ اور ثمرہ کے لحاظ سے تجارتی سود میں بھی وہی اساس کام کر رہی ہے جو مہاجنی سود میں کار فرما نظر آتی ہے، یعنی ایسے معاشرتی نظام کا وجود جو مذموم سرمایہ داری پیدا کر کے دولت اور سرمایہ کو مخصوص افراد میں محصور کرتا اور احتکار و اکتناز کی راہیں کھول کر عام کساد بازاری کا سبب بنتا ہے۔

آپ ایسے دو سرمایہ داروں کا تصور کیجئے جن میں سے ہر ایک کے پاس مثلاً ایک سیر سونا ہو اور دوسرے کے پاس پانچ سیر، پس اگر ہم جنس شے میں کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کی اجازت دے دی جائے تو زیادہ سونا رکھنے والا قلیل مقدار میں رکھنے والے شخص کو مجبور کرے گا کہ وہ اس کے ہاتھ اپنے ایک سیر سونے کو کمی کے ساتھ فروخت کر دے تا کہ وہ چھ سیر کا مالک بن جائے اور اس طرح آہستہ آہستہ اپنی بے قید قوتِ خرید سے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ سونے کی قیمت گھٹانے یا بڑھانے کا مدار بن جائے اور اس طرح اپنے حرص و لالچ کے پیشِ نظر عام کساد بازاری پیدا کر دے اور اگر ایک سیر سونے کا مالک اس کے ہاتھ اپنا سونا کمی کے ساتھ فروخت کرنے سے انکار کر دے تو بڑی مقدار رکھنے والا شخص اس کو شکست دینے اور اس کا سرمایہ زبردستی حاصل کرنے کے لیے اس کے سونے کی قیمت بڑھا کر خریدے گا اور اپنے چند تولوں کا نقصان گوارا کرے گا تا کہ اس کو آہستہ آہستہ یہ حیثیت حاصل ہو جائے کہ بازار میں اس کا کوئی حریف باقی نہ رہے اور وہ تنہا یا اسی درجہ کے چند سرمایہ دار بازار کے نرخ پر قابض ہو جائیں اور مملو کہ سونے اور چاندی کو حسبِ منشاء گرانی کے ساتھ فروخت کر کے دوسروں کی قوتِ خرید کو اس درجہ کمزور بنا دیں کہ دولت و سرمایہ سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے اندر محدود ہو جائے، خواہ اس کا نتیجہ بد حالی ہی کیوں نہ ہو۔

غرض سونا چاندی اور اجناس کو ہم جنس کے ساتھ خرید و فروخت میں اگر کمی بیشی کی اجازت دے دی جائے تو کثیر المقدار سرمایہ دار، قلیل المقدار سرمایہ دار کو مختلف طریقوں سے شکست دے کر ہل من مزید کا طالب رہے گا، اور خرید و فروخت کا اصل مقصد ''باہمی تعاون کے ساتھ رفع حاجات'' کی بجائے دوسروں کو نقصان پہنچا کر زیادہ سے زیادہ ''نفع اندوزی'' ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ ''صالح نظام معاشی'' میں اس مقصد کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

ربوا الفضل:

البتہ اگر جنس مختلف ہو تو چونکہ دونوں اجناس کی قدر و قیمت جدا جدا ہے اس لیے اس میں کمی اور بیشی دونوں کی گنجائش ہے، تاہم اس صورت میں بھی غبن فاحش [1] کی اجازت نہ دی جائے گی بلکہ دونوں اجناس کی قدر و قیمت کے توازن کا لحاظ رکھا

(۱) غبن فاحش (Exorbitant rate of Profit) غبن فاحش کے معنی ہیں حد سے منافع خوری یا ناجائز منافع خوری۔ یہ منافع خوری بائع (فروخت کرنے والا) اور مشتری (خریدار) دونوں کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ اسلام کے عادلانہ معاشی نظام میں تجارتی کاروبار میں نفع کی نہ صرف اجازت بلکہ کئی صورتوں میں اسے ذریعہ برکت بھی سمجھا گیا ہے، دراصل کاروبار کا بڑا محرک (Motive) بھی جائز نفع کا حصول ہے۔ مگر ایسا نفع جو معقول حد سے زیادہ ہو، جو ضرورت مند خریدار یا تبادلہ کرنے والے کی ضرورت کا استحصال کرے بلکہ کاروبار تجارت کے پھیلاؤ میں رکاوٹ بنے اس کی اجازت نہیں ہے۔

غبن فاحش کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جو عام ہے کہ بائع یعنی فروخت کرنے والا مشتری یعنی خریدار کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جنس (مبیع) کو بہت زیادہ نرخوں پر بیچ کر نفع کمائے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بائع بعض اوقات دوسرے بائعین یعنی فروخت کنندگان کو نقصان پہنچانے کے لیے بازار میں اپنی جنس بہت ہی کم نرخوں پر فروخت کرے۔ تیسری صورت بھی ممکن ہے جب خریدار فروخت کنندہ کو رقم یا دوسری جنس کا نہایت ضرورت مند پا کر اس کی جنس نہایت کم قیمت پر خریدے۔

غبن فاحش کب ہوتا ہے؟ فقہاء مالکیہ اور فقہاء حنابلہ (Malikite & Hanabalite Jurists) کے مطابق جب مال تہائی (۱/۳) قیمت سے زیادہ نقصان پر بکے یا آسان الفاظ میں یوں کہیں کہ جب نفع کی مقدار ایک تہائی قیمت سے زیادہ ہو۔ البتہ فقہاء احناف کی رائے میں غبن فاحش ایسی قیمت کو کہتے ہیں جو قیمت معقول اندازے سے باہر ہو مثلاً ایک شخص نے ایک چیز دس ریال میں خریدی، مگر بعد میں کاروباری نظری سے دیکھنے والوں نے اس کی قیمت تین ریال، چار ریال، پانچ ریال بتائی، مگر کسی نے نو ریال یا گیارہ ریال نہ بتائی تو اس چیز

جائے گا اور جب کوئی شخص اس توازن کے خلاف کمی یا بیشی کو نقصان دہ حد تک لے جانے کی کوشش کرے گا، تو خلیفہ یا نائب خلیفہ اس کا سدِ باب کر دے گا۔ چنانچہ اس قسم کی مداخلت کا ثبوت خلافتِ راشدہ کے دور میں ثابت ہے۔

موطا امام محمد رحمہ اللہ میں ہے:

عن سعيد بن المسيب رحمه الله تعالىٰ أن عمر بن الخطاب رضي الله تعالىٰ عنه مرّ على حاطب بن ابي بلتعه رضي الله تعالىٰ عنه، وهو يبيع زبيبا له بالسوق. فقال له عمر: إما أن تزيد في السعر و إما أن ترفع من سوقنا.[1]

ترجمہ: حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر بازار کی جانب ہوا تو وہاں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منقی فروخت کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یا تو نرخ بڑھاؤ (یعنی ارزاں کرو) ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جانا ہو گا۔

زر مبادلہ کا نظام اور ربوا الفضل:

نیز سونے کو سونے یا چاندی کو چاندی کے ساتھ یا اسی نہج کی دوسری اشیاء کو ان کی ہم جنس شے کے ساتھ خرید و فروخت میں کمی اور بیشی ایک ملک کو دوسرے کی اقتصادی برتری کی محکوم بناتی ہے اور اس طرح ملکوں، قوموں اور حکومتوں کے مابین

کا منافع غبن فاحش ہو گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: عبد الرحمٰن الجزیری رحمه الله تعالیٰ: كتاب الفقه على المذاهب الاربعة، ج ۲، قسم المعاملات، كتاب البيوع، فصل الغبن الفاحش)

(۱) امام محمد: مؤطا، كتاب البيوع في التجارات والسلم، باب الرجل يشتري الشئ أو يبيعه فيغبن فيه أو يسعر على المسلمين - ابن تيميه، شيخ الاسلام تقي الدين: الحسبة في الاسلام (تحقيق محمد زهري النجار) المسئلة الاولى في اختلاف العلماء في بعض صور التسعير، مطبوعه الرياض ۱۹۸۰ء، ص ۶۱

نفرت کا بیج بوتی ہے، مثلاً ہندوستان اپنے بے پناہ سیم و زر اور خام اجناس کی فراوانی کے باوجود ہندوستانیوں کے لیے محض اس بنا پر افلاس اور معاشی تباہ حالی کا باعث بنا ہوا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اپنے حاکمانہ اقتدار کے بل پر انگلستان کے سکہ کے مقابلہ میں اپنی مبادلہ حکمت عملی (Exchange Policy) کے ماتحت ہندوستانی روپیہ کی قیمت کو صرف چھ آنہ کا باقی رہنے دیا، کیونکہ مال کے لینے اور دینے دونوں صورتوں میں سکوں کے درمیان کمی بیشی (بٹاون) کے اصول پر تبادلہ کیا جاتا ہے اور خود ہندوستان کے اندر حیدر آباد اور برٹش انڈیا کے روپیہ میں حالی اور کلدار کے نام سے دو قسم قائم کر کے بٹاون (ایکسچینج) کا دستور قائم ہے اور بلاشبہ یہ معاشی دستبرد کی واضح مثال ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی رومی سکوں کی قیمت ایرانی سکوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی تھی، کیونکہ اسلام کے قرنِ اول میں روم و ایران کی باہمی آویزش نے روم کو فاتح اور ایران کو مفتوح بنا کر ایران کی ساکھ کو گرادیا تھا، حتیٰ کہ بنی امیہ کے دور میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ روم و ایران پر اسلامی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی اسلامی سکوں کے ساتھ ساتھ رومی سکے تو جاری رہے لیکن ایرانی سکوں کو لوگوں نے قطع و برید کر کے ضروریات میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

پس اس حقیقت کے روشن ہو جانے کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلامی معاشی نظام" اپنے دوسرے شعبوں کی طرح سکہ کے معاملے میں بھی عالمگیر وحدتِ نظام (System of Wrold Unity) کا خواہش مند ہے اور اس لیے وہ اس اصول کو پسند کرتا ہے کہ سکہ جات بین الاقوامی ہونے چاہئیں تاکہ تبادلہ سکہ جات کے ذریعہ معاشی دستبرد رونمانہ ہوسکے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ صاحبِ شریعت کی نگاہِ حکمت طراز میں یہ ازبس ضروری ہے کہ نقدین (سونا چاندی) جیسی دھاتیں اشیاء کی خرید و فروخت کا ذریعہ بنی رہیں کیونکہ یہی ان کی تخلیق کا حقیقی مقصد ہے اور

مقصود بالذات یعنی ''مبیع'' (جس کو سکہ دے کر خرید ا جائے) نہ بننے پائیں تاکہ ایسا سرمایہ دارانہ معاشی نظام پیدا نہ ہو سکے جس میں دھاتیں ''مبیع'' اور مقصود بالذات قرار دے جا کر دولت و سرمایہ کو محدود طبقہ کی ملکیت بنا دینے کا باعث ثابت ہوں، نیز اجناس میں ہم جنس کی خرید و فروخت پر ناپ تول میں مساوات کی پابندی بھی اس حکمت پر مبنی ہے کہ خرید و فروخت کا حقیقی مقصد جبکہ باہمی تعاون و مواسات کے ساتھ انسان کی مختلف ضروریات کی تکمیل ہے تو بلاشبہ یہ مقصد اس طرح پورا ہو سکتا ہے کہ یا سکہ کے ذریعہ ضروریات کو خرید ا جائے اور یا مختلف اشیاء کے درمیان تبادلہ کی صورت اختیار کی جائے، مثلاً ایک شخص کے پاس چار سیر چاول ہیں اور اس کو آٹے کی ضرورت ہے اور دوسرے شخص کے پاس آٹھ سیر آٹا ہے اور اس کو چاول مطلوب ہیں تو یہ دونوں تبادلہ اجناس کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔

لیکن خرید و فروخت میں ہم جنس اشیاء کا تبادلہ ظاہر ہے کہ ضروریات زندگی کے پورا پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بیشتر اس غرض سے ہوتا ہے کہ اس تبادلہ کی راہ سے دوسروں کی قوتِ خرید کو اس درجہ کمزور کر دیا ہے کہ اس شے پر صرف ایک شخص یا چند اشخاص کا قبضہ ہو جائے اور پھر وہ اس شے کو من مانی قیمت پر فروخت کر سکیں اور اس طرح احتکارِ ممنوع کی مدد سے محدود حلقہ میں دولت و سرمایہ کو مخصوص کر کے عام کساد بازاری (Commercial Depression) پیدا کر دیں۔

پس صاحبِ شریعت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ربوا الفضل کو ممنوع قرار دے کر ایسی صورتِ حال پیدا کر دی کہ کوئی شخص نقدین اور ہم جنس اشیاء ''مبیع'' نہ بنائے گا، کیونکہ اس صورت میں مساوات کے ساتھ خرید و فروخت ایک عبث کام رہ جائے گا۔

سود بنام نفع (Profit):

اس دور جدید میں ''جوازِ سود'' کے لیے بعض اور بھی علمی اصول قائم کیے گئے ہیں جن کو سودی کاروبار کے لیے بنیاد قرار دیا جاتا ہے، اس علمی تشریح کا خلاصہ یہ ہے

کہ جبکہ سونا، چاندی، بشکل سکہ بھی معاشی نقطۂ نظر سے "اصل" میں شمار ہے تو کیا وجہ اس کو حصولِ نفع کا ذریعہ تسلیم نہ کیا جائے، خصوصاً جبکہ اس سے حصولِ نفع کے وقت وہی علامات و آثار یا نتائج پیدا ہوتے ہیں جو اصل کے لوازمات میں شمار کیے جاتے ہیں یعنی پیدا آوری (Productivity) اور انتظار کشی (Waiting)۔ نیز حقیقتاً سود نقد کے اس نفع کو کہنا چاہیے جو حاجت مندوں اور غریبوں کی اضطراری حالت سے فائدہ اٹھا کر حاصل کیا جائے اور بے شبہ یہ نفع ربا کہلانے کا مستحق اور ظالمانہ طریق کار ہے، لیکن نقد کا جو نفع اس طرح وصول کیا جائے اور خود قرضخواہ بھی ادا سود کے بعد قرض دہندہ کے مساوی یا زیادہ فائدہ اٹھا لیتا ہے، جیسا کہ بنک سسٹم یا کواپریٹو سوسائٹوں کے سسٹم میں نظر آتا ہے، تو ایسے نفع سود کو ربا میں شمار نہیں ہونا چاہیے۔

جواز سود کی یہ سب سے بہتر تعبیر ہے جو آج کے علمی دور میں کی جاتی ہے مگر غائر (Deep) نظر سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جوازِ سود کی یہ تشریح بھی درست نہیں ہے اس لیے کہ جو معاشی نظام اپنی بنیاد اس اصول پر قائم کرتا ہے کہ اصل اور محنت کو ایسے اعتدال کے ساتھ متوازن رکھا جائے کہ کسی حال میں بھی "اصل" اس مذموم سرمایہ کی شکل نہ اختیار کر لے جو عام رفاہیت اور افراد ملک و ملت کی عام متوسط یکسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا ہے وہ جواز سود کی ان نکتہ سنجیوں اور علمی کاوشوں کو کوئی وقعت نہیں دے سکتا، اور جبکہ موجودہ دور کے بنک سسٹم اور اس جیسے دوسرے سسٹم کے عملی نقشے بھی سرمایہ داری کے مہلک اثرات و نتائج کو نمایاں خد و خال کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، تو اسلام کا معاشی نظام کس طرح ان علمی کاوشوں کی خاطر ان کے ذریعہ حاصل شدہ نفع (سود) کو ربوا سے خارج کر سکتا ہے۔[1]

---

(۱) جو حضرات اس دور میں مادیت اور لادینیت کے فروغ سے متاثر ہیں وہ عموماً سود (ربا) کے عدم جواز سے متعلق اس لیے متشکک یا منکر نظر آتے ہیں کہ انہوں نے صرف اسی قدر سننے پر اکتفا کر لیا ہے کہ دور جدید کے عقلاء اور علماء معاشیین سود، تجارتی سود (ربا) کو نہ صرف جائز بلکہ سماج کی ترقی کے لیے مستحسن سمجھتے ہیں ان کو یہ

اور کیا جواز (Validity) سود کے اس مجوز (Validater) کی طرح ایک شخص یہ کہنے کا حق دار نہیں ہے کہ جب کہ اصل کے اثرات و نتائج کے پیشِ نظر نقود کے نفع (سود) کو جائز رکھا جا سکتا ہے تو محنت کے اثرات و نتائج کے پیشِ نظر قمار کی ان تمام صورتوں کو بھی کیوں جائز نہ قرار دے دیا جائے جو موجودہ دور میں علمی اصول پر "لاٹری" "سٹہ" اور دوسرے ناموں سے جاری ہیں، کیونکہ قمار کے ان جدید طریقوں میں جائز محنت کی طرح مہذب جواری (Civilized Gambler) کی "عقل و محنت" کو بھی دخل ہے اور جاہلی قمار سے جدا، یہ جانبین کی تباہی کا باعث بھی نہیں ہیں۔ لیکن اسلام کے معاشی نظام کی جانب سے اس کا بھی وہی جواب ہے کہ وہ اصل اور محنت

کون بتلائے کہ جس مسئلہ کو وہ یقینی اور طے شدہ سمجھتے ہیں وہ مسئلہ خود وقت کے ماہرین علم المعیشت کے درمیان سخت اختلافی ہے، بلکہ بیشتر اور اکثر کی رائے یہ ہے کہ سماج کی عام خوشحالی اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتی جب تک شرح سود کو گھٹا کر "صفر" نہ کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور اقبال کی کتاب "اسلام اور سود" لائق مطالعہ ہے، وہ ایک جگہ لارڈ کینس (Keyns) مشہور ماہر معاشیات کا یہ مقولہ نقل کرتے ہیں، چنانچہ لارڈ کینس اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے کہ اشیاء کی پیدائش میں آسانی سے اتنا اضافہ ممکن ہے کہ جس سے اصل کی کارکردگی مختتم (Marginal Productivity) صفر ہو جائے تو نظام اصل داری کے اکثر نقائص کی تلافی کا یہ بہترین اور موثر ترین طریقہ ہوگا۔ ذرا غور و فکر سے ہر شخص اس شدید سماجی تغیرات کا نقشہ کھینچ سکتا ہے جو کہ سود کے نابود ہونے کے باعث رونما ہوں گے، ہر شخص اس کے باوجود بھی آزاد ہوگا کہ اپنی کمائی کو پس انداز کرے اور اسے مستقبل میں صرف کرے۔ (ص ۵۶)

آج (اکتوبر، نومبر ۲۰۰۸ء (شوال، ذوالقعدہ ۱۴۲۹ھ) جب پوری دنیا کو کساد بازاری (Economic Depression / Decline) کے خطرہ نے گھیر رکھا ہے۔ امریکہ، یورپی یونین، جرمنی اور جاپان جیسے ممالک کی معاشی نبضیں ڈوب رہی ہیں، آج (بتاریخ ۱، ۲ نومبر ۲۰۰۸ء) امریکہ اور ترقی یافتہ دنیا کے معاشی ماہرین، بنکار اور پالیسی ساز شرح سود کی کمی کا مشورہ دے کر اس بلائے ناگہانی (کساد بازاری) سے چھٹکارا کی راہ نکالنا چاہتے ہیں اور امریکہ، جاپان اور یورپی یونین کے وفاقی بنکوں نے شرح سود میں کمی کا باقاعدہ اعلان کر کے اس پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا ہے۔ کیا یہ اسلام کی حقانیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے عادلانہ معاشی نظام کی سچائی اور ہر دور میں قابل عمل ہونے اور معاشی پریشانیوں کے حل کی صلاحیت کی منہ بولتی (Unequivocal) دلیل نہیں ہے؟ "فاعتبروا یا اولی الابصار"

ع مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

دونوں کو تجارت میں بنیاد کار تسلیم کرتے ہوئے دونوں کے ایسے عملی نقشہ کو تسلیم نہیں کرتا جو آہستہ آہستہ اعتدال سے گزر کر مہلک سرمایہ داری کے لیے راہ کھولتا ہے کیونکہ اس سے پیدا شدہ خوشحالی مخصوص طبقہ کے لیے ہے عوام کے لیے نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کے معاشی نظام میں ان دونوں صورتوں کے عدمِ جواز کی گذشتہ صفحات میں بیان کردہ یہ دلیل بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ معاملات میں نقود کی حقیقی حیثیت ثمن کی ہے اور اس کو مبیع (مال خرید و فروخت) بنانا حقیقت کو بدلنا اور منقلب کر دینا ہے، اور ایسا کرنا باہمی تعاون کے عادلانہ طریقوں کا انسداد اور جائز محنت کا استیصال ہے اور اس طرح زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت پر ضرب کاری لگتی ہے اور تمدن و حضارت کا فساد لازم آتا ہے۔

سود اور ربوا:

جدید فن معیشت کی جانب سے جواز سود کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "سود اور ربوا" کے درمیان فرق ہے جو سود شرح مروجہ یا شرح قانونی (Legal rate of Interest) سے زیادہ اور بھاری ہو اس کا نام ربوا (Usury) ہے اور ایسے سود خوار کو (Usurer) کہتے ہیں اور سود کی وہ شرح جو مروجہ یا قانونی سے سود بمعنی ربا نہیں ہے، بلکہ سود بمعنی "نفع جائز" ہے اور اس کو آج کی اصلاح معیشت میں (Interest) کہا جاتا ہے۔

چنانچہ موجودہ سماج کے جدید باطل نظام سے مرعوب مسلمانوں نے بھی قرآنی حقائق سے ناآشنا یا بے پرواہ ہو کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن نے بھی سود کو نہیں "ربا" کو حرام قرار دیا ہے۔

جدید فن معیشت کا یہ بھی ایک سخت مغالطہ اور فریب ہے اس لیے کہ جب جدید علماء معاشین کے یہاں آج تک یہ طے نہ ہو سکا کہ بھاری سود اور مروجہ قانونی سود کی حدود کیا ہیں تاکہ ربوا اور سود اپنے حقائق کے لحاظ سے باہم ممتاز ہو جائیں؟ اور

جیسا کہ علم المعیشت (Science of Economics) کی کتابوں سے واضح ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں ان کے درمیان سخت اختلاف ہے کہ کون سی ایسی شرح سود ہے جس کو جائز اور گراں شرح سود نہ کہا جاسکے کیونکہ جب بھی قانونی یا رواجی طور پر کسی شرح سود کو نفع یا فائدہ (Interest) کے درجہ میں متیعن کیا جاتا ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ تجربہ ثابت کر دیتا ہے کہ یہ شرح بھی "انٹرسٹ" نہیں بلکہ یوزری (Usury) کی حد میں آگئی ہے۔ اور اس طرح شرح سود کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے غیر مختتم اور غیر حقیقی (رسمی) بنا رہا ہے اور آج بھی ہے اور اسی بنا پر سماجی نظام میں معاشی تشویش اور بے چینی کا باعث ہوتا رہا ہے اور اس وقت تک ہوتا رہے گا کہ شرح سود گھٹ کر "صفر" (Zero rate of Interest) ہو جائے۔

نیز جبکہ گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا کہ نفس سود (ربا) خواہ کسی شکل میں بھی ہو سماجی زندگی کے لیے تباہ کن اور معاشی وسائل کے لیے حد درجہ مضرت رساں ہے تو اب اس کو "انٹرسٹ و یوژری" (Interest or Usury) یا الربا المعتدل اور الربا الفاحش (Moderate Interest or Exorbinant Interest) میں تقسیم کرنا اس وقت تک بے سود ہے جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ انٹرسٹ اور ربا معتدل میں وہ نقصانات موجود نہیں جو ربا فاحش میں ہیں، حالانکہ جدید علماء معیشت اس اعتراف پر موجود ہیں کہ بینک سسٹم ہو یا مہاجنی سسٹم ان کی شرح سود آہستہ آہستہ تمام نظامِ سماجی کو تباہ کرنے کا باعث بن رہا ہے اور تاوقتیکہ شرح سود صفر (Zero rate Interest) کی حد تک نہ پہنچ جائے عام کساد بازاری اور عوام کی معاشی تباہ کاری کا کوئی حل نکالنا ناممکن ہے۔

سود کے بغیر معاشی ترقی ممکن:

(ژولیدہ ذہنیت کا اعتراف کہ سود کے بغیر معاشی ترقی تو کیا چھوٹے پیمانہ (Small Scale) پر کوئی کاروباری ممکن نہیں مگر اسلام اپنے تجربہ کے ساتھ اس اعتراف کا مخالف ہی نہیں بلکہ اس کا داعی بھی ہے کہ سود کے بغیر معاشی ترقی اور

سیاسی و سماجی وقار دونوں ممکن ہیں۔) حقیقت یہ ہے کہ مادیت کے فروغ، آزاد تعیش اور بے قید زندگی کی خواہش نے مادیین (Materialits) کے دماغوں میں ایک ایسے سماج اور ایسی سوسائٹی کا تصور پیدا کر دیا ہے جس میں سود کے بغیر تجارت اور صنعت و حرفت میں عظیم الشان تمدنی ترقی کے امکانات مفقود ہیں اور دنیا کے حصول پر جب ان کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا گیا انہوں نے اس تصور کو عملی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی، نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ایک طرف تجارت اور صنعت و حرفت نے بیش از بیش ترقی کی اور بڑی بڑی مشینوں کی ایجادات اور سائنس کے اختراعات نے ان کو بامِ عروج پر پہنچایا تو دوسری جانب اس کا واضح اثر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ عوام کی قوتِ خرید گھٹنے لگی اور سرمایہ دار طبقہ کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دولت و ثروت سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری میں رہ گئی اور کروڑوں عوام معاشی ہلاکت کا شکار ہو کر رہ گئے، اور یہ سب سماج کے اس نقشہ کی بدولت ہوا جس میں سود اور ربا کا فرق بیان کر کے موجودہ بینک سسٹم، مہاجنی سسٹم، سودی تمسکات (Interest bearing Securities) اور تجارتی بانڈ (Commercial Bonds) جیسے معاملات کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس کے برعکس اسلام ایک ایسے سماج کا داعی ہے جس کے اندر ''معیشت'' کی اساس بے قید تعیش (Unlimited Luxury) کی بجائے ضروریات کی جائز تکمیل اور باہمی اخوت و مساوات پر قائم ہے، اس لیے وہ نہ صرف اعتقادی تصور اور نظریہ کی بلکہ عملی نظام کی حد تک ایسے سماج کا تجربہ کراتا ہے جس میں سود کے بغیر ہی تمدنی ترقی زیادہ سے یادہ بامِ عروج تک پہنچ سکتی ہے۔ اور خلافتِ راشدہ کے مقدس دور کے علاوہ اندلس اور بغداد کی ان خلافتوں کے زمانہ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے جو صحیح اسلامی نظریہ حکومت پر گامزن نہ ہونے کے باوجود ''سود'' کی حرمت پر عملاً متفق رہتے ہوئے ہر قسم کی تمدنی اور معاشی ترقیوں میں وقت کی تمام حکومتوں سے برتر رہیں۔

ربا اور سود در سود:

ربا قرآن کریم اور مسئلہ سود میں "اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً" کا معاملہ، تو ابھی بصراحت یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ قرآن کریم ایک لمحہ کے لیے مطلق سود کی اباحت کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے اسلوبِ بیان کے لحاظ سے جس قدر شدید وعید سود خوار کے لیے بیان کرتا ہے کسی گناہ پر اس قدر شدید وعید کا اظہار نہیں کرتا "فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ"

قرآن نے "اضعافًا مضٰعفة" (سود در سود) کو اول اس لیے منع کیا کہ زمانہ جاہلیت میں جو رسمِ قبیح جاری تھی اس کا انسداد کیا جائے اور بعد میں مطلق سود کی حرمت کا اعلان فرمادیا اس مقام پر "ربا" کو کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا اور اس کی حرمت کو مطلق (Absolute) رکھا گیا ہے لہذا قرآن کی نگاہ میں "سود" اور "ربا" کے درمیان مطلقا کوئی فرق نہیں ہے اور اس کی حرمت کے تحت میں انٹرسٹ (Interest) اور یوژری (Usury) دونوں داخل ہیں۔

مشہور مصری عالم عبدالرحمٰن الجزیری اپنی تالیف "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ" میں اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "بعض لوگوں نے یہ گمان باطل کر لیا ہے کہ سود میں سے صرف "اضعافا مضعفة" ہی رباء حرام میں داخل ہے جیسا کہ آل عمران کی آیت میں مذکور ہے ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوا۟ ٱلرِّبَوٰٓا۟ أَضْعَٰفًا مُّضَٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾ ﴾[1] یہ گمان صریح غلطی پر مبنی ہے۔ اس لیے آیت کریمہ کا مقصد تو درحقیقت سود خوری سے نفرت دلانا اور سود خور کی نظر کو اس جانب پھیر دیتا ہے کہ تیرا یہ سودی معاملہ جو سود در سود کی شکل میں بڑھتا جارہا ہے ایک دن

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۱۳۰ ترجمہ: اے ایمان والو! سود دگنا چوگنا نہ کھاؤ، اور اللہ کریم سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

مقروض کے کل مال کو مستغرق کر لے گا اور ایک مدت گزرنے اور سود در سود کے مسلسل اضافہ ہوتے رہنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مدیون (Indebted) فقیر، مفلس، تنگدست اور بدحال ہو کر رہ جائے گا، اور یہی سودی معاملہ دنیا میں اس کی بدحالی اور تنگی عافیت کا سبب بن جائے گا اور اس فاسد معاملہ کا نظامِ عمرانی پر بہت ہی برا اور مضرت رساں اثر پڑے گا۔

پس آیت کریمہ سے کوئی عقل مند اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے تین گنا سود کھانے کو تو حرام کر دیا ہے مگر دو گنا کھانے کی اجازت باقی رکھی ہے۔ علاوہ ازیں جب قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ صریح ارشاد موجود ہے "فَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ" (پس اگر تم اس سے توبہ کرو تمہاری اصل پونجی تمہارے لیے ہے) ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ کوئی عاقل آیت کریمہ کا یہ مفہوم سمجھ سکے کہ مطلق سود کی تو اجازت ہے البتہ سود در سود حرام کر دیا گیا ہے۔"[1]

ربح اور ربا[2]:

قرآن کہتا ہے کہ حکیم مطلق (All Wise) نے ربح (نفع جائز) اور ربا (سود) کے درمیان بہت بڑا فرق رکھا ہے اور وہ یہ کہ ربح میں نفع کا مدار "بیع و شرا" سے متعلق ہے اور ربا میں تاخیر مال اور مدت میں اضافہ نفع کا باعث بنتا ہے، اور جبکہ بیع و شراء میں دونوں جانب سے تعاون کے معاوضہ اور حقیقی رضا کے ساتھ نفع کا وجود ثابت ہوتا ہے تو اس لیے اس قسم کے نفع کو جائز قرار دیا جانا چاہیے "وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ"

---

(۱) الجزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، ج ۲، قسم المعاملات، ص ۳۲۳

(۲) اس پر مختصر بحث "سود بنام نفع" کے عنوان کے تحت آچکی ہے، مگر مؤلف حرمت سود (Probibition of Interest) کے اہم موضوع کو سمجھانے کے لیے ضروری تکرار (Repetition) سے بھی گریز نہیں فرمایا۔

اور چونکہ قرض دار کی جانب سے اداء قرض میں تاخیر اور قرض خواہ کی جانب سے تاخیر واضافہ مدت پر نفع کا حصول طرفین کی رضا اور باہمی تعاون سے نہیں بلکہ قرضدار کے اضطرار اور قرض خواہ کے بغیر عوض نفع اندوزی پر مبنی ہے، اس لیے اس کو بلاشبہ حرام ہونا چاہیے، ''وَحَرَّمَ الرِّبٰوا''

غرض ربح اور ربوا کو ایک سمجھنا یا ''ربا'' اور ''سود'' کے درمیان فرق قائم کرنا قرآن کی نصوص قطعیہ (Absolute Texts) کے خلاف ہے اور اسلام کے صالح معاشی نظام کی نگاہ میں جدید باطل نظامِ معاشی کی یہ موشگافی کہ انٹرسسٹ (Interest) ''ربا'' نہیں ہے بلکہ صرف یوژری (Usury) ہی ''ربا'' ہے باطل اور فریب ہے اس لیے کہ مذموم سرمایہ داری کے فروغ میں یہ دونوں یکساں مدو معاون ہیں۔

علماء اسلام اور حرمتِ سود کے دلائل و حِکَم

علمائے اسلام نے عام طور سے مسئلہ سود (ربوا) پر قانونی اور اخلاقی نقطہ نظر سے بحث کی ہے، جو فقہ اصول فقہ اور کتب تفسیر میں منقول ہیں لیکن مُحقّقین نے اس کے معاشی پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کی حرمت کو اس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ ''حرمتِ ربوا'' کے نظریہ کی قدر و قیمت اس جدید معاشری نظام کی ہمہ گیری کے باوجود صرف دفاعی دلائل (Defensive Arguments) پر مبنی نہیں رہ جاتی بلکہ معاشی نقطۂ نظر سے ''جواز سود'' کے نظریہ پر مجوزین (تجویز کرنے والوں) کو چیلنج کرتی ہیں کہ وہ پہلے یہ ثابت کریں کہ سود حقیقۃً معاشی اور عقلی نقطۂ نظر سے تباہ کن نہیں بلکہ معاشی اور معاشرتی نظام کی ترقی کا باعث ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے دلائل:

دنیائے اسلام کے مشہور فلسفی شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [1] حرمتِ قمار و سود کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کا حاشیہ میں درج ہے۔

واضح رہے کہ جو حرام اور باطل چیز ہے اس لیے ہے کہ دراصل وہ لوگوں کے مال کو زبردستی اچک لینا ہے، اور اس کی تہہ میں جہل، حرص، امید باطل اور فریب اور دھو کا کار فرما ہوتے ہیں اور اس میں امدادِ باہمی اور تمدن کا ادنی سے بھی دخل نہیں ہوتا۔

نقصاناتِ جوا سے مثال:

دیکھئے جوئے میں اگر شکست خوردہ اپنے حریف کے مقابلہ میں خاموش رہتا ہے تو غیض و غضب اور حسرت و ندامت کے ساتھ خاموش رہتا ہے اور اگر ضبط نہیں کر سکتا تو جنگ و پیکار اور قتل و خونریزی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کامیاب حریف اس کی حرماں نصیبی (Deprivation) سے لذت محسوس کرتا ہے اور اس کی تباہی، بربادی اور ہلاکت پر مسرت، خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی حرص و آز بڑھ جاتی ہے اور وہ ہر وقت اس جنون میں سرگرداں رہتا ہے، جوئے کی عادت، مال کی تباہی اور فسادات کی ترقی کا باعث ہوتی ہے اور سب سے زیادہ مضرت یہ ہے کہ اس کی بدولت جو صحیح اقتصادی سہارے ہیں وہ بے کار ہو جاتے ہیں اور جس امداد و تعاون پر تمدن کی بنیاد قائم ہے وہ معطل ہو جاتے ہیں۔ روزمرہ کا مشاہدہ اس کا خود شاہد عدل ہے۔ اسی طرح سود (جو) ایسے قرض پر روپیہ دینے کا نام ہے جس پر نفع کے نام سے زیادتی وصول کی جاتی ہے باطل اور حرام ہے اور سرتاسر ظلم ہے اس لیے کہ اس قسم کے قرض لینے والے عام طریقے سے مفلس اور مضطر (Poor & Coerced) ہوتے ہیں وہ بیشتر مدتِ معین پر رقم ادا کرنے سے کوتاہ رہتے ہیں اور یہ "سود، در سود" کے نام سے بڑھتا رہتا ہے اور کسی حال میں اس سے نجات نہیں ملتی تاآنکہ سب کچھ دے کر برباد ہو جاتا ہے۔ یہ "لین دین" سخت جھگڑوں کا باعث اور خطرناک مناقشوں کا سبب بنتا ہے اور جس قوم یا ملک میں بے محنت روپیہ حاصل کرنے کا رسم و رواج جڑ پکڑ جاتا ہے وہاں عوام کے لیے صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کی صحیح راہیں بند ہو جاتی ہیں جو ذرائع آمدنی کے لیے فطری اصول ہیں۔

معاملات میں اس سے زیادہ باریک اور پیچیدہ دوسرا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس میں ظاہری نفع کی صورت میں حقیقی تباہی و بربادی مضمر ہو، دراصل یہ دونوں معاملات خاص قسم کے نشے ہیں جو خدا کے بتائے ہوئے قانون اور ذرائع آمدنی کے صحیح طریقوں کے استعمال کے خلاف ہر انسان کو آمادہ کرتے ہیں اور تمام نشوں سے زیادہ فسادات، عداوتِ باہمی، انسان کشی کے باعث بنتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے ان دونوں کو ظلم اور باطل قرار دیا۔

سود کی دونوں قسمیں حرام:

اور چونکہ سود کی دو قسمیں ہیں، ایک بیان کردہ صورت جو حقیقی ربا کہلاتی ہے اس لیے اس کو بغیر قید وبند کے حرام کر دیا اور دوسری "رباء فضل" کہلاتی ہے جیسا کہ سونے اور چاندی کا کمی بیشی سے لین دین کرنا وغیرہ اس لیے ان اشیاء کی خرید و فروخت کے جواز کو تسلیم کرتے ہوئے ان تمام صورتوں کو حرام بتایا جن کا نتیجہ سودی لین دین کے موافق نکلتا تھا تاکہ اس غیر فطری کاروبار کا پوری طرح انسداد ہو جائے۔ [1]

بہرحال یہ تمام کاروبار مختلف شکلوں اور صورتوں میں احتکار ہی کی متعدد اقسام ہیں اور یہی احتکار جب قوموں میں ترقی کر جاتا ہے اور عام کاروبار پر مسلط ہو کر اقتصادی نظام پر چھا جاتا ہے تو اکتناز کی مذموم شکل اختیار کر لیتا ہے اور وبائی مرض بن کر عام مخلوق کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کے دلائل:

❶ اور حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ [2] نے "احیاء علوم الدین" میں جو کچھ اس

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ مصر، ج ۲، البیوع المنہی عنہا (بیع کی ممنوع اقسام کا بیان)، ص ۱۰۶

(۲) امام غزالی، حجۃ الاسلام ابو حامد محمد الغزالی ۴۵۰ھ میں ضلع طوس کے گاؤں غزالہ میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ میں ۵۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ رحمہ اللہ علم الاصول، فقہ اور فلسفہ کے امام تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے پیروکار تھے۔ بہت مشہور کتب کے مصنف تھے، جن میں زیادہ شہرت المستصفی، الوجیز، احیاء علوم الدین کو ملی۔

سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے اس کا مفہوم اور خلاصہ بحث یہ ہے:

سونا چاندی ذریعہ قوام حیات:

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ اس نے سونا، چاندی جیسی دھاتیں پیدا کر کے درم و دینار (سکوں) کو وجود بخشا۔ اگر ان دھاتوں کی حقیقت پر غور کیجئے تو حجریات (پتھروں) میں سے ہونے کی وجہ سے انسانی معاشرہ کی ضروریات و حاجات کے لیے بیکار ہیں اور اگر ان کی منفعت پر توجہ دیجئے تو ان پر دنیا کے معاشی نظام کے قوام (Means of Sustenance) کا مدار ہے، کیونکہ ہر شخص اضطراری طور پر ان کا محتاج نظر آتا ہے۔

ذریعہ تبادلہ (Medium of Exchange):

اس لیے کہ ہر انسان اپنے طعام، لباس اور دوسری ضروریات کے لیے بہت سی اشیاء کی حقیقتوں (گیہوں، چاول، گھوڑا، بیل، وغیرہ) کا محتاج ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں ہر ایک کے پاس ضرورت کی ہر شے موجود نہیں ہے۔ مثلاً اس کے پاس زعفران کے گٹھے موجود ہیں مگر اس کی ضروریات اس سے غیر متعلق ہیں اور وہ سواری کے لیے اونٹ کا محتاج ہے جو اس کے پاس نہیں ہے، اسی طرح اس کے برعکس ایک شخص زعفران کا محتاج ہے جس سے وہ محروم ہے مگر اونٹ کا مالک ہے جس کی اس کو قطعاً حاجت نہیں۔ تو معاشی نظام کا تقاضہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں تبادلہ کر کے اپنی اپنی ضروریات پوری کر لیں، لیکن تبادلہ کے وقت عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جب کہ یہ دونوں اشیاء غیر متجانس (Un- Homogeneous) اور مختلف ہیں تو تبادلہ کی باہمی مقدار کا تعین از بس ضروری ہے کہ اونٹ کی خریداری کے لیے کس مقدار میں زعفران ادا کرنی چاہیے یا کس مقدار کے مقابلہ میں اونٹ کو فروخت کیا جائے۔ باہم تناسب نہ رکھنے والی اشیاء کی خرید و فروخت کا یہ سلسلہ اسی کا طالب ہے کہ تعینِ مقدار اور صورتِ ادا کے لیے ایسی چیز کا ہونا از بس ضروری ہے جو دو متضاد

اشیاء کے درمیان ترازو اور کانٹے کا کام دیتے ہوئے یہ ثابت کر سکے کہ فلاں شے اس صورت سے یا اس متعین مقدار سے دوسری شے کے مساوی ہو سکتی ہے ورنہ تو معاملات خرید و فروخت ناممکن ہو جائیں گے۔

ذریعہ عدل و توازن (Means of Justice & Balance):

(ذریعۂ تبادلہ نہ ہونے کی صورت میں) مدنی الطبع (Social Being) انسان کا معاشی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا، تب قدرتِ حق نے مخلوق کو اپنی اس پروردگاری کی جانب راہنمائی فرمائی کہ ان حجریات کو جو اپنی حقیقت کے پیشِ نظر بے کار نظر آتی ہیں اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ انسان کے معاشی نظام کی درست کاری کے لیے متفاوت اور مختلف النوع اشیاء کے درمیان تبادلہ کے وقت باہمی مراتب، تعینِ مقدار اور مساوی و غیر مساوی کا فرق ظاہر کریں اور بیع و شرا میں ''ترازوئے عدل'' (Balance of Justice) کا کام دیں۔

تو اب درہم و دینار (روپیہ و اشرفی) کے ذریعہ ہم بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ اونٹ مثلاً سو روپے کا ہے اور اس کے مقابلہ میں زعفران کی یہ مقدار سو روپیہ کی قیمت کو پہنچے گی اور اس طرح دونوں کے درمیان بآسانی تبادلہ ممکن ہو سکے گا۔ اب بائع اور مشتری مختار ہیں کہ نقدین (سونے چندی کے سکوں) کے ذریعے جدا جدا دونوں اشیاء کے درمیان معاملہ کریں یا نقدین کے ترازوئے عمل کے مطابق اشیاء کا اشیاء کے ساتھ تبادلہ کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اشیاء کے درمیان تبادلہ کا صحیح توازن ایسی شے کے ساتھ ہی ہونا ممکن ہے جو اپنی حقیقت کے لحاظ سے لائقِ احتیاج نہ ہو اور اس کی ذات ضروریات و حاجاتِ انسانی میں براہِ راست کام نہ دیتی ہو بلکہ وہ ضروریاتِ انسانی کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہو، ورنہ تو یہ دشواری پیش آئے گی کہ جب ایک شخص سونا چاندی (سکوں) کی حقیقت کا محتاج ہے اور مثلاً دوسرا آدمی اس کا محتاج نہیں بلکہ لباس و طعام میں سے کسی شے کا محتاج ہے تو اس صورت میں یہ پہلا شخص (نقدین) سونے چاندی کی اہمیت کو بڑھائے گا اور دوسرا اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرے گا

اور اس طرح کوئی شے ایسی باقی نہ رہے گی جو متفاوت اشیاء کے درمیان صحیح توازن کو قائم رکھ سکے اور ترازوئے عدل بن سکے۔ اور نتیجہ یہ نکلے گا، کہ نظامِ معاشرت غیر منتظم ہو کر رہ جائے گا۔

پس اس حقیقت حال کے پیش نظر کہ سونا چاندی خود مقصود بالذات نہیں بلکہ معاشی اغراض و مقاصد کے لیے ذریعہ اور آلہ ہیں، عقل و فطرت اور نظامِ معاشی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق اس لیے فرمائی ہے کہ یہ لوگوں کے ہاتھوں میں (بشکل سکہ) چلتے پھرتے رہیں اور متفاوت اشیاء کے باہمی تبادلہ میں "ترازوئے عدل" (Balance of Justice) کا کام دیں اور خرید و فروخت میں کسی وقت بھی مقصود بالذات نہ بن سکیں۔

مختلف اشیاء میں مساوی قدر کا ذریعہ (Medium of Equall Value):

سونے چاندی کی تحقیق کے اس مسئلہ کو دوسری تعبیر کے ساتھ یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حجریات کو دنیا کے معاشی نظام کے استحکام کے لیے مقصود بالذات نہیں بلکہ معاملات خرید و فروخت میں "ذریعہ" (Medium) اور "وسیلہ" (Means) بنایا ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ یہ دھاتیں اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہیں کہ جس شخص کے پاس درہم و دینار اور روپیہ یا گنی موجود ہیں اس کے پاس گویا ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ اور جس نسبت سے ان کا وجود کسی جگہ ہے اسی نسبت سے وہ کائنات کی معاشی ضروریات کی حامل ہیں، لیکن اس کے برعکس دنیا کی بہتر سے بہتر شے بھی اگر کسی کے پاس موجود ہے تو وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس بالقوہ ہر ایک شے موجود ہے وجہ یہ ہے کہ یہ حجریات (دھاتیں) اگر سکہ کی شکل میں ہوں یا اپنی سادہ حقیقت پر ہوں اور کسی خاص شکل و صورت (مثلاً زیور، برتن) میں تبدیل نہ ہو گئی ہوں تو ان کی نسبت تمام اشیاء کی جانب مساوی ہی رہے گی، مثلاً اگر کسی شخص کے پاس ایک روپیہ ہے تو متبادل شکل میں گویا اس کے پاس ہر ایک وہ شے موجود ہے جو اس تعداد کے مساوی ہو، لیکن اس کے علاوہ دوسری کسی شے میں یہ قوت موجود نہیں ہے، مثلاً

ایک گز کپڑا ایک گز کپڑا ہی رہے گا، ایک سیر شکر یا دس سیر گیہوں یا ایک سیر گھی کی شکل اس وقت تک اختیار نہیں کر سکتا جب تک کہ یہی سونا چاندی اس باہمی تبادلے کے لیے ''میزانِ عدل'' بن کر فیصلہ نہ کر دیں۔

سونا و چاندی (نقدین) گردش میں رہیں، کنز (ذخیرہ) نہ بنیں:

تو اب ظاہر ہے کہ ایسی شے جو منفعت عامہ (Public Benefit) کے لیے اس قدر ضروری اور مختلف و متضاد اشیاء کی جانب مساوی نسبت رکھتی ہو از بس ضروری ہے کہ وہ نہ خود مقصود بالذات ہو اور نہ دوسری اشیاء کی طرح خاص شکل و صورت (زیور، برتن وغیرہ) میں محدود ہو تا کہ کل اشیاء کے درمیان ''وسیلہ'' اور ''ذریعہ'' بن سکے جیسا کہ آئینہ کہ اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں مگر ہر ایک کو ظاہر کر دیتا ہے، یا جیسا کہ حرف اپنی حقیقت میں کوئی معنی نہیں رکھتا مگر تمام معانی کے اظہار کے لیے واحد ذریعہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دھاتوں کی تخلیق اسی لیے فرمائی ہے کہ بیع و شرا میں مقصود بالذات ''مبیع'' نہ بنائی جائیں بلکہ ذریعۂ خرید فروخت (ثمن) قرار دی جائیں اور اسی لیے ان کو ''کنز'' نہ بنایا جائے بلکہ ہاتھوں میں دائر سائر رکھا جائے تا کہ معاشی نظام میں اختلال واقع نہ ہو۔

دراہم و دنانیر (یعنی سونا چاندی) کی تخلیق اس لیے نہیں ہے کہ یہ حجریات انسان کی معاشی ضروریات میں مقصود بالذات ہیں بلکہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور یہ کہ یہ اسی وقت وسیلہ ہو سکتی ہیں جبکہ کنز اور خزانہ نہ بنائی جائیں بلکہ لوگوں کے ہاتھوں میں جاری ساری رہیں تا کہ وہ اشیاء کے مبادلہ میں ''میزانِ عدل'' بن سکیں۔ یہی وہ حقیقت ثابتہ ہے جس کو چشمِ بصیرت ہر ایک لمحہ صفحہ موجودات پر خطِ الٰہی کی ان سطور پر پڑھتی رہتی ہے جن میں نہ حرف ہے اور نہ آواز اور جو آنکھیں اس تحریر کے ادراک سے عاجز ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قرآن حکیم میں اس کو بخوبی واضح فرما دیا ہے، چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾﴾ (۱)

ترجمہ: جو لوگ خزانہ کرتے ہیں سونے اور چاندی کو اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے پس ان کو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔

سونا چاندی کا نقد کے سوا دوسرا استعمال ناجائز:

اور اسی حقیقت کے پیشِ نظر سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار پایا اس لیے کہ برتن کی جو غرض ہے یعنی اشیاء کو محفوظ رکھنا وہ مٹی، بلور، لکڑی، پیتل، تانبا اور لوہا جیسی چیزوں کے ظروف سے بھی پوری ہو سکتی ہے، لیکن یہ اشیاء سونے چاندی کی طرح مبادلہ اشیاء میں براہِ راست "میزان عدل" نہیں بن سکیں تو اب نقدین (سونا چاندی) کی تخلیق کے مقصد کو باطل کر کے سونے چاندی کے ظروف استعمال کرنے والا بلاشبہ حکمتِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے، پس جو شخص اس حقیقت پر نظر رکھتا ہے، وہ بخوبی اس حدیث کے مضمون کی حقیقت کو معلوم کر سکتا ہے۔

من شرب في انية من ذهب أو فضة فكأنّما يجرّ في بطنه نار جهنم. (۲)

ترجمہ: جس شخص نے سونے یا چاندی کے برتن میں پیا (کھایا) تو گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔

---

(۱) سورة التوبة: ٣٤

(۲) متفق علیہ۔ احیاء علوم الدین میں اس کو حدیث نہیں کہا گیا، مگر بخاری اور مسلم کی اس حدیث کو اس کی شرح اتحاف میں متفق علیہ کہا ہے۔ صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب تحريم استعمال اواني الذهب والفضة الخ

سونا چاندی کا تبادلہ معاشی لین دین کی سہولت کا ذریعہ:

پس واضح رہے کہ جو شخص بھی سونے، چاندی (روپیہ اشرفی، درہم و دینار) میں "ربوا" کا معاملہ کرتا ہے یعنی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کی خلاف ورزی کا مرتکب اور معاشی نظام کے اختلال کا باعث ہی بنتا ہے اور ان حجریات کی تخلیق میں فطرتِ الٰہی نے جو قانون وضع کر دیا ہے اس کو توڑ کر ظلم اور کفرانِ نعمت کا باعث ہوتا ہے۔

کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اگر حقیقتِ حال یہ ہے تو اسلام نے سونے کو چاندی اور چاندی کو سونے کے ساتھ کمی بیشی سے اور ہم جنس نقد کو مساوی تعداد کے ساتھ خرید و فروخت کی اجازت کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سونا اور چاندی دو مختلف حقیقتیں ہیں اس لیے قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی دونوں میں نمایاں فرق ہے تو ظاہر ہے کہ مطلوبہ اشیاء کی خرید و فروخت میں ان کے ذریعہ اور وسیلہ بننے میں بھی ضرور تفاوت ہو گا مثلاً سونے کے مقابلہ میں چاندی بکثرت بنتی رہتی ہے، کیونکہ اس سے مطلوبہ شے کم سے کم مقدار میں بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پس اگر ان کے مابین کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کی اجازت نہ ہوتی تو بسا اوقات ان کے وسیلہ اور ذریعہ بننے میں دشواری پیش آجایا کرتی اور لوگوں کو معاشی زندگی میں یسر اور آسانی کی جگہ عسر اور دشواری کا منہ دیکھنا پڑتا، مثلاً اگر کسی کے پاس فقط سونا ہے اور اس کو معمولی اشیاء خرید کرنی ہیں جو سونے کے دینار یا اشرفی کی قیمت سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتیں تو اس کے لیے خریداری کی صورت کیا ہوتی؟ پس سونے کا چاندی کے ساتھ اور ایک دینار کا درہم اور ایک اشرفی کا چند روپوں کے ساتھ اگر تبادلہ جائز نہ ہوتا تو اس کو مطلوبہ شے کی خریداری میں سخت دشواری پیش آجاتی۔

ہم جنس (Homogeneous) سکوں کا تبادلہ مساوی ہو:

نیز ایک درہم کا ایک درہم کے ساتھ اور ایک دینار یا اشرفی کے ساتھ تبادلہ اس

لیے جائز قرار پایا کہ اس عمل سے معاشی نظام پر مطلق کوئی برا اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ اگر یہ دونوں یکساں حیثیت میں ہیں اور کچھ کھوٹے کھرے کا فرق نہیں ہے تو تبادلہ ایک عبث حرکت ہو گی۔ گویا ایسا ہو گا کہ ایک شخص نے ایک درہم یا ایک روپیہ زمین پر رکھ دیا اور پھر ایک منٹ کے بعد اس کو زمین سے اٹھا لیا اور ظاہر ہے کہ کوئی عاقل ایسا نہ کرے گا، اور اگر باہم کھرے اور کھوٹے کا فرق ہے تو مساوات کی صورت میں تو کھرے درہم کا مالک فروخت کرنے پر راضی نہ ہو گا، کیونکہ ان کا کھلا نقصان ہے اور عدم مساوات کی صورت میں اسلام کا نظامِ معاشی اجازت نہیں دے گا، کیونکہ ایسی صورت میں ان حجریات کی تخلیق کا جو مقصود ہے وہ فوت ہو جاتا ہے اور جو "حقیقت" اشیاءِ مقصودہ مطلوبہ کے حصول میں ذریعہ اور وسیلہ بننے کے لیے مخلوق ہوئی ہے وہ مقصود بالذات بن کر معاشی نظام کے نظم میں اختلال کے باعث اور حکمتِ الٰہیہ کے خلاف سبب بن جاتی ہے، جیسا کہ سطورِ بالا میں واضح ہو چکا ہے۔

اور یہی صورتِ حال ہے اجناس میں ہم جنس کے باہم تبادلہ کی اور اس لیے ان میں بھی مسطورہ بالا حکمِ عدم جواز ہی نافذ ہو گا۔

یہ تبادلہ نقد ہو ادھار نہ ہو:

اور اگر سونا چاندی کا ہم جنس تبادلہ ادھار کی شکل میں بشرطِ مساوات ہو تو (معاشی وجوہ کے علاوہ) اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ممنوع ہے کیونکہ حقیقت میں یہ تبادلہ اور خرید و فروخت کا نہیں بلکہ قرض کا معاملہ ہے اور قرض کی بنیاد بغیر معاوضہ حاجت مند کی حاجت پورا کر دینے پر ہے جو سر تا سر اخلاقی مسئلہ ہے اور موجبِ اجر و ثواب ہے۔ پس جو شخص اس کو اخلاقی وصف سے نکال کر معاوضہ اور مبادلہ کی شکل دیتا ہے دراصل وہ اخلاق کے ایک اہم مسئلہ کی تخریب کے درپے ہے جو مذہب کی نگاہ میں سخت معیوب ہے اس لیے اس اخلاقی مسئلہ کو قانونی مسئلہ بنانا ضروری سمجھا گیا اور عدمِ جواز کا حکم دیا گیا اور اجناس میں اسی طرح کا معاملہ اس لیے بھی ممنوع ہے کہ جو شخص اس قسم کا کاروبار کرتا ہے وہ جب ہی کر سکتا ہے کہ اس کے پاس

غلہ یا دوسری کوئی جنس وافر مقدار میں موجود ہو اور وہ اس سے مستغنی ہو تو ایسی صورت میں وہ احتکار کا مرتکب ہے یعنی جنسِ مذکور کو جو عام حاجات وضروریات کے لیے ہے جمع اور خزانہ کر کے یہ چاہتا ہے کہ اس جنس کے نرخ (ارزانی و گرانی) کا معاملہ بازار سے قطع ہو کر اس کے ہاتھ میں آجائے اور اس طرح گویا ان اشیاء کی مقصدِ تخلیق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر شریعتِ اسلامیہ میں محتکر (ذخیرہ اندوز) پر لعنت وارد ہوئی، اور اس کے حق میں شدید قسم کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔[1]

امام فخرالدین رازی رحمہ اللہ کے دلائل

امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں:

"علماء اسلام نے رباء حرمت پر متعدد دلائل بیان فرمائے ہیں:

سود بغیر عوض اور مبادلہ کے ہوتا ہے:

❶ جو شخص ایک درم (یا ایک روپیہ) کو دو درہم (یا دو روپے) کے عوض میں فروخت کرتا ہے، نقد کا معاملہ ہو یا ادھار کا تو اس کو ایک اہم درہم (یا ایک روپیہ) مفت ہاتھ آتا ہے جس کے مقابلہ میں اس کی جانب سے کوئی عوض موجود نہیں ہے، حالانکہ خرید و فروخت میں جانبین سے معاوضہ اور مبادلہ ضروری شے ہے، پس جو درہم یا روپیہ بغیر عوض اس نے حاصل کیا اس میں اس کی جانب سے نہ مال متقوم (اصل) کا کوئی دخل ہے اور نہ محنت کا۔ اور چونکہ انسان کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کے لیے "مال" ازبس ضروری شے ہے، اس لیے اس کی حفاظت و عزت انسان کے خون (جان) کی برابر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: "حرمة مال الانسان كحرمة دمه" (انسان کے مال کی حرمت اس کے خوان کی

---

(۱) امام غزالی: احیاء علوم الدین، مطبوعہ قاهرة، ٤/٧٩، ٨٠. زبیدی: اتحاف السادة المتقين، مطبوعه دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، قاهرة، ٩/٦٣، ٦٨

حرمت کی طرح ہی ہے)۔ پس جو شخص دوسرے کے مال کو بغیر عوض کے لیتا ہے وہ بلاشبہ سخت اور ظلم ہے اور اس لیے ایسا معاملہ قطعاً حرام ہے اور اگر اس موقعہ پر یہ کہا جائے کہ درہم زائد اس لیے زائد نہیں کہ بائع یا قرض دینے والے نے جو درہم مشتری یا قرض دار کو ایک مدت کے لیے دیا ہے، اگر اس مدت میں وہ اس کے اپنے پاس رہتا تو ممکن تھا کہ وہ اس سے تجارت کے لیے نفع حاصل کر سکتا، اب جبکہ اس مدت میں اس کے پاس نہ رہا تو یہ "قدر زائد" (Surplus Value) اس کا عوض ہے۔ اور راس المال "اصل" قرض دار کے پاس ایک مدت تک مقید رہا اور قرض خواہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا، کیونکہ اگر اس کا مال اس کے پاس رہتا تو تجارت کے ذریعہ سے اس سے فائدہ اٹھاتا۔ اب جبکہ اس نے قرض دار کو دے دیا تو یہ اس درہم سے تجارت کے ذریعہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اس کو اس قدر نفع ہو کہ زائد درہم اس میں سے ادا کر دینے کے قابل ہو جائے۔ لہٰذا اس کو "قدر زائد" کہنا صحیح نہیں، بلکہ یہ بھی درحقیقت عوض اور "اصل" ہی ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو درہم (اصل) بائع نے مشتری کو یا قرض دار نے قرض خواہ کو دیا ہے، وہ اگر اس کے اپنے پاس رہتا تو یہ یقینی نہیں تھا کہ اس سے ضرور نفع حاصل ہوتا، بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تجارت میں نقصان پا کر اس اصل کو بھی کھو بیٹھتا، لیکن دو درہم کے مقابلہ میں قرض دینے یا فروخت کرنے کی شکل میں ایک درہم کا زائد یا مفت ہاتھ آجانا قطعی اور یقینی امر ہے۔ پس امر موہوم (Uncertain) کے مقابلہ میں اس یقینی نفع کی اجازت دے دینا معاشی نقطۂ نظر سے ایک جانب کو قصد النقصان پہنچانا ہے اس لیے حرام ہے۔

سود کی کوکھ سے مفت خوروں کا طبقہ جنم لیتا ہے:

❷ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ معاشی نظام کی بنیادیں، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت جیسے ستونوں پر قائم ہیں اور ان ہی کی بدولت کسی ملک میں رفاہیت کے سامان مہیا ہو سکتے ہیں۔ پس اگر معاشی نظام میں (ربوا) کی اجازت دے دی جائے

جس میں کسب معاش کے ان حقیقی ذرائع کی بجائے بے محنت ایک کے دو اور دو سے بھی زیادہ ہو سکیں، تو اس ملک میں ایک مستقل طبقہ ایسا پیدا ہو جائے گا جو ان تمام صحیح اور حقیقی ذرائع کو چھوڑ کر اسی کو ذریعہ معاش بنا لے گا، اور اس طرح منافع عوام کو نقصان پہنچا کر معاشی نظام کے اختلال کا باعث بن جائے گا اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس طرح دولت پر ایک مخصوص طبقہ کا اجارہ ہو جائے گا اور انجام کار عام کساد بازاری پیدا ہو جائے گی۔

سود محتاج اور مضطر کا استحصال کرتا ہے:

۳ عام طور پر ایک درہم لے کر دو درہم دینے کا معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اضطراری حالت میں ہو اور معاشی حاجت و ضرورت کے لیے نقدین کا محتاج ہو اور وہی شخص اس کاروبار کو چلا سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ بصورتِ اصل (راس المال) موجود ہو۔ یوں کہہ لیجئے کہ قرض لینے والا اکثر غریب فقیر اور مضطر ہو گا جو بوجہ مجبوری اپنی حاجت و ضرورت میں ایک کے دو دینے پر آمادہ ہو جائے گا اور قرض دینے والا غنی اور سرمایہ دار ہو گا، پس اگر اس معاملہ ربویہ (Usurious) کو جائز رکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ صاحبِ ضرورت اور زیادہ فقیر اور محتاج ہو تا چلا جائے اور غنی و صاحبِ دولت آہستہ آہستہ دولت و ثروت پر قابض ہو جائے اور ظاہر ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد رحمتِ عام پر قائم ہو وہ کس طرح ایسے معاملہ کی اجازت دے سکتا ہے۔

سود اخوت و مروت کا قاتل:

۴ ربا (سود) کو اس لیے حرام کیا گیا کہ وہ باہمی ہمدردی اور حسنِ سلوک کا خاتمہ کرتا ہے اس لیے کہ بسا اوقات انسان اپنی ضرورت و حاجت میں قرض پر مجبور ہو تا ہے اس وقت اخلاق کا تقاضا ہے کہ صاحبِ دولت صاحبِ حاجت کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور بغیر کسی معاوضہ کے قرض دے، پس اگر کسی

معاشی نظام میں ربا کی اجازت ہو تو پھر کوئی شخص بھی آسانی کے ساتھ قرض بغیر معاوضہ پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور اس طرح مواساۃ و احسان کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔[1]

اس پر یہ اضافہ کر لیجئے کہ قرض بلا معاوضہ صرف اخلاقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ معاشی مسئلہ بھی ہے، اس لیے علماء معاشین کے نزدیک انسانی معاشرت میں جائز ضروریات کے لیے خواہ وہ حکومت کے سلسلہ کی ہوں یا انفرادی اور شخصی سلسلہ کی، قرض کا معاملہ ناگزیر ہے پس اگر قابلِ اطمینان ضمانت کے ساتھ قرض کا معاملہ ہو تو اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔

1. قرض اس امید پر دیا جائے کہ یہ قدرِ زائد کے حصول کا ذریعہ ہے۔
2. اس لیے دیا جائے کہ ضرورت سے فاضل دولت حاجت مند کی حاجت کو اس طرح پورا کر دے کہ "اصل" (راس المال) کسی حال میں ضائع نہ ہونے پائے۔

تو جس معاشی نظام میں پہلی صورت جائز ہوگی بلاشبہ اس میں قرض کا مقصد فوت ہو کر ایک ایسا بیوپار بن جائے گا جس کے نتیجہ اور ثمرہ میں دولت مند کی دولت کا اضافہ قرض خواہ کے نقصان کے ساتھ وابستہ ہو جائے اور اس طرح انسانی معاشرت میں فاقہ مست محتاجوں کی کثرت، دولت کو سمیٹ کر دولت مندوں کے ایک خاص طبہ کے اندر محدود کر دے گی اور عام کساد بازاری کا باعث ہوگی، لہذا "صالح معاشی نظام" میں قرض کا معاملہ دوسرے اصول پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔

حافظ ابن قیم جوزیہ رحمہ اللہ کے دلائل:

ربا کی دونوں قسمیں حرام ہیں:

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ[2] تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) رازی، امام فخر الدین: تفسیر کبیر، ج ۲، تفسیر ایات الربا، ص ۳۵۲، ۳۵۳

(۲) ابن قیم رحمہ اللہ، حافظ ابو عبد اللہ محمد بن بکر بن ایوب بن سعد زرعی دمشقی لقب حافظ ابن قیم جوزیہ رحمہ اللہ (م ۷۵۱ھ) فقہ حنبلی کے بہت بڑے امام، محدث، فقیہہ اور مناظر تھے۔ اپنے موقف سے وفا اور اس کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا ان کا شعار تھا۔ دمشق کے تاریخی قلعہ میں ایک عرصہ تک قید رہے۔ ان کی

"ربا" کی دو قسمیں ہیں ایک جلی (ظاہر) اور دوسری خفی (مستور) جلی کو اس لیے حرام کیا گیا کہ اس کی حقیقت میں ضررِ عظیم اور مفسدۂ شدید موجود ہے، اور خفی کو اس لیے حرام کیا گیا کہ وہ ربا جلی کے لیے وسیلہ اور ذریعہ بنتا ہے، لہٰذا ربا جلی کی حرمت مقصود بالذات ہے اور ربا خفی کی حرمت ذریعہ اور وسیلہ کے سد باب کی بنا پر ہے۔ "ربا جلی" ربا نسیہ (قرض و ادھار پر سود کا معاملہ) کا نام ہے اور یہ وہ ربا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں بھی رائج تھا، مثلاً وہ کسی حاجت مند کو قرض دیتے اور جب وہ مدت موجودہ پر ادا نہ کرتا تو اس شرط پر مدت کا اضافہ کرتے جاتے کہ اس قدر زائد دینا ہوگا، اور اس طرح مدت میں اضافہ کے ساتھ زیادتِ مال (سود) کا اضافہ کرتے جاتے، حتیٰ کہ ایک سو کی رقم ہزاروں ہزار تک پہنچ جاتی اور اس قسم کا معاملہ وہی لوگ قبول کرتے تھے جو محتاج، مفلس اور نادار ہوتے اور قرض خواہ کی رقم ادا کرنے سے قاصر رہتے، وہ جب یہ دیکھتے تھے کہ قرض خواہ قرض کی رقم پر اضافہ (سود) کی وجہ سے ادائے قرض میں مہلت دے دیتا ہے تو تقاضہ کی شدت اور عدم ادا کی شکل میں (دیوانی) قید و بند کی مصیبت سے گھبرا کر اور مضطر ہو کر جبراً اس اضافہ کو برداشت کرتے جاتے تھے اور وقت پر وقت گزرتا چلا جاتا تھا، حتیٰ کہ نوبت آجاتی کہ تاخیر کی بدولت اضافہ مال کا نقصان شدید سے شدید تر ہو جاتا، اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا اور قرض کی رقم پر سود بڑھتے بڑھتے اس کی تمام موجودات پر حاوی ہو جاتا، اور اس کی تمام مملوکہ اشیاء پر قرض میں مستغرق ہو کر رہ جاتیں۔ پس ربا کے اس معاملہ نے یہ شکل پیدا کر دی کہ مفلس قرض دار پر رقم کا جو اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے عوض میں اس کو کوئی مالی نفع حاصل نہیں ہوا اور قرض خواہ کو قدرِ زائد اور اضافہ سود دوسرے کو بغیر نفع پہنچائے اور عوض دیئے حاصل ہوتا رہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے

مشہور کتب میں "اعلام المعوقین عن رب العالمین، الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، اور مدارج السالکین بین منازل ایاك نعبد وایاك نستعین" ہیں۔

بھائی کا مال باطل طریقہ سے کھاتا اور اس کو انتہائی نقصان اور ضرر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پس ارحم الراحمین کی رحمت و حکمت اور مخلوق پر احسان کا تقاضا ہوا کہ اس نے ربا کو حرام کر دیا اور ربا کھانے والے، ربا کی دستاویز لکھنے والے اور اس پر گواہی کے دستخط کرنے والے کو معلون ٹھہرایا اور جو شخص اس ملعون معاملہ سے باز نہ رہے اس کو اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ جنگ کا چیلنج دیا، اور بڑے بڑے گناہوں میں سے کسی گناہ پر اس قدر سخت وعید کا نزول نہیں ہوا اور اسی بنا پر یہ (ربا) اکبر الکبائر (بڑے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ) شمار ہوا۔ اور ربا الفضل (ربا خفی) کی حرمت سد وسائل و ذرائع کی بنا پر ہے، جیسا کہ حدیث ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بصراحت معلوم ہوتا ہے۔

عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم لا تبیعوا الدرهم بالدرهمین فإنی أخاف علیکم الربا.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک درہم کو دو درہم کے عوض نہ خرید و فروخت کرو کیونکہ ایسی صورت میں مجھے خوف ہے کہ تم ربا میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربا الفضل" (یعنی نقد بیع و شرا میں قدرِ زائد کے حصول کو) اس خوف سے منع فرمایا کہ "ربا الفضل" ربا النسیۃ (ادھار پر سودی لین دین) تک پہنچا دیتا ہے اور یہ اس لیے کہ ایک عقل مند ایک درہم کو دو درہم کے ساتھ اسی صورت میں خرید و فروخت کر سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کھرے اور کھوٹے سکے میں تفاوت یا ہلکے اور بھاری کا فرق جیسی صفات موجود ہوں، پس اگر وہ جنس کی وحدت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے صفات کے تفاوت کو معیار قرار دیتا ہے تو یہ تفاوت اس کو نقد معاملہ سے ہٹا کر ادھار کے لین دین تک بآسانی پہنچا دے گا اور اسی کا نام "ربا النسیۃ" ہے (بلکہ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا) کہ مثلاً کھرا سکہ (ثمن، نقد) قرار پا جائے گا اور کھوٹا مبیع، خرید کا مال اور یہ کہہ دینا آسان ہو گا کہ اگر ایک

جانب مال ہو اور دوسری جانب ''نقد سکہ'' تو جس طرح سکہ کے معاملہ میں ادھار درست ہے اسی طرح یہاں بھی ادھار کیوں جائز نہ ہو اور بالآخر ''ربا الفضل'' کے کاروباری ''ربا النسیہ'' کے مرتکب ہو جائیں گے۔ (۱) اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ ''ربا الفضل'' ربا النسیہ کے لیے قریب سے قریب تر ذریعہ اور وسیلہ ہے، پس شارع (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حکمت نے یہ فیصلہ کیا کہ امت پر اس قریب تر ذریعہ اور وسیلہ کا دروازہ بھی بند کر دیا جائے (۲) اور بلاشبہ یہ حکمت عقل و فطرت کے عین مطابق اور سودی مفاسد کے سدِ باب کے لیے بہترین ہے۔ (۳)

ربا الفضل اور ربا النسیہ کی حکمتیں:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اور شارع حکیم و دانا ہے وہ انسان کی مصالح اور ضروریات پر پابندیاں اس وقت تک نہیں لگاتا جب تک کہ کسی معاملہ میں ضمنی یا لزومی (Compulsory) طور پر ایسا مفسدہ موجود نہ ہو جو مصلحت و ضرورت کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اور ''ربا الفضل'' کی حرمت سے متعلق حکمت بہت سے لوگوں پر مستور ہے، حتی کہ بعض متاخرین نے اعتراف کیا ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ''ربا الفضل'' کی حرمت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے حالانکہ گزشتہ سطور میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ربا الفضل کی حرمت شریعت کی عظیم الشان حکمت اور مخلوقِ خدا کی مصالح کی بہترین حفاظت پر مبنی ہے اور یہ کہ ربا کی دو قسمیں ہیں:

❶ ''ربا نسیہ'' اور اس کی حرمت تحریم المقاصد میں سے ہے (یعنی ان امور میں سے ہے جن کو صاحبِ شریعت حرام قرار دینا شریعت کے اہم مقاصد میں سے سمجھتا ہے) اور

---

(۱) قوسین میں مؤلف کی جانب سے تشریحی اضافہ ہے۔

(۲) قال عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ: دعوا الربا والربیۃ (ربا اور ربا کی طرح کے مشتبہ معاملات ترک کر دو۔)

(۳) ابن قیم، حافظ: إعلام الموقعین، مطبوعہ قاھرۃ، ۹۹/۲، ۱۰۰

❷ "ربا الفضل" اور اس کی حرمت ذرائع اور وسائل کی حرمت میں سے ہے اس لیے نفوس انسانی کی یہ کمزوری ہے کہ جب ان کو نقد نفع کی راہیں تنگ نظر آتی ہیں تو پھر وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح نفع مؤخر ہی میسر آجائے اور اس طرح ربا النسیہ تک پہنچ جاتے ہیں، پس شارع نے ایسے وسیلہ کو بند کر دینا ہی ضروری سمجھا اور اس لیے ربا الفضل پر بھی ممانعت کی باڑھ لگا دی تا کہ ربا النسیہ تک کوئی نہ پہنچ سکے، اب اہل نظر انصاف کریں کہ اس سے بہتر حکمت اور حکم کیا ہو سکتا ہے۔ (۱)

خلاصہ: غرض اسلام نے "سود" کو کسی حالت میں برداشت نہیں کیا اور اس کے اقتصادی نظام کے بنائے ہوئے نقشہ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ معاشرتی اور اخلاقی تباہ کاریوں کے اسباب و علل میں سے بہت بڑا ذریعہ اور اہم سبب یہی "سود" ہے۔

نیز اس نے سود کی صرف ان ہی چند اقسام کو ممنوع نہیں قرار دیا جو زمانۂ جاہلیت میں مشرکین عرب کے یہاں رائج تھیں یا آج بھی عام طور پر رائج ہیں، بلکہ اس سے متعلق "چند اصول" بیان کر کے ان تمام شکلوں کا بھی سدِ باب کر دیا جن کا آخری نتیجہ "سود" کی طرح بغیر محنت کے کمائی نکلتا تھا، اور ان سب کو سود ہی کے احکام میں شامل کر دیا۔

بینک (Bank)

جدید نظام بنکاری کے مقاصد:

اسلام نے حرمتِ سود (ربا) سے متعلق جو اصول قائم کیے ہیں، عام سودی لین دین کے علاوہ دورِ جدید کے بعض وہ ترقی یافتہ ادارے اور کمپنیاں بھی اس حرمت کے تحت آجاتی ہیں جن کا مدار سودی لین دین پر ہے، چنانچہ ان میں سے ایک ادارہ "بینکنگ سسٹم" ہے کہا جاتا ہے کہ بڑی بڑی تجارتوں کو آسانی، دولت و ثروت کے

---

(۱) حوالہ بالا: ۲۰۴/۳

ذخیروں کی حفاظت اور ان سے مزید زرکشی کے لیے اس ترقی یافتہ زمانہ میں ''بینکوں کا وجود'' ازبس ضروری اور نہایت کارآمد و مفید ہے۔

لیکن اس خوش نما رنگ و روپ میں جو ''مار سیاہ'' (Black Snake) پوشیدہ ہے اور اس ظاہر انگبین (Honey) میں جو زہر قاتل مستور ہے اگر اس کی تحلیل کی جائے اور اس کو بے نقاب کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ''بینکوں کا وجود'' اس لیے ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ اور پونجی میں بے پناہ اضاہ ہو اور جس دولت و ثروت کے ذریعہ محنت کے اشتراک سے متوسط اور غریب طبقے کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکتا تھا اس کا انسداد ہو کر وہ دولت سمٹ سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محصور ہو جائے اور تمام تجارتی کاروبار کے نفع و نقصان کی قسمت چند بینکروں کے ہاتھ میں مقید ہو کر رہ جائے اور اس طرح بینکوں کے سودی جال سے نہ کوئی تجارت محفوظ رہے اور نہ زراعت اور نہ روز مرہ کی معاشرت، اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ ایک طرف بڑے بڑے قارون مثالی سرمایہ دار ہوں اور دوسری جانب کروڑوں مفلس، نادار اور محتاج ہوں، جو بدن کے لیے کپڑا اور پیٹ کے لیے روٹی تک نہ رکھتے ہوں اور موسم سرما کی سردی اور گرما کی گرمی سے حیوانوں سے بدتر حال میں تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہوں یا زار و نزار حالت میں سسکتے رہنے کے عادی ہوں۔

بنکوں کے معاشی نقصانات:

❶ بے شک بینک بہت مفید اور نہایت ضروری چیز ہے لیکن سرمایہ داروں کے لیے، غریبوں کے لیے نہیں اس لیے کہ وہ قارونی دولت کی کاشت کے لیے ابر نیساں (Rainy Cloud) ہے اور غریبوں کی نعشوں پر سرمایہ کی تعمیر کے لیے بہت عمدہ مسالہ۔

❷ اور بلاشبہ بینک نہایت مضر اور تباہ کن شے ہے مگر عوام اور غرباء کے لیے امیروں اور دولت مندوں کے لیے نہیں اس لیے کہ وہ خوب صورت طریقوں سے

دولت کو دولت مندوں میں محدود کرتا اور عوام کی غربت کو ہولناک درجہ تک پہنچا دیتا ہے اور تہذیب نو کا یہ تجارتی حال دراصل دورِ قدیم کی مہاجنی ہنڈیوں کے بیوپار کی نہایت حسین اور شاندار تصویر ہے۔

❸ پس اگر وہ اقتصادی بہتری کے لیے ضروری تھا تو یہ بھی ازبس ضروری ہے اور اگر اس نے عوام کی تباہی پر دولت مندی کی بنیادیں رکھی ہیں تو یہ بھی اسی تباہی کا بہترین نقشِ ثانی ہے۔

اسلام اور بنکاری

اقتصادی نظام کا جو نقشہ اسلام نے بنایا ہے اگر دنیا کو اس کے مطابق چلایا جائے تو پھر بینکوں کے اس موجودہ سسٹم کی کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہتی،[1] کیونکہ دولت حاصل کرنے کی بے روک ٹوک آزادی میسر ہی نہیں آسکتی اور نہ ایسے مہلک طریقوں کی اجازت دے سکتا ہے جو اکثریت کو برباد کر کے چند افراد کا فائدہ کراتے ہوں اور نہ وہ ایسے ترقی یافتہ تجارتی ذرائع کو مانتا ہے جو صرف بڑے بڑے سرمایہ داروں کو ہی فروغ دینے کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور غریبوں کے لیے ان میں معمولی سا حصہ بھی نہ ہو۔

پس جبکہ بینک کا موجودہ سسٹم بھی "سود" کی طرح کا ایک نظام ہے تو اسلامی نظامِ اقتصاد میں اس کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ۔ بنکوں کی افادیت سے انکار کیوں؟

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو جائے کہ بینک کا قیام خواہ مذموم سرمایہ داری کے ترقی دینے ہی کی غرض سے کیا گیا ہو، لیکن موجودہ زمانے میں اس کے عظیم

(۱) اگر بینک سسٹم کی ضرورت تسلیم بھی کر لی جائے تو پھر ان کے قیام کی ایسی شکلیں ممکن ہیں جو سود کے بغیر اس سسٹم کے مقصد کو اس حد تک پورا کر سکیں جس کے لیے ایسے اجتماعی ادارہ کی ضرورت پیش آتی ہے یعنی انفرادی یا اجتماعی ضروریات کے لیے حصولِ زر یا بطورِ امانت روپیہ کا تحفظ۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں اس ممکن صورت کا نقشہ پیش ہو گا۔

الشان فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔[1] تو اس کا جواب یہ ہے کہ بینک کی خوبیاں یہ جو کچھ نظر آتی ہیں قطع نظر اس بات کے کہ اس سے زیادہ اس کے عیوب ہیں، محض اس لیے نظر آتی ہیں کہ موجودہ تجارتی سسٹم دراصل مذموم سرمایہ دارانہ نظام پر چل رہا ہے، لیکن جب اس نظام کو تباہ و برباد کر کے صحیح اور مفید عادلانہ نظام قائم کیا جائے گا تو پھر اس نظام میں ترقی تجارت اور اقتصادی بہبودی کی ضرورت کے لیے قرض و امداد کا انتظام ''بینک کے سسٹم'' کے بغیر بھی نہایت خوبی کے ساتھ چل سکتا ہے۔

متبادل نظام:

اگر بنک سسٹم ناگزیر ہو تو وہ ایسے اصولوں پر قائم رہ کر چلایا جاسکتا ہے جن کے پیشِ نظر نہ قرض و امانت پر ''سود'' کا لین دین ہو سکے اور نہ تجارتی سود کی گنجائش نکل سکے، بلکہ ایک ایسی کمپنی کی شکل میں منتقل ہو جائے جو روپیہ داخل کرنے والوں اور بینکروں کے درمیان ''مضاربۃ'' کی طرح کی تجارت کیا کرے جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آنے والا ہے، دراصل جو کچھ نظر آتا ہے سوسائٹی کے غلط نقشہ کی بدولت نظر آتا ہے، اگر یہ بدل جائے تو اس کی ضروریات و واجبات سب ہی بدل جائیں گے اور دنیا امن، ترقی، فلاح، رفاہیت، اخوت اور ہمدردی کے دھارے پر بہنے لگے گی۔

---

(۱) عام نگاہوں میں بینک بہت فائدہ کی چیز نظر آتے ہیں، لیکن جو لوگ اس کی تاریخ اس کے وجود کی غرض اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بھی سود خواروں اور سرمایہ داروں کے افزونی سرمایہ کا ایک ترقی یافتہ آلہ ہے۔ (دیکھو رسالہ ''جامعہ'' ماہ فروری ۱۹۳۹ء)

نیز اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی صد شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ کی کتاب ''اسلام اور سود'' خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے، موصوف بینک سسٹم پر بحث کرتے ہوئے ص ۱۵۰ پر یورپ کے ایک مشہور معاشی عالم کا یہ مقولہ نقل فرماتے ہیں: ''اس سلسلہ میں مسٹر جافری بیڈلپ کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ ایسا سماج جو اپنے بینکروں کے حلقہ اثر میں ہو اور ان کی اخلاقی تلقین کا روادار باقی رہنے کے قابل نہیں ہے، معاشرے کی خرابیوں کے ذمہ دار یہی بینکار ہیں۔

سودی بنکوں کی چند شکلیں:

ہنڈیوں سے لین دین:

بینک کا یہ سسٹم تو زمانہ جدید کا ترقی یافتہ سسٹم ہے لیکن قدیم زمانہ میں یہی کام ''ہنڈیوں'' سے لیا جاتا تھا، کوئی درشنی ہنڈی کہلاتی تھی کوئی غیر درشنی ہوتی تھی یہ سارا کام بھی سود ہی کے طریقوں پر چلتا تھا۔ جس کو مہاجنوں کی اصطلاح میں ''سود بٹہ'' کہتے تھے۔

اگرچہ ہندوستان میں بینکوں کا رواج کثرت سے ہو گیا ہے تاہم آج بھی ہنڈیوں کا لین دین بند نہیں ہوا اور کل کی طرح آج بھی ہنڈیوں کا لین دین پایا جاتا ہے اور وہ تجارتی کاروبار میں داخل ہیں۔

کواپریٹو سوسائٹیاں:

بینک کے طریقہ کی ایک دوسری چیز ہے جس کو مجلس امداد باہمی'' (Co-operative Society) کہا جاتا ہے، یہ اگرچہ غریب کاشتکاروں، مزدوروں اور متوسط طبقوں کو سستے قرض دینے کے اصول پر چلائی جاتی ہیں، لیکن یہاں بھی چونکہ سود کی نجاست (Dirt) موجود رہتی ہے اس لیے سرکاری طور پر جس قدر بھی ایسی سوسائٹیاں قائم ہیں وہ نتیجہ میں ان غریب قرض خواہوں کے لیے باعثِ وبال بن جاتی ہیں اور مہاجنی دستبرد کی طرح ان کو اس سے بھی فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچتا ہے، خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں قدیم و جدید طریقہ ہائے ربوا کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور وہ ظاہر و خفی ہر قسم کے معاملہ سود کو حرام قرار دیتا ہے۔

اسلام کے معاشی نظام میں اجتماعی کمپنیوں کے ذریعہ امداد باہمی کے طریقے

البتہ اسلام نے امداد باہمی کے اجتماعی اداروں کو کلیۃً ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ اس

نے ناجائز اور صحیح طریقوں کی حوصلہ افزائی کی ہے جو سود کی نجاست سے محفوظ رہ کر اداروں کے حقیقی مقصد کو پورا کرتے ہیں اور خود بھی اپنی جانب سے ان صحیح وسائل کی جانب راہنمائی کی ہے جن کے ذریعہ سے درحقیقت غریب قرض خواہوں کی تباہ زندگی کے سہارے کی شکل پیدا ہو سکتی ہے، یعنی "امداد باہمی" کے نام سے ایسی مجالس (Societies) قائم کی جائیں جو مفید ہونے کے اعتبار سے وہی کام دیں جو آج کل کے دور جدید میں "کواپریٹو سوسائٹیوں" کا کام دیتی ہیں، لیکن ان کے لین دین میں سود کا (خواہ وہ کتنی ہی کم مقدار میں کیوں نہ ہو) ہرگز ہرگز دخل نہ ہو بلکہ سوسائٹی کے اصل سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور عملہ کے اخراجات حاصل کرنے کے لیے "منافع" کے ایسے جائز طریقے اختیار کیے جائیں جن کے بعد ایک طرف امدادِ باہمی کی مجالس کا فائدہ حقیقی بن جائے اور دوسری جانب اصل سرمایہ کے تحفظ اور مجلس کے انتظامی کاروبار کے مصارف کا سامان مہیا ہو جائے تاکہ یہ مجالس قائم رہ سکیں۔

مثلاً پبلک سوسائٹیوں کا نظام اس طرح قائم کیا جائے کہ تجارتی، زراعتی، صنعتی وغیرہ ناموں سے ہر ایک جماعت کی جدا جدا مجالس قائم ہوں اور امدادِ باہمی کی رقوم کے علاوہ نظم و انتظام اور بقاو ترقی مجالس کے لیے رائے عامہ کے استصواب کے ساتھ اس جماعت کے افراد پر ایک ہلکا ٹیکس لگا دیا جائے جو سود کے قائم مقام رقم کی کفالت کر سکے اور افراد کی مالی حالت کے تناسب سے لیا جائے۔

اس کو یوں سمجھیے کہ "تجارتی کواپریٹو سوسائٹی" میں مثلاً جو رقوم دی جائیں وہ سود کے لالچ میں نہ دی جائیں بلکہ حسن سلوک اور انفاق فی سبیل اللہ کے اصول پر لگائی جائیں اور اس کے نظم و نسق چلانے اور مجلس کے افادہ کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لیے تاجروں پر ایک ایسا معمولی ٹیکس مالی تناسب کے اعتبار سے لگا دیا جائے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے اور "پبلک ٹیکس" کے بوجھ سے پریشان بھی نہ ہو، البتہ ایسے قوانین کے لیے استصواب رائے عامہ (Public Franchise) ضروری ہے،[1] امداد

(۱) اس لیے کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافتِ راشدہ کا اسوۂ حسنہ اسی جانب راہنمائی کر رہا ہے۔

باہمی کے اس طریقہ کے علاوہ چند اور ایسے طریقے بھی ہیں جو آج کل کی سوسائٹیوں کے طریقوں سے ملتے جلتے ہیں مگر سود کی بجائے ان میں "نفع" لے کر کام چلانے کا دوسرا ڈھنگ بتایا گیا ہے، فقہ اسلامی کے ابوابِ معاملات میں ان کی بعض جزئیات منقول ہیں اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے وقت علماء محققین کے ذریعہ تفصیلات و جزئیات سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہاں ہم قصداً ان کے بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں اس لیے کہ تفصیلات و جزئیات میں تو خوفِ طوالت ہے اور صرف اصول نقل کر دینے سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان کو دیکھ کر خود عملی پروگرام بنانے میں ایسی غلطی نہ ہو جائے کہ شریعتِ اسلامی کی نگاہ میں وہ سود کی حرمت میں داخل ہو جائے۔ (۱)

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے یہاں نہایت اختصار سے "بلا سود بنکاری" کی ضرورت، طریقہ کار اور منصوبہ بندی کا ایک جائزہ پیش کیا ہے اور اس کی تفصیلات کو مسلم فقہاء اور ماہرین مسلم معیشت دانوں پر چھوڑ دی ہیں کیونکہ یہ کام کسی ایک فقیہہ یا ماہر معیشت دان کا نہیں بلکہ اگر ایسا متبادل غیر سودی پروگرام بنا کر کسی ایک شخص ـــــ خواہ وہ کسی لیاقت (Calibre) کا مالک ہو ـــــ کے سپرد برائے عمل (For Implementation) کر دیا جائے تو اس میں بھی خطرہ کا عنصر باقی رہے گا کیونکہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی گود میں پلے بڑھے معیشت دان اور سیاست دا، یا فوجی حکمران ـــــ جو سود کو موجودہ ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں ـــــ اسلام کے نام پر سود کا کوئی نہ کوئی دروازہ ضرور کھلا رکھیں گے، جیسا جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت میں کہ بیع مؤجل (جس میں مبیع (Commidity for Sale) کی قیمت فوری نہیں بلکہ ایک مقررہ مدت پر یک مشت (Lump Sum) یا با اقساط (Instalments) ادا کی جاسکتی ہے) اور بیع مرابحہ (جس میں ایک مشتری (Buyer) ایک شے بقاعدہ معاہدہ تجارت سے خریدتا ہے پھر ثمن (قیمت) اول پر کچھ نفع مقرر کر کے اسے آگے کسی دوسرے مشتری کو فروخت کر کے منتقل کر دیتا ہے، مختصر یوں کہیے کہ قیمت یا ثمن اول پر کچھ معلوم نفع لے کر بیچنا مرابحہ ہے) کے نام پر اور مارک اپ (Mark Up) کے نام سے سودی کاروبار خوب کیا گیا۔

مگر مصنف رحمہ اللہ کی بصیرت، رسائی عقل اور خطرات کو بھانپنے کی صلاحیت کی داد دینا پڑتی ہے کہ جو کچھ انہوں نے ۷۰، ۷۵ سال پہلے محسوس کیا، اس کی عملی شکل ضیاء الحق دور میں اسلام کے لاگو کرنے (Islamization) والوں میں سے ایک بہت معتبر شخصیت سابق جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے دیکھی ہے، اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن شریعۃ ایپلیٹ بنچ سپریم کورٹ کے ممبر اور اس بورڈ کے سرگرم معاون رہے، جس نے غیر سودی نظام پر کونسل کی جامع، مفصل اور تحقیقی رپورٹ تیار کی، مگر جب ضیاء الحق مرحوم کے سرکاری پرزوں اور اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے معیشت دانوں نے اس رپورٹ کی روشنی میں سرکاری

مالیات، سرکاری قرضوں اور بنکوں کے قرضوں اور پالیسیوں کا طریق کار طے کیا اور لاگو کیا تو وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپوٹ سے بالکل مختلف پورے کا پورا سودی نظام تھا۔ سابق جسٹس مولانا تقی عثمانی نے اپنے ایک مقالہ میں اس افسوس ناک صورت حال کا ذکر کس طرح کیا ہے۔

''بلا سود بنکاری پر اب تک جو علمی اور تحقیقی کام سامنے آیا ہے، ان میں احقر کی معلومات کی حد تک سب سے زیادہ جامع، مفصل اور تحقیقی رپورٹ وہ ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے علماء کرام اور ماہرین معاشیات و بنکاری کی مدد سے مرتب کی ہے اور اب منظر عام پر آچکی ہے اس رپورٹ کا حاصل بھی یہی ہے کہ بلا سود بنکاری کی اصل بنیاد نفع ونقصان کی تقسیم پر قائم ہوگی، اور بینک کا بیشتر کاروبار شرکت یا مضاربت پر مبنی ہوگا، البتہ جن کاموں میں شرکت یا مضاربت کار آمد نہیں ہوسکتی، وہاں کے لیے اس رپورٹ میں کچھ اور متبادل راستے بھی تجویز کیے گئے ہیں جنہیں بوقت ضرورت عبوری دور میں اختیار کیا جاسکتا ہے انہی متبادل راستوں میں ایک متبادل راستہ وہ ہے جسے اس رپورٹ میں ''بیع موجل'' کا نام دیا گیا ہے۔''

''اس طریق کار کا خلاصہ اس طرح سمجھئے کہ مثلاً ایک کاشتکار ٹریکٹر خریدنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس رقم نہیں ہے، بحالات موجودہ ایسے شخص کو بنک سود پر قرض دیتا ہے، یہاں سود کے بجائے شرکت یا مضاربت اس لیے نہیں چل سکتی کہ کاشتکار ٹریکٹر تجارت کی غرض سے نہیں بلکہ اپنے کھیت میں استعمال کے کے لیے خریدنا چاہتا ہے —— چنانچہ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ بینک کاشتکار کو روپیہ دینے کے بجائے ٹریکٹر خرید کر ادھار قیمت پر دے دے اور اس کی قیمت اپنا کچھ منافع رکھ کر متعین کرے اور کاشتکار کو اس بات کی مہلت دے کہ وہ بنک کو ٹریکٹر کی مقررہ قیمت کچھ عرصہ کے بعد ادا کر دے۔ اس طریقہ کو اسلامی کونسل کی رپورٹ میں ''بیع موجل'' کا نام دیا گیا ہے اور اس میں بنک نے ٹریکٹر کی بازاری قیمت پر جو منافع رکھا ہے اسے معاشی اصطلاح میں ''مارک اپ'' کہا جاتا ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم یکم جنوری (۱۹۸۱ء) سے نافذ ہونے والی اسکیم کا جائزہ لیتے ہیں تو نقشہ بالکل برعکس نظر آتا ہے اس اسکیم میں نہ صرف یہ کہ ''مارک اپ'' ہی کو غیر سودی کاؤنٹرز کے کاروبار کی اصل بنیاد قرار دے دیا گیا بلکہ ''مارک اپ'' کے طریق کار میں ان شرائط کا بھی لحاظ نظر نہیں آتا جو اس ''مارک اپ'' کو محدود فقہی جواز عطا کر سکتی تھیں، چنانچہ اس میں مندرجہ ذیل سنگین خرابیاں نظر آتی ہیں:

''بیع موجل'' کے جواز کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ بائع جو چیز فروخت کر رہا ہے وہ اس کے قبضے میں آچکی ہو، اسلامی شریعت کا یہ معروف اصول ہے کہ جو چیز کسی انسان کے قبضہ میں نہ آئی ہو اور جس کا کوئی خطرہ (Risk) انسان نے قبول نہ کیا ہو اسے آگے فروخت کر کے اس پر نفع حاصل کرنا جائز نہیں اور زیر نظر اسکیم میں ''فروخت شدہ'' چیز کے بنک کے قبضے میں آنے کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ یہ صراحت کی گئی ہے کہ بنک ''مارک اپ اسکیم'' کے تحت کوئی چیز مثلاً چاول اپنے گاہک کو فراہم نہیں کرے گا بلکہ اس کو چاول کی بازاری قیمت دے گا، جس کے ذریعے وہ بازار سے چاول خرید لے گا اور اسکیم کے الفاظ میں

''جن اشیاء کے حصول کے لیے بنک کی طرف سے رقم فراہم کی گئی ہے ان کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ بنک نے اپنی فراہم کردہ رقم کے معاوضے میں بازار سے خرید لی ہیں، اور پھر انہیں نوے دن کے بعد واجب الادا =

زائد قیمت پر ان اداروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے (جو اس سے رقم لینے آئے ہیں)۔ (اسٹیٹ بنک نیوز یکم جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۹)

اس میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ وہ اشیاء بنک کی ملکیت اور اس کے قبضے میں کب اور کس طرح آئیں گی؟ اور محض کسی شخص کو کوئی رقم دے دینے سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ جو چیز وہ خریدنا چاہ رہا ہے وہ پہلے بنک نے خریدی اور پھر اس کے ہاتھ بیچ دی ہے؟ صرف کاغذ پر کوئی بات فرض کر لینے سے وہ حقیقت کیسے بن سکتی ہے، جب تک اس کا صحیح طریق کار اختیار نہ کیا جائے" —— "بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ۲۸ مارچ کو چاول وغیرہ کی خریداری کے لیے بنکوں نے جو رقمیں رائس کارپوریشن کو پہلے سے دی ہوئی تھیں، ۲۸ مارچ کو یہ سمجھا جائے گا کہ کارپوریشن نے وہ رقمیں سود کے ساتھ بنک کو واپس کر دی ہیں اور پھر بنک نے اسی روز وہ رقمیں دوبارہ کارپوریشن کو مارک اپ کی بنیاد پر دے دی ہیں اور جس جنس کی خریداری کے لیے وہ قرضے دیئے گئے تھے، یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بنک نے خرید لی ہے اور پھر کارپوریشن کو مارک اپ کی بنیاد پر بیچ دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ جن رقموں سے کارپوریشن پہلے چاول وغیرہ خرید چکی ہے اور شاید خرید کر آگے فروخت بھی کر چکی ہے اس کے بارے میں کون سی منطق کی رو سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ بنک نے خرید کر دوبارہ کارپوریشن کو بھیجی ہے؟"

"اس سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہوتی ہے کہ "بیع موجل" کا طریقہ حقیقی طور پر اپنانا پیش نظر نہیں بلکہ فرضی طور پر اس کا صرف نام لینا پیش نظر ہے اور انتہا یہ ہے کہ اس جگہ یہ نام بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ بلکہ بینک کی دی ہوئی رقم کو قرض (Advance) اور اس عمل کو قرض دینے (Lend) سے تعبیر کیا گیا ہے۔" (اسٹیٹ بنک نیوز یکم جنوری ۱۹۸۱ء ص ۷)

"اس اسکیم کی ایک سنگین ترین غلطی اور ہے "بیع موجل" کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ معاہدے کے وقت فروخت شدہ شے کی قیمت بھی واضح طور پر متعین ہو جائے اور یہ بات بھی کہ یہ قیمت کتنی مدت میں ادا کی جائے گی پھر اگر خریدنے والا وہ قیمت معینہ مدت پر ادا نہ کرے تو اس سے وصول کرنے کے لیے تمام قانونی طریقے استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر معینہ قیمت میں اضافہ کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ تاخیر کی بنیاد پر قیمت میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو اسی کا دوسرا نام سود ہے، لیکن زیر نظر اسکیم میں اس اہم اور بنیادی شرط کی بھی یہ کہ پابندی نہیں کی گئی بلکہ بعض معاملات میں وضاحت کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے، چنانچہ اس میں کہا گیا ہے کہ امپورٹ بلوں کی ادائیگی میں بنک جو رقم خرچ کرے گا اس پر ابتداً بیس دن کی مدت کے لیے اعشاریہ ۷۸ فیصد مارک اپ وصول کرے گا اور اگر یہ رقم بیس دن میں ادا نہ ہوئی تو مزید چودہ دن کے لیے اعشاریہ ۵۸ فیصد مارک اپ کا مزید اضافہ ہو گا اور اگر ۳۴ دن گذر جانے پر بھی قیمت کی ادائیگی نہ ہوئی تو اس قیمت پر مزید اعشاریہ ۶۲ فیصد مارک اپ کا اضافہ ہو گا اور اگر ۴۸ دن گذر جانے پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو آئندہ ہر پندرہ دن کی تاخیر پر مزید اعشاریہ ۷۹ فیصد کے مارک اپ کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اندازہ فرمائیے کہ یہ طریق کار واضح طور پر سود کے سوا اور کیا ہے؟ اگر "انٹرسٹ" کے بجائے نام "مارک
=

الحاصل کواپریٹو سوسائٹیاں ہوں یا بینکنگ سسٹم، اسلام کے معاشی نظام میں ان ترقی یافتہ جدید اداروں کے لیے مشروط گنجائش ہے، یعنی وہ شرح سود کو صفر دیکھنا چاہتا ہے اور ان کو قابلِ عمل بنانے کے لیے یا حکومت پر بوجھ ڈالتا ہے کہ وہ رفاہ (Welfare) کے دوسرے اداروں کی طرح ان کو بھی اپنی ذمہ داری پر چلائے اور یا بعض ایسے جائز اور صحیح طریقے بتلاتا ہے جن کے استعمال سے ان اداروں کا مقصد پورا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا کاروبار بھی جاری رہ سکے۔

امداد باہمی کے بعض طریقے:

چونکہ امداد باہمی تو اجتماعی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے جو مذہب، سیاست، معاشرت اور اقتصاد، تمام شعبوں کو یکساں حاوی ہے جیسا کہ قرآن کی نص قطعی کا اعلان ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ﴾ (۱)

ترجمہ: ہر ایک بھلائی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور برائی و سرکشی میں ہرگز ہرگز ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

اس لیے ترغیب کے ساتھ ساتھ اسلام ان شعبوں کے امداد باہمی کے بعض طریقے بھی بیان کرتا ہے، مثلاً تجارتی شعبہ میں مضاربۃ، معاوضۃ، عنان، شرکت، صنائع وجوہ وغیرہ اور زراعتی شعبہ میں "مزارعۃ"، "معاملہ"، "مساقاۃ" وغیرہ۔

(الف) مضاربۃ:

تعریف: امداد باہمی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یہ بہترین طریق تجارت ہے،

اپ" رکھ دیا جائے اور باقی تمام خصوصیات وہی رہیں تو اس سے "غیر سودی نظام" کیسے قائم ہو جائے گا؟"
"واقعہ یہ ہے کہ اسلام کو جس قسم کا نظام سرمایہ کاری مطلوب ہے وہ "مارک اپ" کے "میک اپ" سے حاصل نہیں ہو گا، اس کے محض قانونی لیپ پوت کی نہیں، انقلابی فکر کی ضرورت ہے۔"

(۱) سورۃ المائدۃ (۵): ۲

مضاربۃ ایسے تجارتی معاملہ کا نام ہے جس میں ایک جانب راس المال (سرمایہ ہوتا ہے) اور دوسری جانب سے فقط محنت ہوتی ہے اور منافع مثلاً نصف نصف یا کم و بیش طے پا جاتا ہے۔[1]

ضرورت: بہت سے اربابِ دولت وہ ہیں جن کے پاس سرمایہ کافی ہے لیکن تجارتی کاروبار سے وہ قطعاً ناآشنا ہیں اور بہت سے نادار غریب ایسے پائے جاتے ہیں جن کو تجارتی کاروبار کو دیانت کے ساتھ چلانے کا سلیقہ تو ہوتا ہے مگر وہ سرمایہ سے محروم ہیں، لہذا دونوں کو جائز دولت کمانے اور خصوصاً سرمایہ سے محروم کو اپنی محنت کا پھل اٹھانے کے لیے حسنِ سلوک اور امداد باہمی کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ صاحبِ مال اپنے مال کو اس دوسرے شخص کو تحفظ سرمایہ کے اطمینان کے ساتھ حوالہ کر دے اور اس کو موقع دے کہ وہ کاروبار کر کے خود بھی فائدہ اٹھائے اور اس کو بھی فائدہ پہنچائے۔

اسی طرح ایک بڑے تاجر کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ تجارتی کاروبار سے واقف ہونے کی وجہ سے افرادِ ملت کو فائدہ پہنچانے کے لیے اپنی پونجی کے ایک حصہ سے مضاربۃ کا کام لے۔

شرعی حیثیت: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بصری (شام) کی منڈی میں خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مال کی تجارت سے اسی مضاربۃ کے اصول پر کی تھی جو مال میں بیش از بیش نفع کی شکل میں انجام پائی، اقتصادی نقطۂ نظر سے دیانت داری اور سمجھدار غریبوں اور کاروباری ضرورت مندوں کی ایسی امداد جو غیور اور باحوصلہ افراد کے لیے قابلِ عمل اور باعثِ تسکین ہو، اس ''مضاربۃ'' سے بہتر دوسرے طریقہ سے ناممکن ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ[2] فرماتے

---

(۱) البتہ خسارہ کی صورت میں سارے کا سارا صاحب مال (Capital) پر آئے گا کیونکہ ایسی صورت میں محنت کرنے والے (مضارب) کی محنت ضائع ہو گئی کیونکہ اسے اپنی محنت کا کوئی صلہ نہ ملا۔

(۲) امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا تعارف باب ا میں درج ہے۔

ہیں:

"معاونت باہمی کی چند قسمیں ہیں ایک ان میں سے مضاربت ہے وہ یہ کہ مال ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے شخص کی ہو اور رضامندی طرفین کی تصریح کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو۔"(۱)

سعیدیات میں ہے: مضاربت لوگوں کی ضروریات کے لیے جائز رکھی گئی ہے، اس لیے کہ بعض کاروبار سے ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں اور بعض غریب کاروبار کے ماہر اور مصالحِ تجارت سے خوب واقف ہوتے ہیں، نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی یہ طریقِ تجارت جاری تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہتر سمجھ کر جاری رکھا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس پر عمل کیا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شرائطِ مضاربت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا، قرآن عزیز میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہے "وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" اور ایک جماعت ہے جو زمین میں چل پھر کر اللہ کے رزق کو تلاش کرتی ہے یعنی صاحبِ مال تو مال لگاتے ہیں اور محنت والے اس کے ذریعہ سے ملکوں اور شہروں میں جا کر تجارت کرتے ہیں۔ (۲)

گویا اس شکل میں سرمایہ دار کا سرمایہ "لعنت" نہیں بلکہ "رحمت" بن جائے گا اور نادار کی محنت اور کاروباری ہوش مندی اور استعداد ضائع اور رائیگاں ہونے کی بجائے کارآمد اور نفع بخش ثابت ہوگی، نتیجہ یہ نکلے گا کہ نہ سرمایہ "کنز" بن کر احتکار واکتناز کا باعث ہوگا اور نہ اصحابِ ضرورت کے انسدادِ ضروریات پر قفل پڑ سکے گا اور جماعتی زندگی میں نہ فاقہ کش نظر آئیں گے اور نہ قابلِ نفرت سرمایہ دار۔

---

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ: حجة الله البالغة، مطبوعه مصر، ج ۲، باب التبرع والتعاون، ص ۱۱۶

(۲) سعیدیات: ۱۱۲/۲

امداد باہمی کی چند دیگر شکلیں:

اس قسم کے معاملات کے چند دوسرے طریقے یہ ہیں:

1. شرکت معاوضہ یا
2. شرکت عنان
3. شرکت وجوہ
4. شرکت صنائع

(ان کا مختصر تعارف یوں ہے):

معاوضہ (یا شرکت عنان):

"معاوضہ" ایسے تجارتی کاروبار کا نام ہے جس میں کمپنی کے طور پر چند افراد اپنا اپنا راس المال دے کر شریک بن جاتے ہیں اور نفع و نقصان میں بھی شریک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے وکیل و کفیل اور اس معاملہ کے تمام حالات میں ذمہ دار بھی رہتے ہیں، عنان بھی اسی قسم کی ایک خاص شرکت کا نام ہے۔(۱)

شرکتِ صنائع:

اور شرکتِ صنائع کمپنی کے طرز پر اس قسم کے کاروبار کو کہتے ہیں جس میں چند ہم پیشہ صاحبِ صنعت و حرفت اپنے حرفہ کو شرکت کے ساتھ چلاتے ہیں اور نفع و نقصان کے شریک ہو جاتے ہیں۔(۲)

---

(۱) کتب فقہ کی کتاب البیوع میں باب المعاملات یا دیگر عنوانات کے تحت ان تمام شرکات کی تفاصیل موجود ہو فاضل مؤلف رحمہ اللہ نے نہایت اختصار سے یہاں تعارف کرایا ہے غالباً انہوں نے ضروری اتنا ہی سمجھا تھا۔ اب یہ کام عملی کام کرنے والوں اور دینی مشیروں کا ہے کہ وہ متبادل سودی نظام کی تجاویز ان بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں مرتب کریں۔

اس سلسلہ میں مجھ ناکارہ کی کتاب "تجارت کے اسلامی قواعد وضوابط" مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی، کراچی کا مطالعہ انشاء اللہ مفید ہو گا۔

(۲) حوالہ مذکورہ

شرکتِ وجوہ (یا شرکت اعتبار) (Partnership of Creditability):

اور "شرکتِ وجوہ" اس تجارت کا نام ہے کہ بغیر "مال" کے چند افراد کے درمیان مساوی عمل و محنت اور کسب و اکتساب پر شرکت ہو جاتی ہے اور خرید و فروخت اور نفع و نقصان میں بھی شرکت رہتی ہے۔ [1]

اگر آج یہ تمام صورتیں اپنی پوری آزادی کے ساتھ کسی نظامِ اقتصادی میں رائج ہو جائیں تو بیکاری اور اس کی وجہ سے پیدا شدہ عام افلاس و بدحالی بڑی حد تک رفع ہو جائے اور خوشحالی کا دور واپس آجائے مگر افسوس کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابی نے ان جائز طریقوں کو تباہ و برباد کر دیا اور باہمی تعاون و امداد کے ان سادہ اور آسان طریقوں میں بے اعتمادی کا جال بچھا دیا اور اس کی بجائے "سودی کاروبارِ تجارت" کو فروغ دے کر موجودہ بدحالی پیدا کر دی۔ [2]

---

(۱) حوالہ مذکورہ

(۲) مضاربت کی برکات و فوائد، اس کی افادیت و عالمگیریت اور سودی نظام بنکاری کے آغاز پر معاصر ماہنامہ "بینات" جو جامعہ عربیہ اسلامیہ کراچی کا دینی و علمی ماہنامہ ہے، جس کی سرپرستی ماضی قریب میں شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے اور مدیر مسئول مولانا محمد ادریس رحمہ اللہ میر ٹھی ہوا کرتے تھے، کے شمارہ ۳، جلد ۱۸، ربیع الاول ۱۳۹۱ھ بمطابق مئی ۱۹۷۸ء میں مولانا ادریس میر ٹھی صاحب نے "مضاربت کی عالمگیر مقبولیت" کے عنوان کے تحت جو لکھا ہے اس کی افادیت کے پیشِ نظر یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

مضاربت ہی وہ طریقہ تجارت ہے جس کے ذریعہ مسلمان تاجروں نے اپنے اچھے دور میں اپنی تجارت کا دائرہ ایشیا و افریقہ جیسے دنیا کے براعظموں تک پھیلایا ہے، جبکہ مغربی اقوام اس طریقہ سے واقف نہ تھیں۔ اس لیے کہ سرمایہ دار خود دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنے سرمایہ سے کاروبار کرنے کے لیے نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں مضاربت کے ذریعہ وہ اپنے سرمایہ کو انسانیت کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے اپنے وکلاء، محنتی اور جفاکش مضاربین کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا سکتا ہے، اور دولت (سرمایہ) کی گردش (Circulation) جاری و ساری رہ سکتی ہے۔

مسلمان تاجروں کی اس عالمگیر کامیابی کو دیکھ کر مغربی اقوام نے بھی ایک زمانہ میں اپنے ممالک میں مضاربت کے ذریعہ تجارت کرنا شروع کی ہے خاص کر ان یورپین —— عیسائی —— قوموں نے جو سودی لین دین اور سودی کاروبار کو حرام سمجھتی تھیں مثلاً فرانس، اسپین وغیرہ لاطینی مشرقی ممالک۔ چنانچہ ڈاکٹر یوسف رحمہ اللہ =

سودی کاروبار کی یہ عمومیت جس کا نظارہ صبح سے شام تک ہماری نگاہیں تجارت صنعت و حرفت اور لین دین کے مختلف طرق میں کرتی رہتی ہیں اور جس سے مرعوب ہو کر خود "مسلمان" علماء اسلام سے اباحتِ سود (Permissibility of Interset) کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، یہی وہ صورتِ حال ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ نبوت و رسالت نے مستقبل کے مستور پردہ پر جس کو ملاحظہ فرما کر اس حقیقتِ ثانیہ کا اعلان ساڑھے تیرہ (۱۳۵۰) سو سال قبل ان مقدس جملوں کے ساتھ فرمادیا تھا:

یاتی علی الناس زمان، یأکلون الربوا، فمن لم یأکله أصابه

اپنی کتاب "معاشی نظریے" ج ا ص ۲۳۳ پر پروفیسر آرنسٹ نیس کی کتاب ہسٹری آف اکنامکس کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

کمندا (قراض) کی اصل عربی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اس کا رواج (عام) تھا۔ مسلمانوں کی پوری تجارت کا یہی سرچشمہ تھا۔ جس وقت عیسائی تاجر قراض (مضاربت) کے ذریعہ کاروباری مہم چلانا جانتے بھی نہ تھے۔ اس وقت مسلمانوں نے ایشیا و افریقہ کے بڑے بڑے علاقوں میں اس کو رواج دیا۔ بحیرہ روم کے عیسائی ممالک خاص کر لاطینی مشرقی ممالک اور اسپین وغیرہ میں بھی اس کا رواج عام ہوا۔ پندرویں صدی عیسوی میں یہ تجارتی کاروبار کرنے کا ایک عالمگیر طریقہ بن گیا۔ خصوصا سود کو ممنوع قرار دینے کی بنا پر۔ فرانس کے بادشاہ لوئی دہم نے بھی اس کے (متعلق) قوانین وضع کیے۔ (آرنسٹ نیس، ہسٹری آف اکنامکس: ص ۲۸۶)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضاربت کے اس عالمگیر (Universal) اسلامی طریقہ کو ہی شکست دینے اور ناکام بنانے کے لیے کسی خدا دشمن ملعون و مغضوب یہودی نے بنکنگ سسٹم کو اختراع کیا ہے۔ اور دنیا بھر کے ارب پتی اور کھرب پتی سود خور یہودیوں نے ——— ان پر خدا کی لعنت ——— ہر ایک ملک اور اس کے ہر چپہ میں سود دینے اور سود لینے والے بنکوں کا جال بچھادیا ہے اور سرمایہ دار حکومتوں نے اپنی شخصی اور سیاسی اغراض کے لیے ان بنکوں کو قانونی تحفظ دے کر دنیا کے کاروبار پر چھا جانے کے مواقع بہم پہنچائے ہیں، جس کے نتیجہ میں آج دنیا کی تمام سرمایہ دار ملکوں ——— امریکہ، فرانس، برطانیہ وغیرہ ——— کی نہ صرف تجارت و صنعت بلکہ سیاست پر بھی یہی مٹھی بھر سرمایہ پرست سود خوار یہودی چھائے ہوئے ہیں اور جونک کی طرح انسانیت کا خون چوس رہے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ اربوں، کھربوں ڈالرز سائنسی اور ایٹمی ایجادات و مصنوعات اور مہلک زہریلی گیسوں پر خرچ کر کے آباد دنیا کو عالمگیر ہلاکت یعنی قیامت کے کنارے لا کھڑا کر دیا ہے۔ صرف احکم الحاکمین (اللہ) کے حکم کی دیر ہے۔ (مذکورہ ماہنامہ کا صفحہ ۳۹ تا ۴۱)

عن غبارہ۔[1]

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مستقبل میں پھر ایسا زمانہ آئے گا جب عام لوگ سود خواری کریں گے اگر کوئی شخص باز رہے گا تو سود کے غبار سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔

منشیات

تجارتی کاروبار میں سود اور دیگر بیان کردہ امور کے علاوہ جس تجارت کو اسلام نے مذموم اور ناجائز قرار دیا ہے وہ ''مسکرات کی تجارت'' ہے، شراب اور اسی قسم کی دوسری منشیات کے استعمال سے جس قدر بداخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ایک بدیہی مسئلہ ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ ''دنیا کی ہر شے اپنے اندر کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور رکھتی ہے اس لیے شراب اور منشیات کے بھی کچھ نہ کچھ فوائد ضرور ہیں، یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان کی مضرتیں اور ان کی تباہ کاریاں ان کے منافع سے چند در چند زیادہ ہیں۔''

﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾[2]

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کے فائدوں کے مقابلہ میں ان کا نقصان اور ان کی مضرت بہت ہی زیادہ ہے۔

اس لیے اسلام نے ان کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

---

(۱) ابن ماجه: السنن، باب التلغيظ فى الربا. نسائى: السنن عن ابى هريرة رضى الله تعالى عنه

(۲) سورة البقرة (۲): ۲۱۹

﴿إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ﴾ (۱)

ترجمہ: بلاشبہ شراب جوا، بت اور پانسے سب کارِ شیطان میں سے ہیں سر تا سر نجاست ہیں تم کو ان سے بچنا چاہیے۔

اس نے صرف یہیں تک معاملہ کو محدود نہیں رکھا بلکہ ان چیزوں کی تجارت کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔

عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنها: لما نزلت آیات سورة البقر عن آخرها خرج النبی صلی الله علیه وسلم فقال: حرمت التجارة فی الخمر. (۲)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب شراب کی تجارت حرام کر دی گئی۔

اگرچہ ان غیر مسلموں کے لیے جن کے یہاں مذہبی رسوم یا غیر مذہبی رسوم میں شراب یا منشیات کا استعمال ضروری یا روا ہے، اسلام نے جوازِ استعمال کو قبول کر کے اپنے قانونِ اقتصاد میں کچھ مستثنیات بیان کر دی ہیں تاہم اصل قانون میں ان کی خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار کو قطعاً ناجائز قرار دیا ہے، کتبِ فقہ میں ہے:

"اور اگر کسی شخص نے مردار، خون، مدبر، مکاتب اُمِ ولد، شراب اور سود کی تجارت کی تو اس کی یہ بیع حرام ہے اور باطل ہے کیونکہ تجارت کا ایک رکن یعنی مال کا مال کے ساتھ تبادلہ یہاں معدوم ہے (کیونکہ یہ تمام اشیاء اسلامی نقطۂ نظر سے مال میں شمار نہیں ہیں)۔" (۳)

---

(۱) سورة المائدة (۵): ۹۰

(۲) صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب تحریم التجارة فی الخمر

(۳) سعیدیات: ۳۱۴/۱

اس پوری تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تجارت، صنعت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ تجارتی بے عنوانیوں، مذموم سرمایہ دارانہ ترقی کی بندشوں اور غیر اخلاقی اشیاء کے انسداد کے لیے کیسی اعتدال کی راہ اختیار کی ہے اور اس کو مختلف خلشوں سے پاک رکھنے کے لیے بہترین طریقے استعمال کیے ہیں۔

باب ⑪

انفرادی ملکیت کی تحدید

(Limitation of Individual Ownership)

اسلام لوگوں کو ذاتی ملکیت سے نہیں روکتا اور وہ ایسے اقتصادی نظام کو تسلیم نہیں کرتا جس میں اشخاص و افراد کو اشیاء منقولہ (Movable Goods) کے علاوہ زمین اور ذرائع پیداوار پر کسی حیثیت اور کسی حالت میں بھی حقِ ملکیت حاصل نہ ہو اور وہ اس طریقِ کار کو "غیر فطری" (UN- Natural) اور ایسے نظاموں کو ناقص اور غیر مطمئن "نظام" سمجھتا ہے۔

یقین اور تجربہ کی روشنی میں یہ نظریہ صحیح اور درست ہے یا نہیں، اس کی تفصیل تو دوسرے اقتصادی نظاموں کے ساتھ مقابلہ کے وقت بیان ہوگی، مگر یہاں یہ واضح رہے کہ قرآنِ عزیز نے جن جن مقامات پر انفاق اور خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے ان میں افراد و اشخاص کی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے ترغیب دی ہے۔

انفرادی ملکیت قرآن کریم کی روشنی میں

❶ ﴿وَءَاتَى ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ﴾[1]

ترجمہ: اور اس نے مال کو باوجود اس کی محبت کے رشتہ داروں، یتیموں

(۱) القرآن الکریم، سورۃ البقرہ (۲):۱۷۷

محتاجوں، مسافروں، مانگنے والوں کو اور گردنوں کو آزاد کرانے (یعنی غلام کو آزاد کرانے یا قیدی کو رہا کرانے کا مقروض کو قرض سے نجات دلانے) کے لیے دیا۔

❷ ﴿ وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴿١٩﴾ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں سائلوں اور تنگدستوں کا حق ہے۔

❸ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم ﴾ (۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس کو خرچ کرو۔

اس نوع کی آیات قرآن مجید میں بکثرت ہیں اس نے انفرادی ملکیت تسلیم کرنے میں اشیاءِ منقولہ و غیر منقولہ یا ذرائع پیداوار میں سے کسی کی کوئی تخصیص نہیں کی اور ان میں سے کسی کے درمیان بحیثیت "نفسِ ملکیت" کوئی فرق نہیں بیان کیا۔

تاہم وہ ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کی تحدید (Limitation) ضرور کرنا چاہتا ہے اور اس ملکیت میں اس قسم کی وسعت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا جس کی بدولت اس کے اقتصادی نظام کی بیان کردہ اساد و بنیاد پر زد پڑے اور اس کا مقصد اصلی فوت ہو جائے اسی بنا پر اول وہ تمام اشیاء کے بارہ میں بنیادی طور پر یہ حکم دیتا ہے کہ وہ "مباح الاصل" (Originally Permissible) ہیں یعنی وہ کسی کی ذاتی و شخصی ملک نہیں ہیں بلکہ خالقِ کائنات نے ان کو تمام افرادِ انسانی کے لیے یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے مخلوق کیا ہے۔

❹ ﴿ هُوَ ٱلَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعٗا ﴾ (۳)

---

(۱) سورۃ الذاریات (۵۱): ۱۹

(۲) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۵۵

(۳) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۹

ترجمہ: خدا تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا ہے جو زمین میں موجود ہے۔

انفرادی ملکیت کی تخصیص (Specification):

اس کے بعد پھر تخصیص کا سوال پیدا ہوتا ہے اور ''بمصداق القران یفسر بعضه بعضا'' (قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے) دوسری آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور روایاتِ فقہی اس اذنِ عام کی تشریح یا تخصیص (Explaination or Specification) کرتی ہیں، یعنی یہ بتاتی ہیں کہ کون کون سی چیزیں انفرادی ملک نہیں بن سکتیں اور کون کون سی بنتی ہیں اور بن سکتی ہیں۔

مفاد عامہ کی اشیاء انفرادی ملکیت نہیں بن سکتیں:

ان ہی تشریحات و تخصیصات سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اسلام نے اپنے نظام میں بعض اشیاء کو عام فائدہ کی خاطر سب کے لیے یکساں طور پر مباح قرار دیا ہے اور اس لیے ان اشیاء کے متعلق کسی فرد واحد یا چند افراد جماعت کو یہ حق نہیں ہے وہ ''مفادِ عامہ کے خلاف'' ان کو ان کے تخلیقی مقام پر اس طرح اپنے قبضہ و تصرف میں کر لیں کہ وہ حکومت کو مقررہ منافع یا ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان اشیاء کے مالکِ کل اور اجارہ دار بن بیٹھیں، البتہ ہر ایک فرد یہ حق ضرور رکھتا ہے کہ ان اشیاء کے مقامِ وقوع سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق جس قدر اپنے قبضہ و تصرف میں لے آئے وہ بلاشبہ اس کی ملکیت سمجھی جائے۔

اس کے برخلاف خلافت (حکومت) کا یہ حق ہے کہ وہ ان اشیاء کی افادیت کو عام کرنے کے لیے ان کا نظم و ضبط اپنے ہاتھ میں لے، ان کی درآمد کا انتظام و انصرام کرے اور جمہور کی ملکیت کے نام پر ان میں معاشی نظام کی بہترین کے لیے جس قسم کا تصرف مناسب سمجھے کرے۔

مفادِ عامہ کے اس سلسلہ کی پہلی چیز ''معدنیات'' ہیں۔

کانیں (Mines):

❶ عن أبيض بن حمّال المآربي رضى الله تعالىٰ عنه أنه وفد الى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأستقطعه الملح الذى بمآرب، فأقطعه أيّاه. فلما ولى قال رجل: يا رسول الله! لما لَهُ الماء العدّ؟ قال فرجعه منه.[1]

ترجمہ: ابیض بن جمال مآربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مآرب میں نمک کی جو جھیل تھی اس کو عطیہ کے طور پر مانگا۔ آپ نے اجازت دے دی۔ ایک شخص نے یہ دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمک کا ہمیشہ جاری رہنے والا خزانہ کیوں اس کے حوالے کیے دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصل حقیقت سے آگاہی کے بعد واپس لے لیا اور دینے سے انکار فرمادیا۔

❷ عن عمرو بن عوف المزنى رضى الله تعالىٰ عنه أن النبى صلى الله عليه سلم أقطع بلال بن الحارث رضى الله تعالىٰ عنه معاون القبلية جليسها وغوريها، وحيث يصلح الزرع من قدس، ولم يعطه حق مسلم. وكتب له النبى صلى الله عليه وسلم كتابا.[3]

---

(۱) ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی: الجامع، کتاب البیوع

(۲) ابیض بن حمال مآربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن کے ایک شہر مآرب جو صنعاء کے قریب تھا کے رہنے والے تھے، اپنے قبیلہ کا وفد لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ایمان کی دولت پانے کے بعد اسلام میں ثابت قدم ہو کر رہے۔ آپ نے بہت کم احادیث نقل کی ہیں۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (دیکھیے: شیخ ولی الدین ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ، اکمال فی اسماء الرجال ذیلی مشکوۃ المصابیح، تذکرہ ابیض رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۳) ابوداود: السنن، ج ۲، کتاب الامارۃ والفیئ والخراج

ترجمہ: عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقام قبلیۃ [2] کے پست و بلند حصوں کی کانیں عطیہ کے طور پر دے دیں اور مقامِ قدس کے ان حصوں کو بھی دیا جو کھیتی کے قابل تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عطیہ میں کسی مسلمان کا حق ان کو نہیں دیا اور اس کے لیے ان کو فرمان لکھ دیا۔

یہ بالترتیب دو صحیح احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کو اساس و بنیاد قرار دے کر مجتہدین امت نے اسلام کے معاشی نظام میں معاون کے متعلق احکام بیان فرمائے ہیں، شارحینِ حدیث اور فقہاء نے اس سلسلہ میں جن تفصیلات کو نقل کیا ہے ان کا حاصل یہ ہے:

معدنیات کی قسمیں:

معدنیات کی دو قسمیں ہیں:

1. معدن ظاہر
2. معدن باطن

معدن ظاہر:

ان معدنیات کو کہتے ہیں جن کا خزانہ یا تو سطح زمین پر ظاہر اور موجود ہو اور یا

(۱) حضرت عمرو بن عوف بن زید مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اوائل ہجرت مدینہ منورہ میں ایمان لائے۔ غریب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے تھے۔ اللہ کریم کی راہ میں جہاد کا سامان نہ کر سکتے تو روتے تھے۔ انہی حضرات کے بارے میں قرآن کریم کی آیت ﴿تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (سورۃ التوبۃ (۱۹): ۹۲) ترجمہ: (جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے سامان جہاد مہیا نہ کر سکتے تو) وہ لوٹ جاتے مگر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ منورہ یا حوالی مدینہ میں صدقات کا محصل (کلکٹر) مقرر فرمایا تھا۔ مدینہ منورہ میں رہائش پذیر رہے اور مدینہ منورہ میں ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں وفات پائی۔ آپ کی روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ (اسماء الرجال ہر کتب میں ان کا ترجمہ)

(۲) "قبلیۃ" مدینہ طیبہ اور ینبوع کے درمیان وادی کا نام ہے۔ (بلاذری: معجم البلدان، ج ۷)

زمین میں اس طرح پائی جاتی ہوں کہ اگر تھوڑی سی محنت یا خرچ کر کے ان کو برآمد کر لیا جائے تو وہ مٹی یا پتھر کے ساتھ ان کے اجزاء کی حیثیت میں مخلوط و مربوط نہ ہوں بلکہ زمین میں خزانہ کی حیثیت میں موجود ہوں، مثلاً نمک، مٹی کا تیل، پٹرول، تارکول وغیرہ۔

معدن باطن:

ان معدنیات کو کہتے ہیں جو زمین اور پہاڑ کی سطح ظاہر پر موجود ہوں اور نہ اجزاء وافر و دائم کی طرح زمین اور پہاڑ کے اندر جدا موجود ہوں بلکہ زمین اور پہاڑ کے اندر ذرات زمین یا پتھر کے اجزاء کی حیثیت میں مستور ہوں اور جن کے حاصل کرنے اور پتھر یا زمین کے اجزاء سے جدا کر کے صاف کرنے میں کافی محنت اور سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہو۔

معدن ظاہر کے احکام:

پس اگر پہلی قسم کی معدنیات ہیں تو وہ کسی حال میں بھی نہ شخصِ واحد یا مخصوص جماعت کی ملک بنائی جا سکتی ہے اور نہ ان کو بطورِ اجارہ کسی کو دیا جا سکتا ہے بلکہ وہ عوام کی ضروریات اور افادہ کے لیے مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں اور ان سے ہر شخص کو بلا معاوضہ استفادہ کا حق ہے گویا اصطلاحی بول چال میں وہ پبلک کی نمائندہ حکومت (خلافت) کی ملکیت اور مفادِ عامہ کے لیے وقف ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [1] حدیث اول کی شرح میں فرماتے ہیں:

لا شك أن المعدن الظاهر الذی لایحتاج إلی کثیر عمل إقطاعه لواحد من المسلمین اضرارهم وتضییق علیهم۔ [2]

ترجمہ: یہ ایک صاف بات ہے جو کانیں "معدن ظاہر" ہیں ان کی درآمد میں زیادہ محنت کی ضرورت پیش نہیں آتی ان کا کسی ایک مسلمان کو بخش

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی الله: حجة الله البالغه (مطبوعه مصر)، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق ص ۱۰۴

دینا عامۃ المسلمین اور ان کی ضروریات کے لیے تنگی اور مضرت کا باعث ہے اس لیے ان کا عطیہ جائز نہیں۔

اور خطابی [۱] شرح ابو داؤد میں تحریر ہے:

وهذا يبين ما قلنا من أن المعدن الظاهر الموجود خيرة ونفعه لا يقطعه أحد، والماء العدهو الماء الدائم الذی لا ينقطع. [۲]

ترجمہ: اور یہ حدیث (مآربی والی حدیث) اس حقیقت کو واضح کرتی ہے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا کہ "معدن ظاہر موجود" کا نفع اور فائدہ کسی ایک شخص کو عطیہ نہیں کیا جا سکتا اور "ماء عد" [۳] ہمیشہ بہتے رہنے اور نہ ختم ہونے والے پانی کو کہتے ہیں۔

اور کتب فقہ میں یہ تصریح بھی موجود ہے۔ (امام حصکفی رحمہ اللہ [۴] تحریر

(۱) خطابی رحمہ اللہ حمد بن محمد بن ابراہیم ابو سلیمان البستی الخطابی رحمہ اللہ کابل کے قصبہ بستہ ——— جو غزنی اور ہرات کے درمیان تھا ——— میں پیدا ہوئے اس لیے "بستی" کہلائے اور دادا رحمہ اللہ کے خطاب کی وجہ سے "خطابی" مشہور ہوئے۔ بعض مؤرخین کے مطابق آپ کا سلسلہ نسب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے دور دراز کا سفر کیا۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں حضرت ابو سعید بن الاعرابی رحمہ اللہ سے، بصرہ میں حضرت ابوبکر بن داسۃ رحمہ اللہ سے، بغداد میں حضرت اسماعیل بن محمد الصفار رحمہ اللہ سے اور دیگر اکابر سے اکتساب علم کیا۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں امام ابو عبید اللہ حافظ الحاکم رحمہ اللہ اور ابو الحسین عبد الغافر الفارسی رحمہ اللہ ایسے اکابر علماء شامل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں "اعلام السنن شرح صحیح بخاری، معالم السنن شرح ابی داؤد، غریب الحدیث، کتاب الشجاع، کتاب شان الدعاء، اصلاح غلط المحدثین" وغیرہا مشہور ہیں۔ آپ نے ربیع الاول ۳۸۸ھ میں اپنے آبائی گاؤں اور جائے پیدائش قصبہ بستہ میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ (برائے تفصیل دیکھیں: امام الحاکم: تاریخ نیسابور (نیشا پور). ابن خلکان: وفیات الأعیان. مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ: التعلیق الممجد علی مؤطا امام حمد رحمہ اللہ تعالیٰ، مطبوعہ مطبع مجتبائی، لاہور ۱۴۰۵ھ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۳ مقدمہ)

(۲) علامہ خطابی: معالم السنن (شرح ابی داؤد)، ۴۳/۳

(۳) ماء عد: یہ نمک کی جھیل تھی جیسا ہندوستان میں سانبھر جھیل ہے۔

(۴) حصکفی رحمہ اللہ، علاؤ الدین حسن بن علی الحصکفی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۸۸ھ) دمشق کے مفتی تھے۔ فقہ حنفی کے نامور امام تھے۔ آپ کی تصانیف میں اہم ترین "الدر المختار" ہے جو ۱۰۷۱ھ میں لکھی گئی یہ کتاب

فرماتے ہیں):

واعلم أنه (ليس لامام أن يقطع ما لاغنى للمسلمين عنه) من المعادن الظاهرة وهى ما كان جوهرها الذى أودعه الله فى جواهر الأرض بارزا كمعادن الملح والكحل والقار والنفط.[1]

ترجمہ: اور جاننا چاہیے کہ امام کے لیے جائز نہیں ہے کہ ایسی چیز کسی کو "عطیہ" کر دے جس کے فائدہ سے عامہ مسلمین مستغنی نہ ہوں یعنی معاونِ ظاہرہ کو کہ جن کا جوہر میٹریل (Material) اللہ تعالیٰ نے زمین کے جوہروں میں سے ظاہر صورت میں ودیعت کیا ہے، مثلاً نمک، سرمہ، تارکول اور مٹی کے تیل کی کانیں (کنویں)۔

غرض مآربی سے متعلق حدیث کے پیشِ نظر جمہور علماءِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ "معدنیاتِ ظاہرہ" مفادِ عامہ کے لیے ہیں اس لیے وہ کسی کو بطور اجارہ کے دی جا سکتی ہیں اور نہ بطور عطیہ کے بلکہ حکومت کے ہاتھوں میں رہیں گی اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کا حق ہو گا۔

معدن باطنہ کے احکام:

اور اگر دوسری قسم کی معدنیات (معدنیاتِ باطنہ) ہیں، جن کی درآمد بہت زیادہ محنت اور کافی سرمایہ کی محتاج ہے، پس ان کے متعلق حکومت (خلافت) مجاز ہے کہ ان کانوں کو مفادِ عامہ کے قابل بنانے کے لیے خواہ اپنے قبضہ و اختیار میں رکھے اور مناسب سمجھے تو اجارہ پر دے کر ان کے فائدہ کو عام بنائے یا شخصِ واحد اور مخصوص جماعت کی ضروریات کی کفالت کے لیے بطور عطیہ کے دے دے، جیسا کہ نبی اکرم

۱۳۰۹ھ میں بمبئی (ہند) سے اور مصر سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

(۱) حصکی رحمہ اللہ تعالیٰ، محمد علاؤ الدین: الدر المختار، مطبوعہ بمبئی (ہند)، ۱۳۰۹ھ، ج ۳، کتاب الاحیاء

صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبلیہ کی معادن "عطیہ" کر دیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس "عطیہ" کو اپنی ضروریات کے لیے کام میں لائے اور بیکار و معطل نہ چھوڑ دے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو کل یا جزء جس حصہ کو بھی معطل اور بے کار چھوڑتا ہے امام کو اختیار ہے کہ اس کے قبضہ سے وہ حصہ نکال کر دوسرے کو عطیہ کر دے یا عامۂ خلق کے لیے حکومت کے ہاتھ میں واپس لے لے، چنانچہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ "کتاب الخراج" میں حضرت بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے ان "عطایا" سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

حدثني بعض أشياخنا من أهل المدينة قال: أقطع رسول الله صلى الله عليه وسلم بلال بن الحارث المزني رضي الله تعالى عنه ما بين البحر والصخر. فلما كان زمن عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه قال له: إنّك لا تستطيع أن تعمل هذا، فطيب له أن يقطعها ما خلا المعادن فأنّه استثناها.[1]

ترجمہ: میرے اہل مدینہ کے شیوخ میں سے ایک شیخ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سمندر اور خشکی کے درمیان وادی کو بطور عطیہ کے دے دیا تھا، مگر جب عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ تم اتنے بڑے علاقہ کو کام میں لاسکو، پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پسند فرمایا کہ معاون (قبلیہ) کو ان کے ہاتھ سے نکال کر باقی حصۂ زمین کو ان کے پاس بطور "عطیہ" باقی رہنے دیں۔

اس جگہ "ما خلا المعاون فأنه استثناها"، خصوصیت سے قابلِ غور ہے

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی ذکر القطائع (حکم القطائع)، مطبوعہ دار الاصلاح، قاہرۃ ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۳

کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام جاگیر میں سے واپس لینے کے لیے "معاون" ہی کو کیوں ترجیح دی اور مُستثنیٰ فرمایا؟

یحییٰ بن آدم قرشی رحمہ اللہ کی روایت:

اور یحییٰ بن آدم [1] کی "کتاب الخراج" میں اس واقعہ کی تفصیلات اس طرح منقول ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانۂ خلافت آیا تو انہوں نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طویل و عریض علاقہ کو بطور عطیہ حاصل کر لیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ وہ کسی سائل کے سوال کو رد نہیں فرماتے تھے، اور کیفیت یہ ہے کہ تم اس علاقہ کو نہیں سنبھال سکے (یعنی اس کا کافی حصہ افتادہ پڑا ہوا ہے) لہذا جس قدر حصہ تم کام میں لاسکتے ہو اس کو اپنے پاس رکھ کر باقی حصہ کو میرے حوالہ کرو کہ میں مسلمانوں میں اس کو حسب ضرورت تقسیم کر دوں۔ حضرت بلال (بن حارث) رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا جو شے مجھ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور "عطیہ" کے مرحمت فرمائی ہے میں اس کا چپہ بھر بھی واپس نہ دوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ

(۱) یحییٰ بن آدم، ابو زکریا یحییٰ بن آدم بن سلیمان القرشی الاموی رحمہ اللہ بہت بڑے محدث، فقیہہ مؤرخ اور امام تھے۔ آپ کی تصنیفات میں اسلامی معاشیات پر نہایت اہم تصنیف "کتاب الخراج" ہے جو کہ سرکاری مالیات (Public Finance) اور مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy) پر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی "کتاب الخراج" کے بعد اصل منبع و مصدر (Original Source) کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے مشہور مستشرق (Orientalist) جون بل (John Bull) نے لندن سے ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں شائع کرایا، پھر ۱۳۴۶ھ میں قاہرہ سے مکتبہ سلفیہ نے اور ۱۳۹۵ھ میں مکتبہ علمیہ لاہور سے استاذ احمد شاکر مصری رحمہ اللہ کا تحقیق شدہ نسخہ شائع ہوا اس کا انگلش ترجمہ اے بن شمس (A Ben Shamas) نے کیا ہے۔ آپ نے ۲۰۳ھ میں وفات پائی۔ (دیکھئے: ڈاکٹر نور محمد غفاری: اسلام کا معاشی نظام، مطبوعہ شعبہ تحقیق، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۵۵)

تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر فرمایا: قسم بخدا! تم کو واپس دینا ہو گا۔ چنانچہ جس قدر حصہ ان کی طاقتِ عمل سے باہر تھا اس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واپس لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔"(۱)

علامہ خطابی رحمہ اللہ کی تشریح:

اور خطابی رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"جس علاقہ کو خلیفۂ اسلام نے اسلحہ کی طاقت سے حاصل کیا ہے اگر وہاں کوئی زمین افتادہ بیکار پڑی ہے اور کسی مسلمان (یا معاد) کی ملکیت نہیں ہے تو امام اس کو بطور عطیہ کے دے سکتا ہے۔ پس اگر امام نے کسی کو بطور عطیہ کے زمین کا کوئی حصہ دے دیا اور اس نے اس کو آباد کر لیا یا اس میں کھیتی کر لی تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ملک ہو گیا اور اگر امام نے کسی کو "معدن" کا کوئی حصہ عطیہ کر دیا تو اس کو دیکھا جائے گا۔ اگر وہ معدن ظاہر ہے جیسے مٹی کا تیل یا تارکول وغیرہ تب امام کا عطیہ ناجائز اور واجب الرد ہو گا۔ اس لیے کہ ان اشیاء کے منافع خود بخود حاصل ہیں (یعنی زیادہ محنت کے محتاج نہیں) اور لوگوں کا ان اشیاء کے ساتھ ہر وقت کا واسطہ ہے۔ لہذا جو بھی اس میں سے جس قدر اپنی ضرورت کے لیے حاصل کر لے وہ اسی کا ہے اور کسی کو اس پر تنہا ملکیت کا دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس طرح دوسروں پر ترجیح حاصل کرے۔

اور اگر سونا چاندی، تانبا اور اس قسم کے دوسرے جواہرات کی کانیں ہیں جو زمین میں اس طرح پوشیدہ ہیں کہ مٹی یا پتھر کے اجزاء کی طرح ان میں مخلوق اور پیوست ہیں اور بغیر کافی محنت و مشقت کے ان کا مٹی اور پتھر سے جدا کر لینا ممکن نہیں ہے تو ان معادن کا عطیہ درست ہے۔

(۱) القرشی، یحییٰ بن آدم رحمہ اللہ تعالیٰ: کتاب الخراج، حدیث رقم ۲۹۲

البتہ اگر "جاگیر" حاصل کرنے والا اس کو معطل چھوڑ دے یا اس کو برآمد نہ کرے تو وہ اس کا مالک نہیں رہ سکتا اور نہ دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے روک سکتا ہے، جب تک وہ اس میں کام کر سکتا ہے کرے، ورنہ عامہ مسلمین کے حق میں دستبر دار ہو جائے۔"[1]

"معاونِ باطنہ" یا "زمین کے کسی حصہ" کو بطور جاگیر دینے کے جواز میں شرائط بالا کے علاوہ مجتہدین اسلام نے اس مسئلہ کی روح کو جس انداز میں بیان فرمایا ہے وہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ "کتاب الخراج" میں اقطاع (جاگیر دینے) پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

❶ قال أبو يوسف: أما أنا فأرى اذا لم يكن فيه ضرر على أحد، ولا لأحد فيه خصومة أن إذن رسول الله صلى الله عليه وسلم جائز الى يوم القيامة.. فإذا جاء الضرر فهو على الحديث: وليس لعرق ظالم حق.[2]

ترجمہ: اقطاع (جاگیر دینے) کے مسئلہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ اگر ایسا کرنے سے کسی فرد یا جماعت کو نقصان نہیں پہنچتا اور نہ اس زمین کے متعلق کسی کا کوئی مناقشہ ہے تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اجازت قیامت تک کے لیے صحیح اور حق ہے اور اگر ایسا کرنا ضرر اور نقصان کا باعث ہو جائے تو اس وقت یہ معاملہ اس حدیث کا مصداق ہو گا "ظالم کو رگ کے لیے کوئی حق نہیں ہے یعنی جو اقطاع عامۃ الناس کے حق میں مضر ہو امام کو اس سے بچنا چاہیے ورنہ یہ

(۱) علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ: معالم السنن (شرح ابی داود)، ۳/۴۳

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الارض فی الصلح والعنوۃ وغیرهما، ص ۱۳۸

ظلم ہو گا۔

❷ وللامام أن يقطع كل موات، وكل ما كان ليس لأحد فيه ملك، وليس في يد أحد و يعمل في ذلك بالذي يرى أنه خير للمسلمين وأعم نفعا.[1]

ترجمہ: اور امام کے لیے یہ جائز ہے کہ افتادہ (مردہ) زمین کو کسی کو جاگیر کے طور پر دے دے بشرطیکہ وہ کسی کی ملک نہ ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو اور امام کو اختیار ہے کہ وہ اس زمین کے بارے میں عامہ مسلمین کے لیے نفع اور خیر کے اصول کو پیشِ نظر رکھ کر جو چاہے کرے۔

ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ کا حوالہ:

اور ابو عبید کتاب الاموال میں نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زمین کا ایک ٹکڑا بطور جاگیر طلب کیا اور ان کو یہ یقین دلایا کہ ایسا کرنے سے عامۃ الناس اور عامہ مسلمین کو کسی کا کوئی ضرر لازم نہیں آتا۔ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بصرہ کے والی حضرت ابو موسیٰ اشعری[2] رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ تحریر فرمایا:

إن كانت كما تقول فأقطعها إيّاه.[3]

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۳۱

(۲) ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو موسیٰ عبد اللہ بن قیس اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہجرت حبشہ کی، پھر واپس آگئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم کے لیے انہیں یمن بھیجا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں بصرہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں کوفہ کے قاضی تھے۔ آپ نے جہاد میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اہواز کی فتح اللہ کریم نے آپ کے ہاتھوں کرائی۔ آخر میں مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہو گئے، اور مکہ مکرمہ میں ہیں ۵۲ھ یا ۴۲ھ میں وفات پائی۔ (اسد الغابة، تذکرہ ابو موسی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ. الاستیعاب، تذکرہ ابو موسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۳) ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ تعالیٰ: کتاب الاموال، (ایڈیشن ۱۳۵۳ھ)، ص ۲۷۷، نمبر ٦٨٧

ترجمہ: اگر بات اس طرح ہے جیسا کہ یہ کہتا ہے تو اس کو زمین کا وہ ٹکڑا جاگیر دے دو۔

بلاذری رحمہ اللہ کی روایت:

اور بلاذری رحمہ اللہ نے اس واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد اس طرح نقل کیا ہے:

إن كانت ليست تضر بأحد من المسلمين وليست من أرض الخراج فأقطعها إيّاه.[1]

ترجمہ: اگر اس حصۂ زمین کو بطور جاگیر دے دینا نہ تو کسی مسلمان کے لیے باعث مضرت ہے اور نہ یہ زمین "خراجی" ہے (یعنی مفتوحہ علاقہ کی ایسی زمین جس سے سرکاری مالگذاری آتی ہے) تو اس کو جاگیر کے طور پر اس شخص کو دے دو۔

شرائط اقطاع:

ان تمام حوالجات کا حاصل یہ ہے کہ معادِن تو الگ رہے اگر معمولی زمین بھی بطور جاگیر کسی کو دی جائے تو حسبِ ذیل شرائط کا پیشِ نظر رہنا ازبس ضروری ہے، ورنہ تو یہ عمل اسلامی احکام میں ظلم اور ناجائز ہو گا:

❶ وہ زمین نہ کسی مسلمان کی اور نہ کسی معاہد کی ملک ہو، اور نہ ان میں سے کسی کے قبضہ میں ہو۔

❷ نہ اس میں زراعت کے اور نہ تعمیر کے آثار پائے جاتے ہوں اور نہ کسی اہل بستی کے مفادِ عام کے لیے "فِنَا" ہو، نہ چراگاہ ہو نہ قبرستان کی زمین ہو، نہ سوختہ حاصل کرنے کی جگہ ہو اور نہ ریوڑوں کے بیٹھنے یا چرنے کے کام آتی ہو۔[2]

❸ اس سے مفادِ عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔

---

(۱) بلاذری، ابوالحسن: فتوح البلدان، مطبع ازھر، قاھرۃ، ۱۹۳۲ھ، ص ۵

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الأرض الخ، ص ۱۳۷

وجوہ اقطاع:

اور امام کو اس عمل اقطاع کی اجازت صرف اس لیے دی گئی کہ کوئی زمین بنجر (مردہ) باقی نہ رہے اور معطل رہنے کی وجہ سے محصولاتِ زمین کم نہ ہوں کہ بیت المال گھاٹے میں رہے۔

فإنّ ذلك أعمر للبلاد وأكثر للخراج.(۱)

ترجمہ: یہ اقطاع اس لیے جائز ہے کہ اس سے بستیوں کی آبادی ہوتی ہے اور خراج (محصول زمین) میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور ان شرائط کے ساتھ امام کے لیے "اقطاع" (جاگیر دینا) صرف جائز ہے اور مقامِ عام کی خاطر ہے نہ کہ اس کو مضرت پہنچانے کے لیے اس لیے وہ دینے نہ دینے میں مختار ہے۔

اور "جواز مع شرائط" کا یہ معاملہ بھی عام مردہ افتادہ زمینوں کے متعلق ہے لیکن یہ زمین اگر معادنِ باطنہ کی حامل ہیں تو ان میں مفادِ عامہ کے پیشِ نظر امام کے رجحانات کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اسوۂ حسنہ کافی ہے۔

إن يقطعها ما خلا المعادن فأنّه استثناها.(۲)

ترجمہ: حضرت بلال (بن حارث) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت دی کہ معادن کے علاوہ حصص زمین کو بطورِ جاگیر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں زمینوں کا کافی حصہ یونہی معطل پڑا ہوا تھا، اور اگر کسی جگہ "کان" بھی موجود ہوتی ہے تو اس کو نکالنا آسان نہیں تھا۔ ایک شخص بمشکل شدید محنت سے معمولی ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھالیتا تھا۔ لہٰذا ضروری ٹھہرا کہ ایسی بنجر اور افتادہ زمینوں کو کارآمد بنانے

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۳۱

(۲) حوالہ بالا، باب حکم القطائع، ص ۱۳۳

کے لیے ''اقطاع'' (بطور جاگیر دینا) کی صورت اختیار کی جائے[1]۔ پس جب تک یہ صورتِ حال رہے کہ عامۃ الناس اور حکومت (خلافت) کا مفاد ''اقطاع'' میں ہو تو یہ عمل نہ صرف درست بلکہ مستحسن و ضروری ہو گا، اور جب کبھی صورت حال بدل جائے اور مفادِ عامہ اور مفاد مسلمین کے پیشِ نظر ان کا حکومت کے ہاتھ میں رہنا مفید ہو اور کسی ایک شخص یا جماعت کے قبضہ میں دے دینا مضرتِ عام کا باعث بن جائے، جیسا کہ موجودہ مشینوں کے دور میں ''معادِن'' کے مفاد کا معاملہ ہے، تو اس صورت میں ''معادن باطنہ'' کا جاگیر کے طور پر دینا خود حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ''لیس لعرق ظالم حقٌّ'' اور ''أنّما اقطعه الماء العد قال فرجعه'' کے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسطورہ بالا فیصلوں کے مطابق نادرست ہو گا۔

''معادن'' (کانوں) کے معاملہ میں ان احکاماتِ حدیثی و فقہی کے بعد صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ حقہ کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے جن میں ''معادن'' کو بیجا استعمال کرنے پر اظہارِ نفرت اور وعید کا اظہار پایا جاتا ہے تاکہ بآسانی یہ معلوم ہو سکے کہ اس خاص مسئلہ میں صاحبِ شریعت کی ''بالغ نظری'' کن رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔

کانوں پر طاقتوروں کا ناجائز قبضہ:

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نورِ نبوت کی روشنی میں مستقبل کا مطالعہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ وہ زمانہ بھی آنے والا ہے جب ''معدنیات'' پر شریروں کا قبضہ ہو جائے گا۔

عن رجل من بنی سلیم عن جده انه أتى النبی صلی الله علیه وسلم فقال: هذه من معدن لنا. فقال النبی صلی الله علیه وسلم: سیکون معدن یحضرها شرار الناس.[1]

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کچھ چاندی لایا اور

(۱) الهیثمی: مجمع الزوائد منبع افوائد، مکتبه القدسی، قاهرة، ۱۳۵۳ھ: ٤/٦٥

کہنے لگا: یہ ہماری معدن (کان) سے نکلا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے کہ معادن (کانوں پر) شریر لوگ قابض ہو جائیں گے۔

ان شریر انسانوں سے وہ انسان مراد نہیں ہیں جن کی شرارت انفرادیت لیے ہوئے ہے بلکہ وہ ظالم قومیں اور جابر حکمران مراد ہیں جو معاون پر قابض ہو کر عام انسانوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ان کو انسانی دنیا کی تباہی اور سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کا آلہ کار بنا کر دنیا کو اپنی شرارت اور شیطنت سے بھر دیں گے۔ چنانچہ اس کی تائید ابو داؤد کی مشہور حدیث بھی کرتی ہے۔

''حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میرے ذمہ ایک شخص کے دس دینار واجب تھے ایک روز آکر وہ چمٹ گیا کہ اپنی رقم لیے بغیر نہ ٹلوں گا یا کوئی ضامن دو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر ضمانت کر لی۔ کچھ وقفہ کے بعد ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میرے قرض کی مقدار سونا لے کر آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے دریافت فرمایا:

من أين أصبت هذا الذهب؟ قال من معدن: قال: لا حاجة لنا فيها، ليس فيه خير. فقضاها عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم.[1]''

ترجمہ: یہ سونا تم نے کہاں سے حاصل کیا؟ اس نے عرض کیا کان سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم کو یہ نہیں چاہیے اس میں خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ اور پھر قرض خواہ کو اپنے پاس سے رقم ادا فرمادی۔

مشہور محدث خطابی رحمہ اللہ اس جملہ کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ آپ

(۱) ابوداؤد: السنن، كتاب الامارة والفئ والخراج، كتاب الزكاة، باب الرجل يخرج من ماله

صلی اللہ علیہ وسلم نے "لیس فیہ خیر" اس لیے فرمایا کہ اس قسم کے سرمایہ میں اکثر سرمایہ دار حریص اور طامع ہو جاتے ہیں اور ایسے مال پر عائد شدہ جو زکوٰۃ (خمس) واجب ہوتا ہے وہ قطعاً نہیں نکالتے یا حیلہ بہانہ بنا کر اس کو کم ظاہر کرتے ہیں اور عامل زکوٰۃ کو پوری زکوٰۃ نہیں ادا کرتے ہیں۔ اس لیے ایسا مال اکثر مشتبہ رہتا ہے، دوسرے یہ کہ چونکہ کان کنی سخت محنت اور مصیبت کا کام ہے اور مزدور اس محنتِ شاقہ کے لیے بمجبوری آمادہ ہوتے ہیں اس لیے کان کا مالک یا اجارہ دار سخت گیری برتتا اور مزدوروں کو محنتِ شاقہ برداشت کرنے پر مجبور کرتا ہے، لہذا ایسے مال سے کہ جس میں غریبوں پر تشدد کیا گیا ہو برکت اور رحمت مفقود ہو جاتی ہے۔[1]

یہ ہیں وہ کلمات طیبات جو نورِ نبوت کے آئینہ میں حال اور مستقبل کا نقشہ دیکھ کر زبان وحی ترجمان سے نکلے اور جن کا ایک ایک حرف زمانۂ ماضی سے بھی زیادہ آج صادق آرہا ہے۔

معدنیات میں انفرادی ملکیت کے نقصانات:

❶ غرض چاندی، سونا، لوہا، کوئلہ پٹرول وغیرہ قسم کی کانیں اقتصادی نظام پر بہت زیادہ اثر انداز ہیں اور وجوہِ معیشت کی جان ہیں اس لیے موجودہ دور میں اسلام کے معاشی نظام سے متعلق احکام کی روشنی میں یہ دعوی بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ ان سب کو شخصی ملکیت نہیں بلکہ جماعتی یعنی حکومت (خلافت) کی ملکیت ہونا چاہیے تاکہ مفادِ عامہ باطل ہو کر مفادِ خاصہ میں تبدیل نہ ہو جائے۔

❷ کون نہیں جانتا کہ اسٹیمر، ریلوے، دخانی جہاز، ہوائی جہاز، موٹر، شہر کی روشنی وغیرہ جیسے اہم کاروبار بغیر کوئلہ، پٹرول، لوہا، پیتل کے نہیں چل سکتے، چاندی، سونا اور تانبا زیورات وظروف کے علاوہ سرکاری سکوں کے قیام اور تجارتی کاروبار کی ترقی کے لیے کس قدر اہم ہیں، سب کو معلوم ہے۔ پس اگر اقتصادی نظام میں قدرت کی یہ بخشی ہوئی "دولت" ایک یا چند خاص افراد کے ہاتھ میں دے دی جائے اور حکومت

---

(۱) علامہ خطابی: معالم السنن (شرح سنن ابی داود)، ج ۳، شرح حدیث مذکورہ بالا

اور ان کے درمیان اس سرمایہ داری کی تقسیم اجارہ داری کے نام سے کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ ملک کی باقی آبادی اس کے انتفاع سے بڑی حد تک محروم رہ جائے گی اور یقیناً اس راہ سے ایک خاص جماعت میں ''دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ'' اور ''يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ'' کا منظر نظر آنے لگے گا۔

❸ جس دور میں بھی اصول کے خلاف ان کانوں کو کسی ملّی یا وطنی حکومت نے اجارہ داری کے سسٹم پر چلانے کی سعی کی اس کو نہ صرف اپنے اقتصادی نظام میں شدید نقصان اٹھانا پڑا، بلکہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجنبی اجارہ داروں نے اس قوم کو تباہ کرنے اور غلامی کی لعنت میں گرفتار کرنے کا بہترین ذریعہ اکثر اسی کو بنایا اور صدیوں تک اس کو ان سے نجات نہ مل سکی۔ ہندوستان، مصر، عراق، ایران عہد جدید میں اور امریکہ و وسطی یورپ عہد قدیم میں اسی غلط روی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور اس زمانہ میں یورپ و ایشیا کی حکومتوں کے بیشتر کروبار اسی قسم کے مٹھی بھر انسانوں کے رحم و کرم پر چل رہے ہیں اور اقتصادی خوشحالی و بدحالی، حتیٰ کہ ملکوں کے عروج و زوال ان ہی خود غرض اور حریص سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔

❹ منڈیوں میں ارزانی، گرانی، سکوں کے طلائی و نقرئی معیار (Gold & Silver Standard) اور درآمد برآمد کے معاہدات پر انہی کا قبضہ و تسلط ہے اور حکومتوں نے جابرانہ و قاہرانہ استعماریت کی طمع میں مفاد عامہ کو ان کے ہاتھوں تباہ و برباد کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور اگر تاریخ کی شہادت غلط نہیں بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ مہاجنوں کی اس دستبرد کی ابتداء اسی قسم کی اجارہ داری اور ملکیت کی رہینِ منت ہے۔

پس اسلام اس قسم کی عام بدحالی کو اپنے نظام میں کس طرح برداشت کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟

رُکاز / دفائن (Treasure Troves) میں انفرادی ملکیت کی اجازت:

البتہ اس سلسلہ میں اسلام کا معاشی نظام اس قدر انفرادیت کو ضرور تسلیم کرتا ہے کہ اگر کسی شخص کے ذاتی مکان یا صحرائی زمین میں کوئی دفینہ نکل آیا یا کان کا کوئی حصہ برآمد ہو گیا اور اس نے محنت کر کے اس سے کچھ حاصل کر لیا، تو یہ اس کی ملکیت شمار ہو گی۔ اور اس کو دولت (سرمایہ) قرار دے کر اس پر زکوۃ یا خمس (پانچواں حصہ) عائد کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ فقہائے اسلام نے اس کی تفصیلات اس طرح بیان فرمائی ہیں۔

دفینہ اور لقطہ:

دفینہ اگر اسلامی دور سے تعلق رکھتا ہے یعنی سکہ پر اسلامی سکہ کی علامات پائی جاتی ہیں تو اس کا حکم "لقطہ" (گری پڑی یا گمشدہ چیز جو کسی کے ہاتھ آگئی) کا ہے جس کے تفصیلی احکام کتبِ فقہ میں درج ہیں، اور اگر غیر اسلامی دور کی علامات موجود ہیں یا کسی قسم کی علامت نہیں ہے تو وہ ذاتی مکان یا زمین میں برآمد ہوا ہو یا عشری، خراجی یا افتادہ صحرائی زمین میں، پہاڑ میں نکلا ہو اس پر "خمس" (پانچواں حصہ) واجب ہو گا، کیونکہ حدیث میں ہے:

وفی الرکازۃ الخمس.[1]

ترجمہ: مال مدفون پر خمس واجب ہے۔

اور معدنیات میں تین قسم کی حاصلات ہوتی ہیں:

1. سیال نہ ہوں، لیکن آگ پر رکھنے سے پگھل جائیں، مثلاً، سونا، چاندی، پیتل اور تانبا وغیرہ۔
2. سیال ہوں، مثلاً پٹرول، مٹی کا تیل اور تارکول وغیرہ۔
3. نہ سیال ہوں اور نہ آگ پر رکھنے سے پگھل سکتی ہوں، مثلاً زمرد، ہیرا، یاقوت سرمہ وغیرہ۔

---

(۱) صحیح بخاری: ج ۱، کتاب الزکاۃ

پس اگر یہ ذاتی زمین یا ذاتی مکان میں برآمد ہوئیں تو ان پر حکومت (خلافت) کا کوئی مطالبہ نہیں [1]، اور اگر عشری، خراجی زمین یا صحرا و جبال (پہاڑوں) میں برآمد ہوئی ہیں تو پہلی قسم پر خمس (پانچواں حصہ) واجب ہے اور باقی دونوں قسموں پر کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ [2]

دفینہ اور معدن میں فرق کی وجہ:

فقہاء اسلام ''دفینہ'' اور ''معدن'' کے مسائل زکوٰۃ میں فرق کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں کہ ''دفینہ'' زمین کے اجزاء میں سے نہیں ہے، بلکہ زائد از زمین ایک شے ہے، بخلاف ''معدن'' کے کہ وہ اجزاءِ زمین میں سے ہے، مثلاً سونا یا چاندی مٹی ہی کے وہ اجزاء ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ ارض کے وقت سے اس میں ودیعت کر دیئے ہیں اس لیے ''دفینہ'' اور ''معدنیات'' میں زمین و مکان اور صحرائی یا عشری و خراجی زمین کے سلسلہ میں جو فرق نظر آتا ہے وہ فطری اور معقول ہے۔

معادن کی ملکیت کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ:

اور امام مالک رحمہ اللہ [3] نے تو ''معادن'' کے بارے میں یہاں تک فرمادیا ہے کہ اگر خلیفۂ وقت نے قاہرانہ حیثیت سے کسی ملک پر قبضہ کیا ہے اور مفتوح پبلک سے مصالحت اور معاہداتِ خصوصی کے ذریعہ قبضہ نہیں کیا تو اس ملک میں اگر کانیں

---

(۱) البتہ اگر وہ اشیا ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے تو حولانِ حول یعنی سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۲) اور اگر ان کی تجارت کرے گا تو مال تجارت کی طرح زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۳) امام مالک رحمہ اللہ، مالک بن انس اصبحی عربی رحمہ اللہ ۹۵ھ (مطابق ۷۱۳م) میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ساری زندگی میں صرف ایک بار حج کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے، اور مدینہ منورہ میں ہی ۱۷۹ھ (مطابق ۷۹۵م) وفات پائی۔ آپ مذہب مالکی کے بانی ہیں۔ آپ نے حضرت ربیعہ بن عبدالرحمٰن عرف ربیعہ رائی رحمہ اللہ سے فقہ، حضرت نافع بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے غلام زہری، ابو الزناد اور یحییٰ بن سعید انصاری رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حدیث حاصل کیا، موقف پر ثابت قدم رہ کر اس کی خاطر تکالیف برداشت کرنے والے تھے، اس بنا پر حاکم مدینہ منورہ جعفر بن سلیمان نے آپ کو کوڑے پٹوائے۔ آپ نے حدیث میں کتاب ''موطا'' ترتیب دی، جس نے بہت مقبولیت پائی، اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں، مشہور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی ''تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک رحمہ اللہ'' ہے۔

برآمد ہوں تو اس زمین کی شخصی ملکیت ساقط ہو کر سلطان (خلیفہ) کی جانب لوٹ جائے گی، اور حکومت کو اس پر قطعی اختیار حاصل ہو گا کہ وہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے کرے، خواہ اس کی برآمد کو اپنے انتظام سے کرائے اور خواہ اس کو عطیہ کے طور پر یا اجارہ پر دے دے۔

قال وما افتتحت عنوة فظهر فيها معادن، فذلك إلى السلطان يصنع فيها ماشاء، ويقطع بها لمن يعمل فيها، لأن الأرض ليست للذين أخذوا عنوة.[1]

ترجمہ: امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: جس زمین کو خلیفہ نے قاہرانہ فتح کیا ہے اگر اس میں کانیں نکل آئیں تو وہ زمین سلطان (خلیفہ) یعنی حکومت کی جانب لوٹ جائے گی۔ وہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور (فرد واحد یا جماعت) جو اس میں کان کنی کا کام کرنا چاہے اس کو دے دے یہ اس لیے کہ جن مجاہدین نے اس کو جہاد کر کے فتح کیا ہے زمین ان کی ملکیت نہیں بن جاتی۔

مگر عطیہ اور اجارہ میں یہ شرط ملحوظ رہے گی کہ عامۃ الخلق کے حق پر زد نہ پڑتی ہو۔ چنانچہ اندلس کے مشہور فلسفی وفقیہ ابن ارشد رحمہ اللہ[2] امام مالک رحمہ اللہ کے اس ارشاد پر اصولی بحث کرتے اور دو قول میں سے ایک قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”معادن پر خلیفہ ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے اور عطیہ کے طور پر بھی دے سکتا ہے، اس کی مثال عہدِ نبوت میں موجود ہے کہ نبی اکرم (صلی

---

(۱) امام مالک بن انس: المدونة الکبری، (مطبوعہ مصر)، ۳۴۹/۱

(۲) ابن ارشد، ابن ارشد الحفید، مالکی فقہ کے پانچویں صدی کے مشہور فقہاء ــــــ ابو الولید الباجی رحمہ اللہ، ابو الحسن لخمی رحمہ اللہ اور ابن عربی رحمہ اللہ ــــــ کے ہم عصر تھے۔ آپ کا شمار اندلس کے مشہور فلاسفہ اور فقہاء میں ہوتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں ”بداية المجتهد ونهاية المقتصد“ اور ”کتاب المقدمات و الممهدات على المدونة الكبرى“ مشہور ہیں۔

اللہ علیہ وسلم) نے بلال بن حارث مزنی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو قبلیّۃ کی کان کا ایک حصہ بطور عطیہ دے دیا تھا۔ اور دو قول میں سے پہلے قول (کہ معادن زمین کے تابع نہیں ہیں) کی دلیل یہ ہے کہ سونا چاندی جو کانوں کے اندر ہیں زمین پر کسی کے بھی مالکانہ قبضہ سے قبل جوف زمین (Depth- Belly of Land) میں موجود ہیں اس لیے زمین کی ملکیت سے معدن کی ملکیت ہرگز لازم نہیں آتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ وہ جس کو چاہے زمین کا اور زمین کے اندر جو کچھ موجود اس سب کا مالک بنا دے بلکہ صرف زمین کے مالک بنا دینے کا ذکر فرمایا ہے:

فوجب بنحو هذا الظاهر أن يكون ما فى جوف الأرض من ذهب أو ورق فى المعادن فئاً لجميع المسلمين.[1]

ترجمہ: لہٰذا آیت کے اس ظاہر مفہوم کے پیشِ نظر از بس ضروری ہے کہ جوفِ زمین میں از قسم معادن سونا چاندی جو کچھ بھی ہے اس پر تمام مسلمانوں کا یکساں حق ہے۔

اجارہ داری کی کمپنیاں

نقصانات:

❶ معدنیات سے متعلق اجارہ داری کا معاملہ عموماً کمپنی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور ملک کا وہ بہترین سرمایہ جو زیادہ سے زیادہ انسانوں بلکہ حکومت کی تمام آبادی کے لیے مفید اور نفع بخش ثابت ہو سکتا تھا اس طرح افراد کے اندر محدود ہو جاتا اور آخر کار عام بدحالی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

---

(۱) ابن رشد: كتاب المقدمات والممهدات على المدونة الكبرى، ۱/ ۲۴۲، ۲۴۳

❷ عہدِ جدید و قدیم میں جس ملک میں بھی اس قسم کی اجارہ داری پائی جاتی ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بدولت کاخانہ دار اور مزدور یا سرمایہ اور محنت کے درمیان میدانِ کارزار گرم ہو گیا ہے اور بعض اوقات حکومتوں کی تباہی و بربادی پر ختم ہوا ہے۔ کارل ماکس کا نظریہ اشتراکیت (Karl Marx's Theory of Socialism) اسی کا رہینِ منت ہے اور روس کا دور اشتراکیت اسی کی جدید پیداوار۔ پس اگر معدنیات کے لیے کمپنی اور شیئرز (حصوں) کا یہ حرص انگیز سسٹم بطور اصول اور تجارتی بنیاد کے تسلیم نہ کر لیا جاتا اور ان امور کو مفادِ عامہ کے اصول کے پیشِ نظر حکومت کے اختیارات مجازی کے سپرد کر دیا جاتا تو افراط و تفریط کی راہ سے الگ اسی اعتدال کی راہ پیدا ہو جاتی، جس کی جانب اسلام نے اپنے نظام میں توجہ دلائی ہے، اور پھر نہ اشتراکیت سے ابتری پھیلتی اور نہ سامراجی نظام سے بدحالی و تباہ کاری۔

❸ لہٰذا عام حالات میں وہ ایسی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تیار نہیں ہے اور بعض مخصوص حالات میں عطیہ یا اجاری داری کے جواز و اباحت کی شکل میں بھی اس بنیادی اصول کو فراموش کرنا نہیں چاہتا جس سے مفادِ عامہ خطرہ سے محفوظ رہے اور مذموم سرمایہ داری کو سر اٹھانے کے لیے بہانہ ہاتھ نہ آجائے کیونکہ اس قسم کی کمپنیاں جب اپنے تجارتی نظام کو وسیع کرنے کے لیے بین الاقوامی حالات پر نگاہ ڈالتی ہیں تو اپنے خصوصی مفاد کے پیشِ عام افادہ اور عام لوگوں کے نفع سے آنکھ بند کر کے ملک اور حکومت کے تمام سیاسی، اقتصادی معاشرتی رجحانات کو اسی ایک رخ پر چلانے کی سعی کرتی ہیں، جن سے ان کا ذاتی مقصد فروغ پا سکتا ہے، خواہ اس کی بدولت ملک کی عام حالت یا انسانوں کی عام زندگی خطرہ ہی میں کیوں نہ پڑ جائے اور یہی وہ زہر ہے جو اگرچہ اپنی ابتدائی شکل میں نہایت حسین، شیریں اور مفید اور حیات پرور نظر آتا ہے لیکن اندر ہی اندر خدا تعالیٰ کی مخلوق کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور بالآخر خدا کی اس مخلوق پر موت کی نیند طاری کر دیتا ہے۔

❹ آپ شاید اس بیان کو حیرت سے پڑھیں کیونکہ جدید ترقی پذیر دنیا نے تو

کمپنیوں کے اس سسٹم ہی سے ترقی اور اقتصادی سربلندی حاصل کی ہے لیکن اگر آپ فلسفہ اجتماع اور انسانی نشو و ارتقاء کے مقصدِ عظیم "اخوت عامہ" کے پیش نظر باریک بینی سے مطالعہ کریں گے تو اندازہ ہو گا کہ یہ سب دھوکہ اور فریب ہے۔ اسی سسٹم نے قوموں کو باہمی عداوت اور استحصال بالجبر کی بنیاد ڈالی، اسی نے خود اپنے ملک کی عام آبادی کو چند مخصوص سرمایہ داروں کا غلام بنا کر تباہ کیا اور اسی نے "اقتصادی ترقی" کے نام سے دنیا کے ہر گوشہ میں بے اطمینانی، خود غرضی اور مہذب ڈاکہ زنی کو عام کر دیا ہے۔

اور اگر ان اشیاء کو "مفادِ عامہ" کی ملک قرار دیا جاتا اور اسی مقصد کے اندر محدود رہ کر حکومت ان کا انتظام کرتی یا پبلک کے افراد کے ذریعے کمپنی کی شکل میں مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے فروغ دیتی تو یہ صورت کبھی پیدا ہونے نہ پاتی اور ملک میں ایک عام متوسط زندگی کا دور ہوتا اور اطمینان کی زندگی نصیب ہوتی۔ قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ اگر یہ کہا جائے کہ کانوں (معادن) سے متعلق اگر اسلام کا معتدل اقتصادی نظام تسلیم کر لیا جائے جو مخصوص حالات میں بعض بنیادی شرائط کے ساتھ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے حقیقتاً اجتماعی ملکیت کو اساس سمجھتا اور اس طریقِ عمل کو مفادِ عامہ کے لیے ضروری مانتا ہے تو نہ صرف پبلک میں عام خوشحالی کا دور پیدا ہو جائے گا بلکہ اس طرح عام رفاہیت، تجارت کی فراوانی اور زراعت کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ "ذرائع" مہیا ہو سکیں۔

۵ مثلاً جب پٹرول کی کانیں ملک میں برآمد ہوں اور اجارہ دارانہ سسٹم کی کمپنیوں کے بجائے خود حکومت کی سرکاری کمپنی اس کی برآمد کا انتظام کرے تو ظاہر ہے کہ درمیانی ایجنٹ کی من مانی زیادہ ستانی سے اس کی قیمت میں موجودہ دور کی طرح ناقابل برداشت گرانی نہیں ہو سکے گی اور اس طرح اس کا فائدہ صرف مخصوص سرمایہ داروں ہی تک محدود نہ رہے گا، بلکہ عام اور متوسط طبقہ بھی بلند ہو سکے گا، جس پر ملک کی بہتری کا بہت کچھ مدار ہے اور اس طرح استعمال کے لیے بھی اس کا فائدہ عام ہو جائے

گا۔

❻ کیا کوئی کاروباری آدمی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر آج کوئلہ درمیانی کمپنیوں کے ذاتی منافع کے شکار سے نکل کر براہِ راست خود حکومت کے ہاتھوں ملک تک پہنچے تو ضروریات کی ہزاروں اشیاء جن کی ارزانی اور گرانی کا مدار کوئلہ کی ارزانی اور گرانی پر ہے اس قدر ارزاں ہو جائیں کہ دولت مندوں کی طرح عوام اور متوسط بھی ان اشیاء سے کافی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

جہازوں اور ریلوے کے ٹکٹ، محصولات اور آلاتِ حمل و نقل کی فراوانی وغیرہ اس ترقی کے دور میں بڑی حد تک اسٹیم اور بجلی کی قدر و قیمت کے ساتھ وابستہ ہیں اور اسٹیم و بجلی کا آدھا وجود کوئلہ پر موقوف ہے، پس اگر کوئلہ ارزاں ہے تو اس کا اثر مذکورہ بالا تمام اشیاء پر پڑتا ہے اور اگر گراں ہے تو یہ تمام اشیاء پر اثر انداز ہے، لہٰذا اقتصادی نظام کے مسطورہ بالا نظریہ کا یہ پہلو اس قدر صاف ہے کہ کوئی صاحبِ عقل و خرد اس کی صحت کا انکار نہیں کر سکتا۔

ملیں اور کارخانے

غریب مزدوروں پر سرمایہ دار کی آقائی کا جال:

جب صنعت و حرفت انسانی ہاتھوں سے نکل کر مشینوں اور کلوں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے تو "سرمایہ دار" کے لیے جنت کی ایک کھڑکی کھل جاتی ہے اور وہ ملیں اور کارخانے قائم کر کے خدا کے اپنے ہی جیسے بندوں "غریبوں اور مزدوروں" پر آقائی بلکہ العیاذ باللہ خدائی کرتا ہے، وہ مزدوروں کے نام سے ان کی جان و مال اور آبرو پر قابض ہو جاتا ہے اور ان انسانوں کو غلاموں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں کی طرح اپنے مفاد کی قربان گاہ پر چڑھانے کا عادی بن جاتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے۔

دے رہا ہوں مزد کی صورت میں اس کو زکوٰۃ
درحقیقت اس کی محنت کا صلہ کچھ بھی نہیں

اس کی کم ظرفی نے فطرت کا بگاڑا ہے مزاج
رفتہ رفتہ ہو رہی ہے وہ خسیس و خشم گیں
سیم وزر لے کر بھی میں راضی نہ تھا روزِ ازل
بن گیا مزدور جھٹ جاروب و تیشہ کار ہیں

اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس دورِ تہذیب و تمدن کے موجد جو غلامی کو لعنت کہتے اور اس کے خلاف بڑھ بڑھ کر لیکچر دیتے رہتے ہیں غلامی کے اس اقتصادی جال کو نہ صرف جائز رکھتے بلکہ اپنی حکومتوں اور شہنشاہیتوں کی ترقی کے لیے بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کو ہر وقت سراہتے اور سرمایہ دار کے اس جال کی بندشوں کو قوانین کی راہ سے اور زیادہ مضبوط کرتے رہتے ہیں اور اس جال کی بندشوں کا حسن و نکھار اس وقت اور زیادہ قابلِ دید ہوتا ہے جب اس کے جواز کے لیے دھرم اور مذہب کے نام پر غلط حمایت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ محنت کی زیادتی حقِ محنت کی کمی اور عام حقوق انسانی سے محرومی کے بعد اس ریوڑ کی زبوں حالی دیکھنی ہو تو بمبئی، کلکتہ، کراچی، مدراس، دہلی، کانپور اور شولا پور جیسے تجارتی مقامات میں جا کر دیکھئے۔ پہلے ''مل آنرز'' (Mill Owners) کی چمن زار کوٹھیوں اور جنت نظیر بنگلوں پر ایک نظر ڈالیے اور اس کے بعد پھر ان غلیظ اور نجس چالوں اور کواٹروں کو ملاحظہ فرمائیے جس میں بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح مزدور آباد ہیں، لیکن قانونِ فطرت انتقام لیے بغیر کب باز رہتا ہے، آخر مزدور و سرمایہ دار کی جنگ کے نام سے وہ شعلے بھڑک اٹھے ہیں جس نے ''سرمایہ دارانہ'' نظام کو بھسم کر کے بالآخر ایک قدیم مگر عادلانہ نظام کے لیے زمین ہموار کر دی ہے۔ ''لعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلك امرا''

سرمایہ اور محنت میں توازن

اسلام چونکہ خود دینِ فطرت ہے اور اس کا نظام کسی انتقام یا ردِ عمل پر مبنی نہیں ہے بلکہ اپنے وجود ہی میں کائناتِ انسانی کی عام فلاح و بہبود کا ہمہ گیر نظام اور انسانی

ضروریاتِ دینی و دنیوی کے ہر شعبہ میں مستقل انقلابی پیغام ہے اس لیے اس نے اپنے اقتصادی نظام میں اس جگہ بھی مذموم سرمایہ داری کی حمایت نہیں کی بلکہ سرمایہ اور محنت میں ایک ایسا معتدل توازن قائم رکھا ہے۔ اس کے بعد اس جنگ کے لیے کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ اسے یہ معلوم ہے کہ "سرمایہ دار" مزدور کو کن راہوں سے تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ سو اگر وہ راہیں بند کر دی جائیں تو پھر تعاون اور امدادِ باہمی کا وہ قانون جو انسان کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے یہاں بھی بغیر افراط و تفریط کے صحیح نقشہ کے مطابق کس طرح باحسن وجوہ نافذ ہو سکتا ہے۔

چالاک اور ظالم سرمایہ دار کی استحصالی چالیں

اجرت کی کمی:

پہلی گرہ جو اس جال میں مزدور کو پھنسانے کے لیے لگائی گئی ہے وہ "اجرت کی کمی" ہے، وہ نادار ہے مفلس ہے، بے چارہ ہے فاقہ کش ہے، اس لیے اس کی محنت کا صلہ ایک روپیہ ہونے کے باوجود سرمایہ دار اس کو چار آنے پر راضی کر لیتا ہے اس لیے کہ وہ بھوکا ہے، تن پیٹ دونوں کے لیے عاجز و درماندہ ہے، سرمایہ دار خوش ہے کہ اس نے جبر نہیں کیا بلکہ مزدور اپنی خوشی سے اس پر آمادہ ہو گیا اور مزدور یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ اس ناواجب اجرت کو اضطراری طور پر قبول نہیں کرتا تو فاقوں کی بدولت موت کا استقبال لازمی ہے۔ اور یہ کہ دوسرا مزدور مجھ سے زیادہ بد حالی اور اضطرار کی وجہ سے اس سے بھی کم اجرت پر کام کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ کام پر مزدور کی مجبوراً رضامندی:

دوسری گرہ یہ لگائی گئی ہے کہ کم سے کم مزدوری میں مزدور سے کام زیادہ سے زیادہ لیا جائے اور اس کو بھی وہ اپنے افلاس اور تنگ حالی بلکہ فاقہ کشی کی خاطر منظور کر لیتا ہے اور اپنی بے چارگی پر آٹھ آٹھ آنسو بہا کر نو، دس گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ محنت کر کے سرمایہ دار کو خوش کرتا ہے، تب جا کر بمشکل چار آنے کا حقدار ہوتا

ہے۔
لیکن اسلام اپنے نظام میں مفلس اور صاحبِ حاجت کی اس رضا مندی کو ''مرضی''، نہیں تسلیم کرتا اور سرمایہ دار کے ان دونوں پھندوں کو ظلم قرار دے کر اس طلسم کو پاش پاش کر دیتا ہے، فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [1] فرماتے ہیں:

''پس اگر مالی نفع ایسے طریقہ پر حاصل کی اجائے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور عملی محنت کو دخل نہ ہو جیسے قمار یازبردستی کی رضامندی کا اس میں دخل ہو، جیسے سودی کاروبار، تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داری عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اس کی وہ رضا مندی حقیقی رضا مندی نہیں ہوتی، تو اس قسم کے تمام معاملات رضا مندی کے معاملات نہیں کہلائے جاسکتے اور ان کو نہ پاک ذرائع آمدنی کہا جاسکتا ہے، بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکمتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل اور خبیث ہیں۔'' [2]

عن ابی هريرة رضی الله تعالٰی عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: قال الله عزوجل: ثلثة أنا خصمهم يوم القيامة ومن كنت خصمه خصمته (الی) ورجل استأجرا أجيرا استوفی منه ولم يوفه. [3]

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی اللہ: حجة الله البالغه، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق

(۳) امام بیہقی: السنن الکبری، ج ٦، کتاب الاجارۃ. صحیح الامام البخاری ج ۲، کتاب الاجارات، باب اثم من منع اجر الأجير. امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالٰی نے اپنی صحیحین میں ایک ایسی حدیث نقل کی ہے جس سے مزدور کی مزدوری کی اہمیت، اسے وقت پر مزدور کا کسی عذر قید و بند، بیماری، سفر، رکاوٹ وغیرہ —— کی وجہ سے وصول نہ کر سکنا۔ آجر (مزدور سے کام لینے والے) کا مزدور کی

اس اجرت سے سرمایہ کاری کرنے اور یوں اجرت کے مال کو بڑھنے اور اس کی آمد اور مطالبہ پر آجر کا اجرت کو اس کے اضافہ اور منافع جات کے ساتھ واپس کرنے کو ایک بہت بڑا کار خیر، دعاؤں کے قبول ہونے کا ذریعہ اور بلاؤں اور مصائب کے دور ہونے کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ تین آدمی سفر پر تھے راستہ میں بادوباراں نے انہیں آن گھیرا، انہوں نے ایک پہاڑ کی تنگ غار میں پناہ لی۔ ہوا کے تھپیڑوں نے پہاڑ سے ایک پتھر گرایا جو اس غار کے منہ پر آگرا اور وہ غار میں محصور ہو گئے، تینوں نے اپنے نیک اعمال ـــــ جو صرف کریم کی رضا کے لیے کیے تھے ـــــ کو یاد کر کے دعائیں کیں، پہلے نے رات بھر جاگ کر والدین کو دودھ پلانے، مگر ان کو بے آرامی سے بچانے کے لیے نہ جگانے مگر خود بیداری کی تکلیف اٹھانے کا وسیلہ بنا کر دعا کی، اور ایک حصہ پتھر کا ہٹ گیا۔ دوسرے نے بڑی تگ ودو سے ایک حسین وجمیل عورت کو برائی کے لیے آمادہ کرنے مگر اس کے صرف اتنا کہنے پر کہ اللہ کریم سے ڈر، گناہ سے باز رہنے کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور پتھر کا دوسرا حصہ بھی غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اب تیسرے نے کیا ذریعہ بنایا کہ سارا پتھر ہٹ گیا۔ وہ مزدور کی مزدوری کی ادائیگی کے بارے میں ہے۔ آیئے پہلے مصطفی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ پڑھئے، پھر اردو میں معانی:

وقال الثالث: أللهم استاجرتُ اَجراء وأعطيتهم أجرهم غير رجل واحد ترك الذی له وذهب. تثمرت أجره حتى كثرت منه الأموال فجاء نی بعد حين فقال: يا عبدالله! إدإلیّ أجری. فقلت: كل ما تری من أجرك من الإبل والبقر والغنم والرقيق. فقال: يا عبدالله! لا تستهزی بی فقلت: لا أستهزی بك. فأخذه كله فأستافه فلم يترك منه شيئا. أللهم إن كنت فعلت ذلك ابتغاء وجهك فافرج عنا ما نحن فيه. فأنفرجت الصخرة، فخرجوا يمشون. (بحواله رياض الصالحين، باب الاخلاص واحضار النية، حديث نمبر ١٢)

ترجمہ: اور تیسرے نے (اللہ کریم سے دعا کرتے ہوئے) عرض کیا: اے اللہ کریم! میں نے مزدوروں کو اجرت پر رکھا، میں نے ان سب کی مزدوری ادا کر دی مگر ان میں کا ایک (کسی وجہ سے) اپنی مزدوری لیے بغیر چلا گیا۔ میں نے اس کی مزدوری کی رقم کو سرمایہ کاری میں لگا دیا اور اس سے بہت سارے مال بڑھ گئے، وہ ایک زمانہ کے بعد میرے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کریم کے بندہ! میری اجرت مجھے ادا کر دو۔ میں نے کہا: یہ جو کچھ تو دیکھ رہا ہے سارا تیری مزدوری (کا بڑھا ہوا مال) ہے، یہ اونٹ، یہ گائیں بیل، یہ بکریاں بھیڑیں اور یہ غلام (سب تمہارے ہیں)۔ اس نے (تعجب سے) کہا: اللہ کریم کے بندہ! مجھ سے مزاح نہ کر۔ میں نے عرض کیا: میں تجھ سے مزاح نہیں کر رہا۔ لہذا وہ سارے کا سارا لے گیا اور اس نے (میرے پاس) کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اے اللہ کریم! اگر میں نے یہ سب کچھ محض تیری رضا کے لیے کیا تو ہمیں اس تنگی سے نکال دے، جس میں ہم مبتلا ہیں۔ پتھر ہٹ گیا اور وہ پاؤں چلتے باہر آ گئے۔ (سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم)

آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ اللہ کریم کے ہاں اس کمزور طبقہ مزدوروں کی کس قدر عظمت واہمیت ہے کہ ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے والے کے ذریعہ اللہ کریم محیر العقول کرامات ظاہر فرماتے ہیں، دعاؤں کو

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جس سے میں جھگڑوں گا اس کو مغلوب و مقہور کر کے ہی چھوڑوں گا، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے مگر اس کے مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا۔

(امام ابن حزم رحمہ اللہ مزدور سے کام (جسمانی یا ذہنی) لینے کا ایک حکیمانہ اُصول بتاتے ہیں:)

ولیستعملهما فیما یحسّانه و یطیقانه بلا اضرار بهما.[1]

ترجمہ: کام لینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ (آزاد ہو یا غلام) دونوں قسم کے اجیروں سے اس حد تک کام لے کہ وہ اچھی طرح کام انجام دے سکیں اور بقدرِ طاقت کام لینا چاہیے اور یہ نہ ہو کہ ان کو اتنی محنت کرنی پڑے کہ ان کی صحت وغیرہ کو نقصان پہنچے۔

اجرت معین کیے بغیر کام لینا:

سرمایہ دار کی جال کی گرہوں میں سے تیسری گرہ یہ ہے کہ مزدور کی اجرت معین نہ کرے اور اس کی غربت سے فائدہ اٹھا کر یونہی کام پر لگائے اور کام مکمل کرانے کے بعد جو اجرت چاہے دے دے۔ اسلام نے اس کو بھی ناپسند اور ناجائز کہا ہے اور ایسے معاملہ کو خیانت سے تعبیر کیا ہے۔

عن أبی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنه: أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم نهی عن استئجار الأجیر حتی یبین له أجره.[2]

قبول فرماتے ہیں اور جاں گھسل گھاٹیوں سے نکال دیتے ہیں۔

(۱) ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ تعالیٰ: المحلی، ج ۸ احکام الاجارات

(۲) ترمذی: الجامع، ج ۱، کتاب الایمان والنذور، باب الشروط فیه المزارعة والوثائق

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگالیا جائے۔

ادائیگی اجرت میں بلاوجہ تاخیر:

چوتھی گرہ یہ ہے کہ حقِ محنت تو مقرر کر دیا جائے لیکن ادائیگی میں من مانی رکاوٹ پریشان کن ترکیبیں اور جبر و ظلم کے طریقے اختیار کیے جائیں اور مزدور کو وقت پر اس کے معمولی حقِ محنت سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔

اسلام نے اس کا بھی سدباب کیا ہے اور ایسا کرنے کو بد معاملگی "ظلم" اور بڑا گناہ قرار دیا ہے اور وہ اپنے اقتصادی نظام میں ایک لحہ کے لیے بھی سرمایہ دار کے اس ظلم سے درگزر نہیں کرنا چاہتا۔

عن أبي هريرة رضى الله تعالىٰ عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: مطل الغنى ظلم.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مالدار کا مالداری کے باوجود دوسرے کے ادائے حق میں تاخیر کرنا ظلم ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إعط الأجير أجره قبل ان يجف عرقه.[2]

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مزدور کی مزدوری اس کے پسینے کے خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

بیهقی: السنن الکبری: ج ٦ کتاب الاجارات، ص ۱۲

(۱) صحيح الامام البخاری رحمه الله تعالىٰ، كتاب الحواله، باب في الحواله الخ. نووی: رياض الصالحين، باب تحريم مطل الغنى الخ

(۲) امام بیهقی: السنن الكبرى، ج ٦، باب الاجارات

مزدور کا حق تلف کرنے کے لیے بہانہ سازی:

پانچویں گرہ یہ ہے کہ "مزدور" کے حق تلف کرنے اور بہانہ سازی سے "سرمایہ داری" کو فروغ دینے کے لیے مزدور پر کام خراب کر دینے کا الزام لگا کر دیئے ہوئے چند ٹکے بھی جرمانہ کے نام سے واپس لے لیے جائیں، گو بزعم خود یہ ظالم سرمایہ دار اپنے نقصان کا تاوان "انصاف" کے نام سے وصول کرتے ہیں۔

اسلام نے اس کو بھی افراط و تفریط سے الگ اعتدال کی حالت پر لانے کی کوشش کی ہے اور عدل و انصاف کے صحیح اصول پر یہ فیصلہ کیا ہے:

"اور اجیر مشترک ہو یا خاص یا کاریگر ہو اس پر مال میں نقصان ہو جانے یا ہلاک ہو جانے سے کوئی تاوان نہیں آتا تاوقتیکہ اس کا ارادی قصور یا ضائع کر دینا ثابت نہ ہو۔ اور ان تمام امور میں جب تک اس کے خلاف گواہ موجود نہ ہوں اسی اجیر کا قول معتبر ہے قسم کے ساتھ۔"[1]

اور ان تصریحات کے بعد اسلام اپنے اقتصادی نظام میں مزدوروں اور پیشہ وروں کو بھی ارباب رأس المال کے ساتھ زیادتی اور بے جا تعدی کرنے سے روکتا ہے اور نہیں چاہتا کہ ایک طرف سے افراط اور دوسری طرف سے تفریط ہو۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: خیر الکسب کسب

---

(۱) ابن حزم رحمه الله تعالیٰ: محلی: ۲۰۱/۶ اور فقہاء حنفیہ کے نزدیک اجیر خاص کا اگرچہ یہی حکم ہے مگر اجیر مشترک ضامن ہوتا ہے، اور اجیر مشترک اس اجیر کو کہتے ہیں جو اپنا ایک مستقل فنی کاروبار کرتا ہے اور ہر شخص اس کام کے سلسلے میں اس سے خدمت لیتا ہے۔ مثلاً سینے، کپڑا بننے وغیرہ کا کام لینا اجیر خاص سے مراد وہ اجیر ہے جو اپنی خدمات کسی ایک شخص کے لیے بعوض وقف کر دے، مثلاً گھر کا ملازم، بیرہ اور باورچی وغیرہ۔ اور اجیر خاص پر ضمان نہ آنے کی دلیل یہ دیتے ہیں۔

لأن یدہ ید أمین والعین فی یدہ، لہ حکم الأمانة إلا إذا تعمد الفساد. فأنه یضمن للتعدی..

ترجمہ: اس لیے کہ مستاجر کی شے اجیر کے ہاتھ میں امانت ہے اس لیے اس کا حکم امانت ہی کا رہے گا مگر یہ کہ جان بوجھ کر چیز کو برباد یا خراب کرے تو اس صورت میں ضمان آئے گا۔

العامل إذا نصح.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین کمائی مزدور کی کمائی ہے بشرطیکہ وہ خیر خواہی اور بھلائی کے ساتھ کام والے کا کام انجام دے۔

ان تمام احکامِ عدل و انصاف کے بعد وہ مستاجروں اور اجیروں دونوں کے لیے ایک عام قانون بیان کر کے میزان عدل کو مساوی رکھنے کی سعی کرتا ہے، شرعۃ الاسلام میں ہے:

"اسلام کی سنت یہ ہے کہ لوگوں (اجیر و مستاجر، بائع و مشتری وغیرہ) کو آپس میں مہربانی رحم اور باہم یک و دیگر خیر خواہی کے ساتھ معاملات کرنے چاہئیں اور وہ یہ کہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، یعنی معاملات میں صرف اپنے فائدہ ہی کا پہلو پیش نظر یہ نہ ہو بلکہ فریقِ ثانی کا بھی خیال رہے۔"[2]

یہی وجہ ہے کہ فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ[3] نے اجارہ کو تعاون اور معاونت میں شمار کیا ہے، یعنی ایسے کل معاملات اور کاروبار جو دو فریق کے باہم دگر مدد و اعانت سے نفع بخش ثابت ہوتے ہیں "بابِ تعاون" ہی میں داخل ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"معاونت کی چند اقسام ہیں اور اجارہ بعض لحاظ سے مبادلہ اور بعض لحاظ سے معاونت ہے۔"[4]

لیکن اگر ان حقوق میں تصادم پیش آئے اور ایک دوسرے کے حقوق پر دستبرد کرنے لگے تو اس قسم کے تمام معاملات میں یعنی تعیین مدتِ عمل، تعیین مقدار

(۱) الھیثمی: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، ۹۸/۸

(۲) حنفی، سید علی زادہ: شرح شرعۃ الاسلام، فصل فی طلب الحلال، ص ۲۳۲

(۳) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۴) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ: حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق

اجرت آسائش و راحت کے انسانی حقوق وغیرہ میں ”حکومت“ کو دخل اندازی کرنی چاہیے، اور خود عدل و انصاف کے ساتھ ان معاملات کو اس طرح طے کر دینا چاہیے کہ جانبین کے واجبی حقوق میں ظلم کا شائبہ تک باقی نہ رہے، چنانچہ نرخ کی گرانی کی بحث میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ضررِ عام ہو اور جماعتی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس وقت حکومت کو مداخلت کا حق ہے۔

ولا يسعر حاكم إلا إذا تعدّى الأرباب عن القيمة تعديا فاحشا فيسعر بمشورة أهل الراى.[1]

ترجمہ: حاکم نرخ میں اس وقت تک مداخلت نہ کرے جب تک ”اربابِ نرخ“ قیمت کی گرانی میں زیادتی پر نہ اتر آئیں اس وقت امام کو اہل الرائے کے مشورہ سے نرخ مقرر کر دینا چاہیے۔

یعنی امام کو متعلقہ امر کے ماہرین کی مجلس شوری یا سب کمیٹی مقرر کر کے اس کے مشورہ سے اقدام کرنا چاہیے۔

مباحث کا خلاصہ

الحاصل اسلام اگرچہ اپنے اقتصادی نظام میں صنعت و حرفت اور تجارت پر بہت زور دیتا ہے اور جگہ جگہ ایماندار تاجروں کو خدا کی رضا اور جنت کی بشارت سناتا اور اس کو خوش عیشی اور رفاہت کی راہ بتاتا ہے، نیز انبیاء کے پیشے اور کسبِ معاش کے واقعات سنا کر صنعت و حرفت کی ترغیب دیتا اور گھریلو اور دستی کاریگری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے عوام کی بے روزگاری دور ہوتی ہے اور عام متوسط خوش حالی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ بایں ہمہ ”ملوں اور کارخانوں“ کی جدید ایجادات کے سلسلہ میں بھی اس کا قانونِ اقتصاد جماعتی فلاح و بہبود کے قوانین سے عاجز و درماندہ نہیں ہے اسی لیے وہ حکم دیتا ہے کہ اس کے نظام میں ان ملوں اور

---

(۱) حصکفی رحمه الله تعالی، محمد علاؤالدین: درمختار مع (فتاوی) الشامی، مطبوعه بمبئی (هند) ۱۳۰۹ھ، ج ۵، باب الحظر والإباحة

کارخانوں کا استعمال صحیح طور پر تو جب ہی ہو سکتا ہے کہ حکومت رفاہِ عام اور مفادِ عامہ کی خاطر ان سے کام لے اور اربابِ دولت کو ایسے مواقع مہیانہ ہونے دے کہ وہ غریبوں کو اپنی مشینوں کے پرزوں ہی کی طرح سمجھ کر اپنی اغراض کا آلہ کار بنالیں۔ اور اس طرح عام فقر وفاقہ کے ساتھ مخصوص افراد یا گروہ میں دولت ''کنز'' بن کر جمع ہو جائے۔ اور اگر پبلک میں سے دولت مند حضرات ملک کی دولت میں اضافہ کرنے اور اپنی رفاہیت میں جائز بہتات پیدا کرنے کے لیے حکومت سے اجازت کے خواہ ہوں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ مندرجہ بالا شرائط و حدود کے ساتھ ان کو اجازت دے تاکہ افراط وتفریط سے الگ اس بارہ میں ایسا توازن قائم ہو جائے کہ ارباب سرمایہ مذموم سرمایہ داری تک نہ پہنچ سکیں اور اجیر و مزدور حیوانوں اور غلاموں کی طرح نہیں بلکہ باہمی اشتراک و تعاون کے ساتھ اپنی معاشی زندگی کو باحسن وجہ حاصل کر سکیں، کیونکہ یہ اگر حاصل ہو جائے تو پھر مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کے امکانات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ رہے مزدوروں اور غریبوں کے حفظان صحت، خوراک و لباس کی آسائش، بچوں کی تعلیم وغیرہ معاملات، سو ان کے لیے اسلام کا ایک ہی فیصلہ ہے کہ حکومت (خلافت) بغیر امتیاز امیر و غریب پبلک کی تمام قسم کی جائز اور واجب ضروریات کی کفیل اور ذمہ دار ہے۔

انفرادی عیش و تنعُّم

(Individual's Extravagent & Ostantat Consumption)

یوں تو ہر شخص اپنے روپے پیسے اور ذرائع آمدنی کو انفرادی ملکیت کی بنا پر اپنی راحت اور اپنے عیش پر صرف کرنے میں مختار و مجاز (Authorized) ہے لیکن اگر یہی اختیار و اجازت حدِ اعتدال سے نکل کر اس غلط راہ پر پڑ جائے کہ عورتوں میں زیور کی کثرت، زیب وزینت کی گراں قیمت اشیاء کی خریداری، فیشن کی دلدادگی اور مردوں میں اسراف و نمائشی اخراجات اور ضروریات انسانی سے الگ خارج از اعتدال تفریحی

اخرجات کا ایسا ہمہ گیر شوق وذوق پیدا ہو جائے کہ قوم کی قوم اس میں مبتلا نظر آنے لگے اور یہاں تک نوبت پہنچ جائے کہ بازاروں میں عام حاجات کی اشیاء کے مقابلہ میں بناوٹی حسن اور زیبائش کی اشیاء کا لین دین بڑھ جائے، اہل صنعت و حرفت کی نظر ان ہی امور کی دیدہ ریزی اور لطافت آفرینی میں محو اور مصروف ہو جائے، تجار کی تجارت کا فروغ صرف اسی پر رہ جائے، مردوں کی محنت کا ثمرہ دولت اسی پر صرف ہونے لگے اور عام ضروریات کی تجارت، خام اجناس کی زراعت اور رفاہِ عام کے سلسلہ کی صنعت و رفت کساد بازاری کی نظر ہونے لگے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس قوم کا اقتصادی جہاز گرداب ہلاکت میں گھر چکا ہے اور آج نہیں تو کل اس کے لیے محنت کی جگہ تختہ، اور زربفت و کم خواب کی جگہ ٹاٹ و پلاس بھی میسر نہ آئے گا۔

پس ملک کی ایسی خستہ حالت کو روکنا اور اس کے انفرادی اختیارات کی اس آزادی پر اخلاقی اور آئینی پابندیاں عائد کرنا اور اس ملک کی اقتصادی زندگی کو تباہی و بربادی سے بچانا حکومت کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اسی لیے اسلام نے اگرچہ ''ذرائع آمدنی'' اور ''آمدنی'' کی بہت سی شقوں میں انفرادی حقِ ملکیت کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ منشاء اور یہ خواہش ہے کہ اختیار کی یہ باگ اس قدر ڈھیلی نہ رہنے دی جائے جس کی بدولت عام انسانی دنیا اقتصادی بد حالی میں گرفتار ہو جائے، اور صرف چند سو یا چند ہزار یا چند لاکھ انسانوں کی سرمایہ دارانہ عیش پسندی کی مرضیات میں ڈوب کر خدا کی عام مخلوق ہلاکت و تباہی کے گھاٹ اتر جائے۔ اسلام کے مایۂ ناز فلسفی شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [1] نے اس مسئلہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمدن و معیشت کے فساد کی راہوں میں یہ بہت بڑی راہِ فساد ہے، لکھتے ہیں:

> ''اسی طرح تمدن کی تباہی و ہلاکت کے امور میں سے یہ ہے کہ امت کے مالدار زیورات۔ لباس، مکانات، خورد نوش اور عورتوں کے حسن و

---

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

زیبائش وغیرہ کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں مبتلا ہو جائیں اور حاجات و ضروریات سے زیادہ عیش و تنعُّم کی زندگی میں مشغول و منہمک رہنے لگیں۔"(۱)

اور آخر کار نتیجہ یہ نکلے کہ:

"لوگوں پر اس کی وجہ سے سخت مصیبت آن پڑے، مثلاً لوگوں کے لیے جو زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کے مختلف کاموں کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور آخر اس ایک شہر یا ملک کا یہ ضرر آہستہ آہستہ ایک عضو اجتماعی سے دوسرے عضو میں سرایت کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ تمام مخلوق ایک عام تباہی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔"(۲)

لہذا اسلام نے ایسے تمام ذرائع کا سد باب بھی ضروری سمجھا ہے اور اس کی اصلاح کے لیے بھی مختلف قدم اٹھائے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر صفحات گذشتہ میں ہو چکا اور بعض قانونی حیثیات کا ذکر شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ان سطور میں کیا ہے:

"اور یہ مرض عجمی تمدن پر چھایا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اس مرض کا اس طرح علاج کریں کہ اس فاسد تمدن کا مادہ ہی ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے۔ اس لیے آپ نے دیکھا کہ اس تمدن کی زیادہ تر بنیاد گانے والی عورتوں کے شوق، مردوں کو طرح طرح کے ریشمی اور حریر کے لباس کی نزاکت کے ذوق اور سونے کے زیورات کی چمک دمک کے شوق میں سونے کا سونے کے ساتھ کمی زیادتی کے لین دین پر قائم ہے لہذا آپ نے ان کی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی ممانعت کر دی اور حکم دے دیا کہ اس مصنوعی اور تباہ

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ البالغہ، ج ۲، باب من ابتغاء الرزق

(۲) حوالہ بالا

کن عیش پسندی کو ختم ہونا چاہیے اور سادہ زندگی کو اختیار کرنا چاہیے۔"(۱)

انفرادی ملکیت کو بے قید ہونے سے روکنے کے اقدامات

زکوٰۃ:

تجارتی بدعنوانیوں کے انسداد کی بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں "اکتناز" اور "احتکار" دونوں حرام ہیں، یعنی چونکہ یہی دو راہیں سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں کو نشو و نما کرتی ہیں اس لیے ان کا استیصال ضروری ہے۔ احتکار کی بحث تو بعض گوشوں کے لحاظ سے صفحاتِ گذشتہ میں آچکی، اب بعض وہ احکام قابل ذکر ہیں جو انفرادی ملکیت کو بے قید ہونے سے روکتے اور اکتناز سے محفوظ رکھتے ہیں۔

دولت کے جمع اور ذخیرہ کی وہ تمام صورتیں جن میں دولت کی تقسیم سے انکار کیا گیا ہو، اکتناز میں داخل ہیں، لہذا اسلام کے معاشی نظام کا اعتدال اس کے مقابلہ میں یہ حکم دیتا ہے کہ دولت جمع اور ذخیرہ کے لیے نہیں ہے بلکہ تقسیم اور گشت کے لیے ہے تاکہ افراد کے درمیان دولت کا توازن صحیح رہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم قانون "زکوٰۃ کا قانون" ہے اور اس لیے اس کی ادا صرف رضا کارانہ اصول پر نہیں بلکہ قانون فرض کی شکل پر قائم ہے اور جو لوگ اس فرض کی ادا میں کوتاہی کرتے اور اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے قانونی سزا کے علاوہ آخرت کے سخت عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي

---

(۱) حوالہ بالا

سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ (۱)

ترجمہ: اور جو لوگ خزانہ بناتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی اس کی زکوٰۃ اور دیگر حقوق واجبہ مالیہ ادا نہیں کرتے) تو آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔

﴿يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾ (۲)

ترجمہ: جس دن کہ آگ دھکائیں گے اس مال پر دوزخ کی، پھر داغیں گے اس مال سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پشت (اور کہا جائے گا): اب چکھو مزہ اس مال کے خزانہ کرنے کا۔

علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ اور حقوق واجبہ ادا نہ کرنے کی وعید میں نازل ہوئی ہے اور اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ "ایتاء الزکوٰۃ" (۳) کا ذکر تو قرآن عزیز میں بہت زیادہ ہے۔

---

(۱) سورۃ التوبۃ (۹): ۳٤

(۲) سورۃ التوبۃ (۹): ۳۵

(۳) انسان جب خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اس کا قلب اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہے اس لیے ایمان میں تازگی، روح میں پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی قربت کے لیے زکوٰۃ کو فرض کیا گیا جو درحقیقت ایمان باللہ کا عنوان اور عطاءِ نعمت شکر الٰہی کا مظہر ہے، نماز اگر بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت، ایک شخص کی بدنی عبادت کا مظاہرہ اگر خلوص و صداقت پر مبنی ہے تو مالی عبادت اس کے لیے صحیح کسوٹی ہے تاکہ معاملہ اس طرح کا ثابت نہ ہو ؎

گر زر طلبی سخن دریں است
گر جان طلبی مضائقہ نیست

(اگر زر — روپیہ پیسہ — مانگو گے تو اس میں کچھ کلام ہے (سوچنا پڑے گا کہ مال ہے بڑا پیارا ہے، مشکل سے کمایا ہے) البتہ اگر (اس کے مقابلہ میں) جان بھی مانگو تو کوئی پرواہ نہیں (حاضر ہے)۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں، چونکہ یہ دولت کو نجس اور ناپاک سرمایہ داری سے بچاتی اور باز رکھتی ہے اور انسان کے دل و دماغ اور ذہنیت کو غرورِ مال اور قارونیت سے پاک کرتی ہے اس مناسبت سے اس کا نام "زکوٰۃ" ہے، حقیقتِ زکوٰۃ دو اصول پر مبنی ہے۔

❶ مذموم سرمایہ داری سے روکنا اور غرباء کی حاجات کو پورا کرنا۔

❷ اقتصادی بہتری کے لیے جد و جہد کا جذبہ پیدا کرنا۔

پہلا اصول تو واضح ہے اس لیے کہ اسلام کی نظر میں ایسا شخص بھی سرمایہ دار ہے، جس کے پاس صرف ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونا[1]

---

(۱) سونا اور چاندی کا نصاب جدید اوزان میں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث مبارکہ سونے کا نصاب ۲۰ مثقال —— جسے پاک و ہند کے علماء اسلام نے ساڑھے سات تولے کے برابر قرار دیا —— اور چاندی کا نصاب ۲۰۰ درہم —— جسے ان علماء اسلام نے ½ ۵۲ تولے چاندی کے برابر قرار دیا —— مقرر فرمایا، البتہ جدید عالمی نظامِ اوزان (New International System of Weight) میں درہم (جو چاندی کا گول سکہ تھا کا وزن ۲ء۹۷۵ گرام کے مساوی ہوتا ہے، اور دینار جو سونے کا گول سکہ ہوتا تھا اور جسے مثقال (Mithqal) بھی کہا جاتا ہے کا وزن) ۴ء۲۵ گرام کے مساوی ہے، اس طرح درہم اور دینار یا مثقال کی وزن میں نسبت ہم اس طرح نکالیں گے۔

$\frac{۲٫۹۷۵}{۴٫۲۵} = \frac{۷}{۱۰}$ یعنی وزن میں ۱۰ درہم ۷ دینار (مثقال) کے برابر تھے۔ البتہ قیمت کے اعتبار سے ان میں بہت فرق تھا، کیونکہ دینار سونے کا سکہ تھا اور درہم چاندی کا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید، خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد مبارک اور بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار میں بھی ایک دینار قیمت میں سات درہم کے برابر تھا، گویا کہ قیمت میں نسبت ۷:۱۰ (اوپر بیان کردہ نسبت وزن) سے گھٹ کر ۱:۷ تھی۔ اب سونے کا نصاب جدید اوزان میں نکالنا آسان ہو گیا، یعنی سونے کے نصاب کو نصاب کے جدید وزن کی ایک اکائی سے ضرب دے دیں = ۲۰ (مثقال) × ۴ء۲۵ (سونے کے ایک مثقال کا وزن) = ۸۵ گرام

اب چاندی کا جدید اوزان میں نصاب نکال لیں بطریقہ چاندی کے نصاب کو اس کے نصاب کے ایک یونٹ یا ایک اکائی کو جدید نظام میں گرام کے برابر ہے ضرب دے دیں، یعنی:

۲۰۰ × ۲ء۹۷۵ = ۵۹۵ گرام

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ:

۸۵ گرام سونا = ۵۹۵ گرام چاندی

اب دونوں اوزان کی آپس میں نسبت نکال لیں: $\frac{۵۹۵}{۸۵}$ = ۷ یا ۱:۷

یوں کہہ لیجئے کہ قیمت میں ۱ گرام سونا = ۷ گرام چاندی، یعنی دونوں کی قیمت میں آپس میں نسبت ہوئی ۱:۷ اب اوپر ان دونوں سکوں (یعنی درہم اور دینار) کی بیان کردہ نسبت یعنی ۷ مثقال سونا = ۱۰ درہم چاندی یا ۷:۱۰ یا $\frac{۷}{۱۰}$ کو ذہن میں لائیں۔ جب وزن میں درہم اور دینار (یا مثقال) کی نسبت $\frac{۷}{۱۰}$ ہے تو ان دونوں کی قیمت میں نسبت حاصل کی جا سکتی ہے دونوں کی وزن کی نسبت ($\frac{۷}{۱۰}$) × دونوں کی قیمت کی نسبت یعنی = $\frac{۷}{۱۰} \times \frac{۱}{۷} = \frac{۱}{۱۰}$

یا یوں کہئے قیمت میں ۱ مثقال / دینار سونا = ۱۰ دراہم چاندی ہو گا۔

اب ایک بار پھر پلٹئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ نصاب سونا و چاندی کی طرف کہ جب سونا کا وزن ۲۰ مثقال (دینار) ہو یا چاندی ۲۰۰ دراہم ہو اور کسی کے پاس سال بھر رہیں تو ان پر زکاۃ ہو گی۔

اب اوپر ریاضی کے حساب سے سونا اور چاندی کی قیمت میں نسبت ۱:۱۰ کو ذہن میں رکھیں پھر ۲۰ مثقال سونا = ۲۰۰ دراہم چاندی حاصل کریں۔

اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی خبر پر ایمان پختہ کر لیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

(ان اوزان کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر محمد ابراہیم البنا، استاد جامعہ ازہر کی تحقیق سے بھی مدد لی گئی ہے۔ دیکھئے: ابو یوسف كتاب الخراج، مطبوعه دار الاصلاح، قاهرة، ۱۹۸۱ء، ص ٦٣، ٦٤)

یہاں مکرر ایک حقیقت کی طرف محترم قاری کی توجہ دلانا ضروری ہے کہ دینار (مثقال) اور درہم اپنی ذات میں قیمت بھی تھے اور وزن بھی تھے یعنی ۲۰ دینار (مثاقیل) اگر سونے کا نصاب تھا تو زکاۃ میں بھی دینار ہی دیئے جاتے تھے کیونکہ دینار سونے کا ہوتا تھا جب اس کی تعداد (یا وزن) ۲۰ (بیس) دینار ہو جاتا تو ان پر زکاۃ فرض ہو جاتی اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی دینار (یعنی سونا) میں ہی جاتی تھی، گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے اسلامی ادوار میں دینار وزن بھی تھا، قیمت (سکہ) بھی تھا اور زکاۃ کا نصاب بھی بنتا تھا۔

یہی صورت حال درہم (چاندی کا سکہ) کا تھا، وہ سکہ بھی تھا، وزن بھی اور قیمت بھی اور ۲۰۰ پر پہنچ کر نصاب زکاۃ بھی بن جاتا تھا۔

نصاب زکاۃ کے وزن میں سونا اور چاندی کی نسبت ۷:۱۰ تھی، یعنی ۷ دینار (مثقال) ۱۰ دراہم چاندی کے برابر تھے اور نصاب زکوٰۃ کی قیمت میں (چونکہ دینار سونے کا تھا اور درہم چاندی کا لہٰذا گھٹ کر) یہ نسبت ۱ اور ۱۰ کی ہو جاتی یعنی قیمت سے ۱ دینار = ۱۰ درہم تھا۔

پاک و ہند، بنگلہ دیش وغیرہ میں جدید نظام میں نصاب: ان مذکورہ ممالک میں ماشہ، رتی اور تولہ کا نظام اوزان چلتا تھا، مسلمان فقہاء کرام اور علماء اسلام نے یہاں سونے کا نصاب (۲۰ مثقال یا دینار کے مساوی) ۷½ (ساڑھے سات تولہ سونا) اور چاندی کا نصاب (۲۰۰ دراہم کے مساوی) ۵۲½ (ساڑھے باون تولہ چاندی) مقرر کیا۔

اب مروجہ اعشاری نظام میں ۱ تولہ ۱۱٫۶۶۴ گرام کے مساوی ہے۔ لہٰذا سونا اور چاندی کا نصاب اس طرح ہو گا:

سونے کا نصاب وزن میں: ۷½ × ۱۱٫۶۶۴ = $\frac{۱۵}{۲}$ × ۱۱٫۶۶۴ = ۸۷٫۴۸۰ گرام

چاندی کا نصاب: ۵۲½ × ۱۱٫۶۶۴ = $\frac{۱۰۵}{۲}$ × ۱۱٫۶۶۴ = ۶۱۲٫۳۶۰ گرام

موجود ہو یا ضروریاتِ زندگی سے فاضل ایسی اشیاء موجود ہوں جن کی قیمت اسی نصاب تک پہنچ جاتی ہو، چنانچہ ان اشیاء پر اگر ایک سال گزر جائے تو مالکِ اشیاء سے اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ اجتماعی حقوق کی تکمیل کے لیے چالیسواں حصہ "زکوٰۃ" کے نام سے سرکاری بیت المال میں داخل کرے۔

اسلام نے ادائے زکوٰۃ کو "فرض" قرار دے کر درحقیقت صاحبِ ثروت اور نادار انسانوں کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کر دیا ہے کہ اگر مسلمان بحیثیتِ جماعت اس فرض کو پورا کریں تو ایک جانب مذموم اور مطلق العنان سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے اور دوسری جانب فاقہ مست اور خانماں برباد فقر اور مساکین کا وجود باقی نہ رہے۔ اور دنیائے انسانی کی تمام زندگی میں ایسا اعتدال پیدا ہو جائے اور موجودہ طبقاتی جنگ اور معاشی رقابت کے نام سے گروہ بندی مفقود ہو کر رہ جائے جیسا کہ خلافتِ راشدہ خصوصاً دور صدیقی و فاروقی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روشن تاریخ شاہدِ عدل ہے۔

یمن کے باشندے جب نور اسلام کی روشنی سے منور ہو کر مشرف باسلام ہو گئے، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ ھ میں حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)[۱] کو ان پر والی اور معلم بنا کر بھیجا اور ان کو وصیت فرماتے ہوئے ارشاد

اب ان دونوں کے نصاب کی نسبت = ۶۱۲،۳۶۰ / ۸۷،۴۸۰ = ۷ یا ۱:۷ (یعنی ۱ گرام سونا = ۷ گرام چاندی
اب چونکہ دینار (مثقال) اور درہم کی قیمتیں مقرر تھیں کیونکہ وہ تو اپنی ذات میں قیمت تھے، گرام سونا اور گرام چاندی کی قیمتیں موجودہ قیمتوں کے نظام میں روزانہ بدلتی ہیں اور اگرچہ گرام سونا یا گرام چاندی اپنی ذات میں اصلی قیمتیں ہیں، مگر بطور قیمت ان کا چلن نہیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں مقرر کردہ سونا اور چاندی کی قیمتوں کی نسبت کو لے لیں جو ۷/۱ یا ۷ (دینار) : ۱۰ (درہم) تھی، لہٰذا موجودہ اعشاری نظام کے حساب سے بھی نصاب (یعنی ۲۰ دینار، مثقال سونا اور ۲۰۰ درہم چاندی) حاصل کیا جا سکتا ہے۔
حدیث مبارکہ میں سونا اور چاندی کی نسبت ۷:۱۰ یا ۷/۱۰ کو موجودہ اعشاری نظام میں نسبت ۷/۱ سے تقسیم کر لیں = ۷/۱۰ ÷ ۷/۱ = ۷/۱۰ × ۱/۷ = ۱/۱۰ یا ۱:۱۰ یعنی سونا ۱ (دینار یا گرام یا تولہ) = ۱۰ (درہم یا گرام یا تولہ) چاندی اب حاصل کر لیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ نصاب ۲۰ مثقال یا دینار سونا اور ۲۰۰ درہم چاندی۔ اوپر ۱:۱۰ کی نسبت ذہن میں رکھیں اور ۲۰ مثقال سونا = ۲۰۰ درہم چاندی۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۱) معاذ بن جبل، حضرت معاذ بن جبل (بن عمرو بن اوس بن عائذ بن عدی بن کعب بن عمرو بن ادی بن سعد اخی =

فرمایا:

”کہ تمہارا سابقہ اہلِ کتاب (یہود) سے پڑے گا، تم اول ان کو شہادتین ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ کی تلقین کرنا اور جب وہ قبول کرلیں تو پانچ وقت کی نماز کی فرضیت کی تلقین کرنا اور جب وہ اس کو بھی تسلیم کرلیں تب ان سے کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال پر ”زکوٰۃ“ بھی فرض کی ہے (زکوٰۃ کیوں فرض ہے اور اس کی کیا حکمت و مصلحت ہے) تو ان کو بتلانا کہ اس لیے کہ:

تؤخذ من أغنيائهم فترد إلى فقرائهم.[1]

ترجمہ: ان کے اہل ثروت سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر تقسیم کر دی جائے گی۔

سلمۃ بن سعد) انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ والدہ محترمہ حضرت ہند بنت سہل قبیلہ جہینہ سے تھیں۔ آپ کے ایک بھائی حضرت عبد اللہ بن الجد بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ بدر میں شرکت کی سعادت پائی۔ دو بیٹے تھے ایک کا نام عبد الرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا اسی لیے آپ کنیت ابو عبد الرحمٰن رکھتے تھے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا عامل (گورنر) اور معلم بنا کر بھیجا اور پاپیادہ چل کر مدینہ منورہ کے باہر چھوڑ کر آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال تک آپ یمن میں ہی رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں آپ شام، حمص میں گورنر، معلم اور مشیر رہے۔ آپ نے ۱۸ھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں عمواس کی وبا (جس سے اسلام کی بہت سی اعلیٰ و ارفع نشانیاں چھپ گئیں) میں تقریباً تمام اہل خانہ کے ساتھ ۳۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ نہایت حسین و جمیل، باصلاحیت اور کریم النفس انسان تھے اس لیے اکثر مقروض رہتے تھے، ایک بار گھر کا سارا اثاثہ نیلام کر کے قرضہ اتارا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أعلم أمتي بالحلال والحرام معاذ بن جبل.

ترجمہ: میری امت میں حلال و حرام کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ (برائے تفصیل دیکھیں: الإصابة، نمبر ۸۰۳۳۹، اسد الغابة: ۳۷۶/۴، طبقات ابن سعد: ۴۳۷/۳، ۴۴۳)

(۱) بخاری ج ۱ کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکاۃ

یہ پُر از حکمت جملہ مبارک دراصل ''زکوٰۃ'' کی حقیقت کا ترجمان ہے اور جانِ حکمت بن کر اعلان کرتا ہے کہ صاحبِ ثروت و دولت کو ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ دولت تنہا اس کی اپنی ملکیت ہے اس لیے یہ خدا کا فضل ہے جس کے لیے اس کو منتخب کیا گیا لہٰذا اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اس حقیقتِ حال کو کبھی فراموش نہ کرے ''جو جس قدر کماتا ہے اسی قدر اس پر اجتماعی حقوق کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔''

سرمایہ دار کی نفسیات قارون کے حوالہ سے:

اور جو اس حقیقت کا منکر ہو کر غرور اور تکبر سے یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کی اپنی محنت کی کمائی عطاءِ الٰہی نہیں بلکہ اس کی عقل و محنت کا ثمرہ ہے تو وہ خدائے برتر کی دی ہوئی نعمت کا کفران کرتا ہے اور اس طرح تاریخِ ماضی سے آنکھیں بند کر کے گویا خدا کے عذاب و عتاب کو چیلنج کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون کا واقعہ تاریخ کی نگاہ میں کل کا واقعہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی قوم نے جب قارون جیسے سرمایہ دار (Capitalist) کو اس کا یہی فرضِ زکوٰۃ یاد دلایا تو اس نے نہایت غرور و تمکنت سے اس کے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

﴿إِنَّ قَٰرُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَءَاتَيْنَٰهُ مِنَ ٱلْكُنُوزِ مَآ إِنَّ مَفَاتِحَهُۥ لَتَنُوٓأُ بِٱلْعُصْبَةِ أُو۟لِى ٱلْقُوَّةِ﴾ (۱)

ترجمہ: قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پس وہ ان کے مقابلہ میں اترانے اور شرارت کرنے لگا۔ بات یہ تھی کہ ہم نے اس کو دولت کے اتنے خزانے بخشے تھے کہ اس کے نقل و حمل سے طاقتور مزدور بھی تھک جاتے تھے (یا اس کی کنجیوں کے نقل و حمل سے بھی مزدور تھک جاتے

---

(۱) سورۃ القصص (۲۸):۷۶

تھے۔)

قارون کی قوم نے خدا کی نعمتیں یاد دلاتے اور فساد و تکبر سے بچنے کی نصیحت کرتے ہوئے قارون سے جب یہ کہا:

﴿إِذْ قَالَ لَهُۥ قَوْمُهُۥ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَٱبْتَغِ فِيمَآ ءَاتَىٰكَ ٱللَّهُ ٱلدَّارَ ٱلْـَٔاخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ ٱلدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَآ أَحْسَنَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ ٱلْفَسَادَ فِى ٱلْأَرْضِ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾﴾ (۱)

ترجمہ: جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ شیخی نہ کر، بلاشبہ: اللہ تعالیٰ شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے تجھ کو اس کے ذریعہ سے آخرت کا سامان کر اور اس کو نہ بھول کہ دنیا میں تجھے کیا کچھ ملا ہوا ہے اور لوگوں کے ساتھ اسی طرح بھلائی کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر بھلائی کے دروازے کھول دیئے ہیں اور زمین میں فساد کا خواہش مند نہ بن اللہ تعالیٰ مفسدوں کو ناپسند کرتا ہے۔

تو قارون نے جواب دیا:

﴿قَالَ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ ﴾ (۲)

ترجمہ: یہ مال تو مجھ کو میرے اس ہنر کی بدولت ملا ہے جس کا میں واقف کار ہوں (یعنی میری سرمایہ داری میری قابلیت و ہنر مندی کا نتیجہ ہے) نہ کہ خدا کا عطیہ، اس صورت میں میں دوسروں کو اس میں شریک نہیں کر سکتا۔

قارون کی قوم اور قارون کے سوال و جواب کے بعد اللہ تعالیٰ نے غافل، سرکش

---

(۱) سورۃ القصص (۲۸): ۷۶، ۷۷

(۲) سورۃ القصص (۲۸): ۷۸

اور مغرور انسان کو اس کے زعم باطل پر زجر و توبیخ کرتے ہوئے حکیمانہ انداز میں کتاب کائنات کے ان صفحات کی جانب پرزور توجہ دلائی ہے جن پر اقوام ماضی کے مغرور سرکش اور صاحبِ ثروت و قوت، اقوام و افراد کے نتائج بد منقوش و مکتوب ہیں، اور جو بلاشبہ صاحبِ بصیرت کے لیے صد ہزار سرمایۂ عبرت و موعظت ہیں، چنانچہ وہ اسلوبِ حکیم اعجازِ بلاغت و فصاحت اور علی الاطلاق قاہرانہ قدرت کے ساتھ کہتا ہے:

﴿أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا﴾ (۱)

ترجمہ: کیا اس کے علم میں یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ ایسی کتنی ہی جماعتیں تباہ کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت والی اور سرمایہ دار تھیں۔

اور جب اس نے اس عبرت اور بصیرت پر بھی کان نہ دھرا اور صفحاتِ عالم کے ان ابھرے ہوئے نقوش ماضی سے بھی سبق حاصل نہ کیا تو آخر کار سنت اللہ کے ہمہ گیر قانون گرفت نے اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو اگلوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔

﴿فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ﴿٨١﴾﴾ (۲)

ترجمہ: پس ہم نے اس کو اور اس کے خانۂ دولت کو تہ زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی جماعت اس کی مدد کے لیے سامنے نہ آئی جو اللہ کے مقابلہ میں ہوتی اور نہ وہ خود مدد لا سکا یعنی خدا کا انقلابی ہاتھ جب ایسے سرمایہ

(۱) سورۃ القصص (۲۸): ۷۸

(۲) سورۃ القصص (۲۸): ۸۱

داروں کو ہلاک کرتا ہے تو پھر کوئی نصرت و مدد ان کو بچا نہیں سکتی۔

زکاۃ و صدقات کی ادائیگی کا اہم فرض:

اسی طرح ادائے صدقات و زکوٰۃ کے اہم "فرض" اور نظامِ معاشی کے اس بنیادی اصول سے غفلت برتنے والوں کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے سورہ برأت میں سخت وعید کا اعلان سنایا گیا۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلْأَحْبَارِ وَٱلرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۗ وَٱلَّذِينَ يَكْنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾﴾ [1]

ترجمہ: اے ایمان والو! اہل کتاب کے بہت سے عالم اور درویش لوگوں کے مال ناحق کھاتے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ بناتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو خوشخبری سنا دے دردناک عذاب کی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں کو بہت شاق گزرا اور انہوں نے خیال کیا کہ شاید ضرورت کے لیے معمولی پس انداز کرنا بھی اس کے تحت میں آتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس کام کو میں انجام دوں گا اور اس مشکل کو میں حل کروں گا، چنانچہ انہوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صرف اس لیے فرض کیا ہے کہ تمہارے باقی مال کو زکوٰۃ کے ذریعہ پاک کر دے یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ اجتماعی حقوق ادا کرنے کے بعد اس کے پاس اپنی ضرورت کے لیے جو پس انداز ہو وہ بھی "کنز" میں داخل ہے، حضرت عمر رضی اللہ

---

(۱) سورۃ التوبۃ (۹): ۳۴

تعالیٰ عنہ نے جب زبان مبارک سے یہ سنا تو بہت مسرور ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔"[۱]

یہاں ادائے فرض کا نام "انفاق فی سبیل اللہ" رکھا اور اس سے غفلت برتنے والے دولت مند کی دولت کو "کنز" بتلا کر متنبہ فرمایا کہ یہی وہ سرمایہ داری ہے جو اسلام میں قابلِ لعنت ہے، اور خدا کی عام مخلوق میں اقتصادی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ آخر انسان ثروت و دولت کے نشہ میں اس درجہ کیوں غافل ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے کہ اس نے اپنی عقل و محنت سے ہی اگر دولت کمائی ہے تب بھی انسانوں کے باہمی تعاون و مواسات سے ہی کمائی ہے، ورنہ تو بغیر دوسرے انسانوں کے تعاون و اشتراک کے اس کو تجارت یا صنعت و حرفت وغیرہ میں کامیابی ناممکن تھی۔

پس کیا اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ اگر ان ہی انسانوں میں بعض انسان مرض، اعضا کی کمزوری، ضعفِ پیری یا دوسرے نامساعد اسباب کی بنا پر افلاس اور احتیاج تک پہنچ جائیں تو یہ ان کی مدد کرے اور ان کے مال میں ان کا حصہ محض تبرع اور احسان کے طور پر نہ ہو بلکہ فرض کی حیثیت میں ہو۔ زکوٰۃ مسلمانوں کو اقتصادی جدوجہد میں فلاح و بہبود کی راہ دکھلاتی ہے۔ اس اصول کی تشریح یہ ہے کہ جو کاہلی اور دونِ ہمتی کی بنا پر بیکاری کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور تھوڑی بہت پونجی رکھنے کے باوجود ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے کے خوگر ہیں، یہ اجتماعی ٹیکس ان کے لیے مہمیز کا کام دے اور وہ یہ سوچیں کہ ہمارا یہ مال جس کو قدرت نے نشوونما کی صلاحیت دی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دو چار سال میں ذاتی ضروریات اور "زکوٰۃ" کی نذر ہو کر رہ جائے بمصداق حدیث:

الید العلیا خیر من الید السفلی.[۲]

---

(۱) ابوداؤد: السنن، ج ۱، کتاب الزکوۃ

(۲) صحیح الامام البخاری، کتاب الزکاۃ، باب الاستعفاف عن المسئلۃ بحوالہ ریاض الصالحین، باب القناعۃ...... ذم السوال

=

مصنف رحمہ اللہ نے جس حدیث کا یہ ایک حصہ نقل کیا ہے، وہ حدیث بہت سی مفید معاشی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ جس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے افراد کو محنت، جدوجہد، غیرت مندی اور عزتِ نفس کا درس دیتے ہیں۔ آئیے یہاں پوری حدیث پڑھ لیتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ (وعن حکیم بن حزام رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ) ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الید العلیا خیر من الید السفلی، وابدا بمن تعول وخیر الصدقۃ ما کان ظھر غنی ومن یستعفف یعفہ اللّٰہ، ومن یستغن یغنہ اللّٰہ. (رواہ بخاری و مسلم. یہ الفاظ بخاری رحمہ اللہ کے ہیں، حوالہ اوپر درج ہے)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں) سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

❶ اوپر والا (یعنی دینے والا) ہاتھ نیچے والے (یعنی سوال کر کے لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

❷ اور (جب صدقہ یا خرچ کرنا چاہو تو) اس سے شروع کرو جس کا نان نفقہ تمہارے ذمہ ہو۔

❸ اور بہتر صدیقہ وہ ہے جو تونگری چھوڑ کر دیا جائے (یعنی دینے والا خود قلاش نہ ہو کر رہ جائے) (اور پھر تنگدست ہو کر لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا پھرے یہ ہدایت دنیوی امور میں خرچ کرنے کے لیے ہے)۔

❹ اور جو کوئی (سوال کرنے سے) پاکدامنی اختیار کرے گا، اللہ کریم اسے پاک دامن بنائیں گے (یعنی سوال کرنے سے بچائیں گے)

❺ اور جو کوئی استغناء (مخلوق سے بے پرواہی) اختیار کرنا چاہے گا، اللہ کریم اسے تونگر بنادیں گے۔

دیکھئے یہ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کتنی ہی اہم عملی تعلیمات کا خزینہ ہے۔

❶ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے میں ایک طرف اگر گداگری کی حوصلہ شکنی اور خود کار کمانے کی ترغیب سے وہاں حقیقی سائل کی مدد کرنے والے کی حوصلہ افزائی بھی ہے کہ وہ اپنا ہاتھ اونچا یعنی عطا کرنے والا رکھے گویا بہتر معاشی حالت کو مستقل (Consistant) رکھنے کا درس ہے۔

❷ صدقہ اور صرف (Consumption) کرتے وقت ترجیح (Priorty) ان افراد پر خرچ کو دے جن کی کفالت (Maintenance) اس کے فرائض میں شامل ہے مثلاً اہل خانہ اور ذوی الفروض پھر ذوالارحام پھر ہمسایہ پھر اہل محلہ اور پھر آگے درجہ بدرجہ۔

❸ بہتر صدقہ وہ ہے جو تونگری چھوڑ جائے یعنی صدقہ دینے والا صدقہ دے کر بعد میں خود خوش حال رہے۔ محتاج نہ بن جائے کہ خود سائل بن کر ننگ انسانیت ہو جائے بلکہ اپنے پاس اتنا رکھے کہ خود بھی محتاج بن کر دوسروں پر بوجھ نہ بن جائے بلکہ اوروں کا بوجھ بانٹنے والا بنا رہے۔ یہاں خرچ اور آمدن میں توازن (Balance) کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

البتہ اللہ کریم کی رضا، اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کو زوال سے بچانے کے لیے سارا مال بھی خرچ کرنا پڑے تو یہ نہ صرف قابل ستائش بلکہ دینی مالی فریضہ (Religeo- Financial Obligation) بھی ہے جیسے حضرت

ترجمہ: (دینے والے کا) ہاتھ بلند (لینے والے) کے پست ہاتھ سے بہتر ہے۔

دوسری طرح ہمیں بھی ایک روز غیر کا دست نگر نہ بننا پڑے، یہ سوچ کر وہ آگے بڑھیں اور ترقی مال کے لیے جائز سعی کریں اور اس طرح ہر شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بن جائے، یہاں تک کہ یہ اجتماعی ٹیکس ایک روز "رفاہِ عام" ہی کی ضروریات کے لیے رہ جاتے اور ہر جگہ دینے والے ہاتھ ہی باقی رہ جائیں اور مانگنے والا ہاتھ ایک بھی نہ رہے۔

زکاۃ کے مصالح:

فرضیتِ زکوٰۃ میں اسلام نے کن مصالح کا لحاظ رکھا ہے، فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [1] اس کے متلق ارشاد فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ زکوٰۃ میں دو مصلحتوں کی رعایت پیشِ نظر رکھی گئی ہے ① تہذیب نفس ② مدنی و اجتماعی حاجات کا انسداد، تہذیبِ نفس سے مراد یہ ہے کہ "مال" بخل، خود غرضی، جنسی عداوت، جنسی بداخلاقیاں پیدا کرتا ہے اور ان بداخلاقیوں کے انسداد کا بہترین علاج "انفاق" یعنی حسبۃً للہ صرفِ مال اور سخاوت

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کیا کرتے تھے کیونکہ یہاں تو

ع زوال بندہ مومن کا بے زری میں نہیں

والا معاملہ ہے۔

④،⑤ جو شخص سوال کی ذلت سے دامن بچانا چاہے اللہ کریم اس کے دامن کی لاج رکھیں گے اور جو استغناء (یعنی مخلوق سے بے نیازی) اختیار کرنا چاہے، اللہ کریم اسے غنی کر دیں گے میں پھر محنت کر کے کمانے کی اہمیت اور اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ دراصل اسلام و قار والے (اللہ کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کا باوقار طریقہ زندگی اور طرزِ معاش ہے، یہاں محنت کی عظمت تو ہے بے کار رہ کر محتاج بننے اور دوسروں کے اموال پر پلنے کی امید رکھ کر جینے کی عزت نہیں بلکہ اپنے معاشی وسائل کا موزوں استعمال (Optimum use of Economic Resources) کر کے غنی بننے اور بوقت ضرورت اسلام اور امت مسلمہ کے کام آنے کو مومن کی شان قلندری کہا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

ہے اس سے بخل کا خاتمہ ہو جاتا ہے، خود غرضی مٹ جاتی ہے اور عداوتِ جنسی کی بجائے جنسی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی جنسی محبت ان تمام اخلاق کریمانہ کی اساس و بنیاد ہے جو انسان کو حسنِ معاملات کا خوگر بناتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "انسان" اخلاقِ حسنہ کا پیکر بن جاتا ہے اور اسی کا نام تہذیب نفس ہے اور زکوٰۃ مدنی و اجتماعی حاجات کے انسداد کا بہترین علاج ہے، اس لیے کہ نظامِ مدنی اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس نظام میں مضبوط "مالی نظام" موجود نہ ہو تا کہ اس کے ذریعے سے مدنی نظام کے اعلیٰ ادنیٰ اعمال اور رعایا "پبلک" کے مناسبِ حال حاجات و ضروریات کو پورا کیا جا سکے، نیز فقراء مساکین ضعفاء، یتامیٰ، بیوگان اور اسی قسم کے دیگر حاجت مند دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ذلیل و رسوا ہونے سے محفوظ رہیں اور حکومت ان کی پوری کفالت کر سکے اور یہ تمام مشترک ذمہ داریاں اس طرح پوری ہو سکتی ہیں کہ منجملہ دیگر ذرائع آمدنی کے حکومت کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ اہلِ سرمایہ سے وصولِ زکوٰۃ کی شکل میں حاصل ہو۔"

اموالِ زکاۃ:

یہی وجہ ہے کہ فطرت و عقلِ سلیم کے تقاضہ کے مطابق اسلام نے اس ٹیکس کو چار اصناف میں تقسیم کیا ہے۔

❶ اس مال سے "زکوٰۃ" لی جائے جس میں نمو اور ترقی کی استعداد ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں: (الف) وہ جانور جو چراگاہوں میں اضافۂ نسل کے لیے پالے جا رہے ہوں (ب) زراعت (ج) تجارت۔

❷ ان اشخاص سے لی جائے جو شریعت کی نگاہ میں اہل سرمایہ شمار ہوتے ہیں، جن کو قرآن عزیز میں "اَلَّذِیْنَ یکنزون الذھب والفضة" کہہ کر پکارا گیا ہے (یعنی نقد چاندی یا سونا رکھنے والے)۔

❸ ان اموال میں لی جائے جو لوگوں کو بغیر محنت و تعب کے آسانی سے حاصل ہو گئے ہوں جیسے خزانے کی دریافت یا جواہرات کی دریافت میں وہ اپنا مقررہ حصہ پائیں۔

❹ اہلِ صنعت و حرفت کی صنعت و حرفت پر مقرر کی جائے۔

پھر اسلام نے موسمی حالات، اتفاقی حادثات، عام معاشی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے لیے ایک مدت معین کی،[1] مقدار معین[2] کی، نیز ضروریات و حاجات عامہ کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا۔

اس تفصیل سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام نے اپنے اس فریضہ میں مدنی و اجتماعی اور اقتصادی حالات کی بہتری کا کس قدر خیال رکھا ہے، بلکہ اس کی بنیاد ہی صرف دو امور پر قائم کی ہے انفرادی تہذیبِ نفس اور اجتماعی اقتصادی فلاح و بہبود۔[3]

زکاۃ کا فریضہ اسلام کا امتیازی نشان:

دنیا کے تمام مذاہب، ابناءِ جنس کی خدمت اور حاجت مندوں کی اعانت کی ترغیب و تعلیم دیتے ہیں لیکن یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے محض تلقین و تعلیم ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک سالانہ ٹیکس کا آئین قائم کر دیا جو اس ضرورت کو پورا کرے اور اس کو اس درجہ اہم قرار دیا کہ نماز کے بعد اس کا ہی درجہ رکھا گیا اور قرآنِ عزیز میں دونوں کو ایک ہی فہرست میں گنا کر اس کو بھی ایمان کی علامت قرار دیا۔

﴿ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝٢ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ ﴾[4]

ترجمہ: ہدایت اور بشارت کا پیغام ہے ان کے لیے جو مومن ہیں کہ جن کے ایمان کی علامت یہ ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

---

(۱) حولانِ حول، یعنی ایک سال پورا ہو جانا ضروری ہے تاکہ مختلف موسموں اور حوادثات کے گزر جانے کے بعد جو آمدنی ہو اس پر زکوٰۃ لی جائے اور یہی انصاف کا تقاضہ ہے۔

(۲) چاندی ۵۲½ تولہ اور سونا ۷½ تولہ، گویا اسلام کی نگاہ میں اس قدر مختصر پونجی رکھنے والا بھی سرمایہ دار ہے۔

(۳) شاہ ولی اللہ: حجۃ البالغہ، ج ۲، مختصرا ابواب الزکاۃ

(۴) سورۃ النمل (۲۷): ۲، ۳

اسی لیے، مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عظیم الشان مجمع میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرمایا تھا اور جمہور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس پر صاد کیا تھا:

واللہ لأقاتلن من فرّق بین الصلوۃ والزکوۃ۔ (۱)

ترجمہ: بخدا میں ضرور ان سے جہاد کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کر رہے ہیں یعنی نماز تو پڑھتے ہیں مگر زکوٰۃ دینے پر آمادہ نہیں۔

نیز اس بارے میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فرضیتِ زکوٰۃ کی عِلّت کو ان صاف الفاظ میں بیان کر کے

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ (۲)

ترجمہ: تاکہ یہ نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں کے گروہ ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔

یہ بھی بتا دیا کہ اس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ دولت سب میں تقسیم ہوتی رہے اور کسی ایک گروہ کی اجارہ داری میں ہو کر ہی نہ رہ جائے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت کے لیے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب میں اپنے نامۂ مبارک میں اس حقیقت کو آشکارا فرمایا ہے:

تؤخذ من أغنیائھم فترد إلی فقرائھم۔ (۳)

ترجمہ: (زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ) ان کے مالداروں سے وصول کی جائے اور ان کے محتاجوں پر تقسیم کر دی جائے۔

---

(۱) صحیح بخاری، ج ۱، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ

(۲) سورۃ الحشر: ۷

(۳) متفق علیہ، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ۔ ریاض الصالحین، باب تاکید وجوب الزکاۃ الخ

زکاۃ اور انکم ٹیکس:

غرض اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "زکوٰۃ" عام خیرات کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ سرکاری "انکم ٹیکس" کی طرح ایک "ٹیکس" ہے جو موجودہ ٹیکسوں سے کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے یعنی وہ صرف کاروبار کی آمدنی کی کمی و بیشی ہی پر واجب نہیں ہوتا بلکہ اس اندوختہ پر بھی واجب ہوتا ہے جس پر سالِ موجودہ میں کسی آمدنی کا اضافہ تک نہ ہوا ہو، اور اس قسم کی تمام چیزوں پر عائد ہوتا ہے جن میں (نمو) بڑھنے کی استعداد موجود ہو۔

بہرحال زکوٰۃ اجتماعی نظام کا ایک خاص اور اہم مالی جزء ہے اسی لیے اس کے وصول کرنے کا حقیقی اور اصولی طریقہ حکومت کے نظم و انتظام کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے وصول کا معاملہ حکومت کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، حکومت اپنے گورنروں اور تحصیلداروں کے ذریعہ سے اس کو وصول کرے اور بیت المال میں داخل کر کے اس کے صحیح مصارف کے مواقع میں خرچ کرے۔

ظالم حکمران اور زکاۃ کی ادائیگی:

عن إبن عمر رضى الله تعالىٰ عنه قال: إدفعوا الزكوة إلى الأُمراء. فقال له رجل: أنّهم لا يضعونها مواضعها. فقال: و إن. ابن عمر قال: ما أقاموا الصلوة فأدفعوها إليهم.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ زکوٰۃ امراء کو ادا کرو۔ ایک شخص نے کہا کہ امراء و خلفاء تو اس کو صحیح مصرف میں صرف نہیں کرتے۔ آپ نے جواب دیا: اس کے باوجود بھی ادا کرو، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جب تک خلفاء نماز

(۱) ابن ابی شیبہ عبد اللہ بن محمد: مصنف ج ۲ کتاب الزکاۃ، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی، بیہقی. ابوعبید: کتاب الاموال، باب ۸۲، نمبر ۱۷۸۳، ۱۷۹۰، ۱۸۰۳

ادا کرتے رہیں تم انہی کو زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

ابو صالح[1] کہتے ہیں میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے پوچھا کہ یہ حاکم جو بے عنوانیاں کر رہے ہیں آپ کے پیشِ نظر ہیں کیا اس حالت میں بھی ہم انہی کو زکاۃ ادا کریں؟ سب نے متفقہ آواز سے کہا کہ ضرور ان ہی کو ادا کرو (اس لیے کہ اجتماعی زندگی کے لیے یہی ازبس ضروری ہے)۔[2]

اور امام حدیث وفقہ ابو بکر جصاص[3] حنفی احکام القرآن میں مصارفِ زکوٰۃ کی

(۱) ابو صالح، ابو صالح رحمہ اللہ کنیت کے مدینہ منورہ کے نو (۹) موالی طبقہ (آزاد شدہ غلام) کے تابعین کرام رحمہم اللہ گزرے ہیں یعنی ابو صالح السمان، ابو صالح باذام، ابو صالح سمیع، ابو صالح مولی عثمان، ابو صالح غفاری، ابو صالح میسرۃ، ابو صالح مولی ضباعۃ، ابو صالح مولی السفاح عبید اور ابو صالح مولی سعد بین رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ان میں سے پہلے تین ابو صالح کنیت کے بزرگوں سے حدیث روایت کی گئی ہے۔ لہذا ان کا تذکرہ درج ہے۔

ابو صالح السمان الزیات ذکوان رحمہ اللہ غطفان یا جویریۃ قبیلہ قیس کی خاتون کے آزاد کردہ غلام ابو صالح (یعنی ابو سہیل بن ابو صالح مدنی رحمہ اللہ) مراد ہیں۔ ان کی روایات مدینہ منورہ اور کوفہ کے علماء حدیث نے نقل کی ہیں، انہیں ثقہ اور کثیر الروایات عالم سمجھا گیا ہے۔ کوفہ سے مدینہ منورہ آکر رہائش کی سعادت پائی اور مدینہ منورہ میں ہی ۱۰۱ھ میں وفات پا کر آسودہ خاک ہو گئے۔

دوسرے ابو صالح باذام حضرت ام ہانی بنت ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم کے آزاد کردہ غلام تھے ان سے حضرت سماک، محمد بن سائب کلبی اور اسماعیل بن ابی خالد رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

تیسرے ابو صالح سمیع رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے احادیث نقل کی ہیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں: طبقات ابن سعد رحمہ اللہ تعالیٰ، ج ۵، تذکرہ ابو صالح رحمہ اللہ تعالیٰ)

(۲) ابن ابی شیبہ عبداللہ بن محمد: مصنف، ج ۲، کتاب الزکاۃ، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی. بیہقی حوالہ ابوعبید: کتاب الاموال، باب ۸۲ نمبر ۱۷۸۳، ۱۷۹۰، ۱۸۰۳

(۳) امام جصاص رحمہ اللہ، امام ابو بکر احمد بن علی (متوفی ۳۷۰ھ / ۹۸۱ء) مشہور محدث، فقیہ اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کا شمار فقہاء احناف کے اساطین میں ہوتا ہے۔ آپ کی کتب میں مشہور "احکام القرآن" ہے جو قرآن کریم کی فقہی انداز پر تفسیر ہے، یہ تفسیر ۱۳۵۵ھ / ۱۹۱۶ء میں استنبول (ترکی) سے شائع ہوئی۔ آپ کی کتاب "اصول جصاص" ــــ جو اصول فقہ پر ہے ــــ ۱۹۸۹ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

اس بحث میں ''کہ جو صدقہ واجبہ ہے وہ امام ہی کے حوالے کیا جائے وہ غیر مسلم پر خرچ نہیں کیا جاسکتا ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

فان قیل فزکوٰۃ المال لیس أخذها إلى الإمام ولا یجوز أن تعطی أهل الذمة. قیل أخذها فی الأصل إلى الإمام وقد کان النبی صلى الله علیه وسلم یأخذها، وکذالك أبو بکر و عمر رضی الله تعالىٰ عنهما. فلما کان عثمان قال للناس: ان هذا شهر زکاتکم فمن کان علیه دین فلیؤده ثم لیزك بقیة ماله. فجعل أرباب الأموال وکلاء له فی أدائها. ولم یسقط فی ذلك حق الإمام. ذلك حق الإمام فی أخذها.[1]

ترجمہ: اور اگر یہ کہا جائے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ پر امام کا یہ حق نہیں ہے کہ ضرور اس کے ہی حوالے کی جائے اور پھر اس کو ذمی (غیر مسلم معاہد) پر خرچ کرنا جائز نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل قانونِ شریعت میں اموالِ (باطنہ) کے لیے بھی یہی ضروری ہے کہ امام (خلیفہ) کو دی جائے اور اس کی وصول یابی امام ہی کا حق ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ برابر وصول فرماتے تھے، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے فرمایا: لوگو! یہ زکوٰۃ کا مہینہ ہے پس جس شخص پر تم میں سے قرض ہو پہلے وہ اس کو ادا کرے۔ اور اس کے بعد باقی مال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ تو اس اعلان کی وجہ سے اصحابِ اموال، امام کی جانب سے ادائے زکوٰۃ میں وکیل قرار پائے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ اموال (باطنہ) پر امام کا یہ حق جاتا رہا کہ وہ خود وصول کرے۔

---

(۱) ابو بکر جصاص: احکام القرآن، ۵۴/۲

لہٰذا زکوٰۃ کا موجودہ طریقۂ اور طریقۂ وصول ان ہی مجبوریوں کی ایک کڑی ہے جو "اسلامی نظام امارت" کے فقدان سے پیدا ہوتی ہیں اور جس کا دفع کرنا ہر مسلمان کا دینی و مذہبی فریضہ ہے، اس لیے اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت کا وجود اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے ناممکن الحصول ہو گیا تھا تو یہ تو ہر وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا کہ وہ بیت المال کے قیام اور اجتماعی مذہبی امور کے انتظام کے لیے اپنا ایک امیر مقرر کر لیتے، مگر افسوس کہ ہندوستان میں یہ اسلامی فریضہ اس وقت شرمندہ معنی نہیں ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ افراد کی سخاوتیں اور ان کی فیاضیاں، وقتی طور پر کتنی ہی بیش از بیش کیوں نہ ہوں، امت اور قوم کے اجتماعی نظام کی تکمیل کو ہرگز پورا نہیں کر سکتیں، کیونکہ اگر سرمایہ دار اور مال دار افراد کے عطیات اور انجمنوں کے قیام و نظام سے اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا تو امریکہ اور یورپ میں کبھی کا حل ہو گیا ہوتا، جہاں دولت مندوں کی دولت کے بے شمار انبار ہیں اور جنہیں قومی نظام کے لیے انجمن سازی کا بہتر سے بہتر شعور ہے، مگر حقیقت سامنے ہے کہ ان کا قومی نظام اور قومی سرمایہ کسی طرح بھی پست و متوسط طبقوں کی بیکاری اور افلاس کا انسداد نہ کر سکا اور نہ عملی طور پر اس کا کوئی حل سوچ سکا۔

پس اس صورتِ حال کا اگر کوئی بہترین اور صحیح علاج ہو سکتا ہے تو وہ وہی ہے جس کو اسلام نے تجویز کیا ہے کہ قانون کے ذریعے متمول افرادِ قوم کی پوری کمائی کا ایک معین حصہ کمزور اور پست افراد کی اجتماعی اور اقتصادی بہتری کے لیے مخصوص کر دیا، اسی کا نام "زکوٰۃ" ہے۔

صدقات واجبہ (Obligatory Charities):

زکوٰۃ کے علاوہ "صدقات" کی اسلامی اصطلاح اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اسلام دولت مند کو زکوٰۃ لینے کے بعد بھی قومی و اجتماعی انفاق کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ انفاق کے لیے دوسری راہیں بھی کھولتا ہے اور

ان کو صدقات سے تعبیر کرتا ہے، صدقات کی یہ ذمہ داری دو حصوں پر تقسیم کی گئی ہے۔

صدقات کی دو نوع ہیں: ایک نافلہ دوسری واجبہ، پہلی نوع کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے کہ وہ حسبِ مرضی جس کارِ خیر میں چاہے حصہ لے، اور دوسری نوع پھر دو حصوں میں منقسم ہے، ایک انفرادی، یعنی کسی متمول فرد کا کسی حاجت مند کی روائی پر بذاتِ خود خرچ کرنا، مثلاً صدقۃ الفطر، غریب والدین کا نفقہ، غریب اولاد کا نفقہ پس اگر کوئی شخص اس انفرادی اتفاق میں کوتاہی کرتا ہے تو امام کو حق حاصل ہے کہ اس کو اس انفاق کے لیے مجبور کرے، دوسرا اجتماعی یعنی زکوٰۃ کی طرح قوم کی اجتماعی اقتصادی حالت کی بہتری اور حاجت مندوں کی حاجت کے انسداد کے لیے بذریعہ حکومت خرچ کرنا، مثلاً جہاد اور رفاہِ عامہ کے اہم مواقع پر "زکوٰۃ عشر" اور خراج کے علاوہ اور اربابِ دولت و ثروت سے حسبِ تقاضا حقوقِ اجتماعی وصول کرنا۔

دولت و سرمایہ پر زکوٰۃ کے علاوہ حقوق واجبہ کا مطالبہ:

اس مقام پر یہ بحث بھی خاص اہمیت رکھتی ہے کہ زکوٰۃ، عشر اور خراج کے علاوہ بھی کیا مال پر مزید حقوقِ واجبہ ہیں؟ بعض علماء نے اس کا جواب نفی میں دیا ہے، مگر یہ ان کے قلتِ فکر و تدبیر کا نتیجہ ہے اس لیے علمائے محققین کا مسلک یہ ہے کہ بلاشبہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر حقوقِ واجبہ ہیں اور ان کا وجوب اس حد تک اہمیت پذیر ہے کہ اگر کوئی شخص ان حقوقِ واجبہ سے گریز کرے تو بلا تامل امام کو اس ادائے حقوق پر مجبور کر سکتا ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ کی وقیع رائے:

مغرب (اندلس) کے مشہور محدث و فقیہہ ابو محمد ابن حزم[1] نے کہ جن کو

(۱) ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ کے تعارف کے لیے دیکھیں اس کتاب کے باب ۲ کے حوالہ نمبر ۱۱ کے بعد حاشیہ میں درج ہے۔

بعض علماء نے قرن خامس کا مجدد کہا ہے، اس مسئلہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے بلکہ نفقاتِ نوافل و فرائض پر بحث کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں قرآنِ حکیم اور احادیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں اسلام کے معاشی نظام کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ موجودہ دورِ ترقی کے مقبول نظامہائے اقتصادی کے علمی دقیق مباحث سے قطع نظر ان کے عملی ثمرات و نتائج اور عملی پہلوؤں کے نقطہ ہائے نظر اس نقشہ سے بہتر معاشی حل پیش کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں۔

ابن حزم رحمہ اللہ نے دو ورق میں جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ اپنی تفصیل و تفسیر میں ضخیم جلدوں کا محتاج ہے تاہم اس مقام پر شرح و بسط سے گریز کرتے ہوئے حرف بحرف اس کا ترجمہ پیش کر دینا ہی کافی ہے کیونکہ اہلِ بصیرت اور دقیقہ رس حضرات کے لیے اس مختصر متن ہی میں "معاشی حل" کے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے۔

اغنیاء پر معاشرہ کے محتاجوں کی بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت کی ذمہ داری:

ابن حزم اپنی شہرہ آفاق کتاب المحلی میں تحریر فرماتے ہیں:

(مسألة) قال أبو محمد و فرض علی الأغنياء من أهل كل بلدأن يقوموا بفقرائهم ويجبرهم السلطان على ذلك إن لم تقم الزكوة بهم ولا فئ سائر اموال المسلمين بهم، فيقام لهم بما يأكلون من القوت الذى لا بد منه ومن اللباس للشتاء والصيف بمثل ذلك ويمسكن يكنّهم من المطر والصيف والشمس وعيون المارة

برهان ذلك قول الله تعالىٰ ﴿وَءَاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ﴾ ﴿ذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْجَارِ ٱلْجُنُبِ وَٱلصَّاحِبِ بِٱلْجَنۢبِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ﴾

فأوجب الله تعالیٰ حق المساكين وابن السبيل وما ملكت اليمين مع حق ذی القربی وافترض الاحسان إلی الأبوين وذی القربی والمساكين والجبار وما ملكت اليمين و الإحسان تقتضی كل ما ذكرنا ومنعه أساءة بلا شك الخ.

ترجمہ: اور ہر ایک شہر کے ارباب دولت پر فرض ہے کہ وہ فقراء اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کا سامان کریں اور (اگر نہ کریں) تو ان کو اس ادائیگی پر خلیفہ اور امام مجبور کر سکتا ہے (مگر ایسا اس وقت کرنا پڑے گا) اور اگر زکوٰۃ اور فیٔ (اموال بیت المال) ان کی کفالت کے لیے کافی نہ ہوں۔

پس ایسی صورت میں ان کی ضروریات کی کفالت سے متعلق از بس ضروری ہے کہ بقاء حیات کے لیے خورد و نوش، گرمی اور سردی کے موسموں کے مناسب لباس، رہنے سہنے کے لیے ایسے مکان کا انتظام ہر فرد کے لیے مہیا کیا جائے، جو بارش، دھوپ تپش اور سیلاب جیسے حوادثات سے محفوظ رہ سکے۔ (یا آنے جانے والوں کی نگاہوں سے محفوظ (Privacy) رکھے)

اربابِ دولت پر اس فرض کے عائد ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک ہے:

﴿ وَءَاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور قرابت والوں کو اور مسکین اور مسافر کو ان کا حق دو۔

نیز اللہ کریم کا فرمان ہے اور اس کے لیے برہان ہے:

﴿وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ

(۱) سورۃ الاسراء (۱۷): ۲۶

وَٱلْجَارِ ذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْجَارِ ٱلْجُنُبِ وَٱلصَّاحِبِ بِٱلْجَنۢبِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔ اور قرابتی ہمسایوں اور اجنبی پڑوسیوں اور مسافروں اور ماتحتوں پر بھی احسان کرو۔

پس یہ آیات ہیں جن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دولت مندوں پر مساکین، مسافروں اور افرادِ ملک یمین (غلام اور ماتحت) کا حق واجب مقرر فرمایا ہے اور ساتھ ہی قرابت والوں کا حق بھی اور والدین کے اور اہل قرابت، مساکین ہمسایہ اور افراد ملک یمین کے ساتھ حسن سلوک کو فرض کیا اور احسان کا اولین تقاضا ان حقوق کی ادائیگی ہے۔ جن کو ہم نے ابھی خوراک لباس اور مکان کے سلسلہ میں بیان کیا ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو شخص ان حقوق کے ادائے فرض سے باز رہتا ہے وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

محتاجوں کی کفالت کی اہمیت:

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ ﴾ (۲)

ترجمہ: (اہل جنت دریافت کریں گے) تم کو جہنم تک کس عمل نے پہنچایا؟ تو جہنمی کہیں گے اس بات نے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مساکین اور حاجت مند کی ضروریات خورد و نوش کو پورا نہیں کرتے تھے۔

---

(۱) سورۃ النساء (٤):٣٦

(۲) سورۃ المدثر (٧٤):٤٢

پس اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے مسکین کے خورد و نوش کی کفالت کو نماز کی وصیت کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ غایتِ صحت بہت سے طریقہ ہائے روایت سے یہ منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من لا یرحم الناس لا یرحمه الله [1]

ترجمہ: جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا۔

میں کہتا ہوں کہ جو شخص مالدار ہو اور وہ مسلمان بھائی کو بھوکا ننگا دیکھے اور اس کی مدد نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس نے اس بھائی پر قطعاً رحم نہیں کیا اور یہ حدیث بہت پختہ ہے کیونکہ اس کو نافع بن جبیر [2] بن مطعم رحمہ اللہ اور قیس بن [3] ابی حازم رحمہ اللہ اور ابو ظبیان اور زید بن وہب رحمہ اللہ نے حضرت جریر [4] بن عبد اللہ (جلیل القدر صحابی) سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور زہری رحمہ اللہ [5] نے بھی اس مطلب کی حدیث ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ

(۱) امام بخاری، صحیح ج ۱۳ (جدید مصری ایڈیشن) نمبر ۲۰۳۔ صحیح مسلم (جدید مصری ایڈیشن) نمبر ۲۳۱۹۔ امام ترمذی: الجامع، ج ۱، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس بحوالہ ریاض الصالحین، باب تعظیم حرمات المسلمین الخ

(۲) حضرت نافع بن جبیر بن مطعم القرشی الحجازی رحمہ اللہ عالی مرتبت تابعی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا اور ان سے امام زہری رحمہ اللہ نے روایت کیا۔ (الکمال فی اسماء الرجال، ترجمہ نافع بن جبیر رحمه الله تعالیٰ)

(۳) حضرت قیس بن ابی حازم الاحمسی البجلی رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی ہیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی نیت سے حاضر ہوئے مگر پتہ چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے بشمول عشرہ مبشرہ (سوائے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کیا اور آپ سے بھی تابعین اور تبع تابعین کی بڑی تعداد نے روایت کیا۔ نہروان کی لڑائی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھے ۹۸ھ میں سو (۱۰۰) سے زیادہ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۴) حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات باب ۶ کے حاشیہ میں درج ہیں۔

(۵) زہری، محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب الزہری رحمہ اللہ ۵۱ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ امام، حافظ الحدیث والقرآن، محدث اور فقیہہ تھے۔ آپ نے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی ترغیب

عنہ [۱] سے عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۲] کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

اور مجھ سے عبد الرحمٰن [۳] بن عبد اللہ بن خالد رحمہ اللہ نے بسلسلہ سند حضرت عبد الرحمٰن [۴] بن ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت کی ہے کہ

پر باقاعدہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کرنے کا مبارک کام شروع کیا۔ آپ علم حدیث میں منبع و مصدر کا درجہ رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ پھر شام چلے گئے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے اپنے تمام گورنروں کو لکھا کہ وہ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کا دینی امور میں اتباع کریں کیونکہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔ تقریباً تمام بڑے محدثین، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ سے روایت کیا ہے، جن میں بڑے بڑے فضلاء کے اسماء گرامی شامل ہیں مثلاً ابراہیم بن ولید اموی، ایوب سختیانی، ایوب بن موسی، ربیعہ الرائ، رزیق بن حکیم، سفیان بن سعید ثوری، سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد، مالک بن انس، محمد بن اسحاق، معمر بن راشد، موسیٰ بن عقبہ، ہشیم بن بشیر، یزید بن یزید، یونس بن یزید رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ آپ نے ۱۲۳ھ میں گاؤں شغب (فلسطین اور حجاز کے درمیان) میں وفات پائی۔ (برائے تفصیل ملاحظہ ہو: مزی: تہذیب تاریخ ابن ابی خیثمه، الکامل فی التاریخ، ابن سعد: طبقات ج ۷ تاریخ النسوی علامہ زرکلی: الاعلام: ۳۱۷/۷)

(۱) ابو سلمہ، عبد اللہ ابن عبد الاسد بن ہلال بن عبد اللہ بن مخزوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد تھے، آپ نے شروع شروع میں اسلام قبول کیا۔ غزوہ بدر اور غزوہ احد دونوں میں شرکت کی سعادت پائی۔ غزوہ احد میں گہرا زخم کھایا جس کی بدولت ۳ھ میں وفات پائی۔ بہت بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ (اسد الغابۃ: ۱۵۲/۶)

(۲) ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن ممتاز تابعی تھے۔ بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ سن ۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴ھ میں وفات پائی، ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ کو دیکھا کہ ایک نوجوان ان کے ساتھ کتاب اٹھائے ہوئے ہوتا، اسے اپنے گھر لے جاتے اور اس سے احادیث املا کراتے۔ آپ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کرتے تھے۔ آپ کی روایت کردہ احادیث یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ نے نقل کی ہیں۔ (برائے تفصیل دیکھیں: مذی: تہذیب ۱۲: ۱۱۶. خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۲۱۸/۱. محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینه، تذکرہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ)

(۳) حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ بن خالد رحمہ اللہ والدہ محترمہ کا نام ام الحکم تھا جو حضرت ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن تھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔

(۴) حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ابن صحابی یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل صحابی کے سب سے بڑے صاحبزادے اور خود بھی صحابی تھے۔ یہ فضیلت صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ =

''اصحاب صفہ'' حاجت مند لوگ تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلسلہ میں یہ ارشاد فرمادیا تھا: جس شخص کے یہاں دو آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ (ان میں سے کسی کو) تیسرا بنا کر شریک طعام کرے اور جس کے یہاں چار آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ پانچویں اور چھٹے کو شریکِ طعام کرے۔ [۱]

پس ہم اسی ارشاد کے حرف بحرف قائل ہیں۔

اور بطریق لیث [۲] بن سعد رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المسلم اخو المسلم لایظلمه ولایسلمه. [۳]

تعالیٰ عنہ اور ان کی اولاد کے حصہ میں آئی کہ ان کی چار پشتیں صحابی ہیں۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حقیقی بھائی تھے فتح مکہ مکرمہ کے وقت اسلام لائے۔ نہایت شجاع، جری اور ماہر تیر انداز تھے۔ جنگ یمامہ میں اللہ کریم نے مسلمانوں کو فتح انہی کی تیر اندازی کی وجہ سے دی۔ یزید کی بیعت سے انکار پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ چلے آئے۔ رات سوتے میں آپ کی روح پرواز کر گئی۔ یہ سن ۵۳ھ یا ۵۴ھ تھا۔

(۱) ترمذی الجامع، ابواب الاطعمة، باب ماجاء فی طعام الواحد یکفی الاثنین بحواله ریاض الصالحین، باب الایثار والمواساة

(۲) لیث بن سعد الفہمی رحمہ اللہ امام محدث، فقیہہ اور مفسر تھے۔ آپ کا شمار کبار فقہاء اسلام میں ہوتا ہے آپ ۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۵ھ میں وفات پائی۔ ایک بار آپ رحمہ اللہ سے ان کے عقیدت مندوں نے دریافت کیا، ہم آپ سے ایسی احادیث بھی سنتے ہیں جو آپ کی کتابوں میں نہیں ہیں آپ نے فرمایا: کیا وہ تمام جو میرے سینہ میں ہے وہ میری کتابوں میں بھی ہو؟ اگر وہ سب کچھ جو میرے سینہ میں ہے وہ لکھ دوں یہ سواری اس کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ (مزی، تہذیب:٨/٤٦٤)
آپ سے آپ کے کاتب ابو صالح رحمہ اللہ کے سوا خالد مدائنی، ابو قتادہ الحرانی، قتیبہ بن سعد اور یحییٰ بن بکیر رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ (مزی، تہذیب:٨/ ٣٦٠، الکامل فی التاریخ:١/ ١.٢٢٢)

(۳) ریاض الصالحین، باب قضاء حوائج المسلمین. جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الشفقة المسلم علی المسلم.
یہ اس جامع حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس میں مسلمانوں کے مسلمانوں پر حقوق کا ذکر ہے، علامہ ابن حزم ظاہری اندلسی رحمہ اللہ نے اس کا ایک ٹکڑا نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے جبکہ تمام حدیث ہی کفالت مسلمان کے اہم موضوع پر روشنی ڈالتی ہے، آئیے ہم پوری حدیث پڑھتے ہیں اور اس فرمودہ مضامین کو بھی ذہن نشین

ترجمہ: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس لیے چاہیے کہ نہ مسلمان، مسلمان پر ظلم کرے اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

ابو محمد (ابن حزم) کہتا ہے کہ اگر ایک شخص ننگا بھوکا ہے اور دوسرا شخص اس کو کھلانے پہنانے پر قادر ہے اور پھر اسی حالت میں اس کو چھوڑتا ہے تو بلاشبہ اس نے حدیث کے فرمان ''لا یسلمه'' کی خلاف ورزی کی اور اس کو بے مدد چھوڑ دیا۔

ضرورت سے زائد مال پر محتاج کا حق:

مجھ سے عبداللہ بن یوسف رحمہ اللہ نے بہ سلسلہ سند حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ حدیث بیان کی ہے:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان معه فضل

کرتے ہیں:

عن ابن عمر رضى الله تعالىٰ عنهما: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلم أخو المسلم، لا يظلمه ولا يسلمه من كان فى حاجة أخيه كان الله فى حاجته، ومن فرّج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كرب يوم القيامة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ خود اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے کسی ظالم کے سپرد (یعنی بے یار و مددگار) کرتا ہے (یہ اس لیے ضروری ہے کہ) جو کوئی اپنے (مسلمان) بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگے گا، اللہ کریم اس کی حاجت روائی کریں گے۔ (اسی طرح) جس کسی نے کسی مسلمان سے کوئی تنگی دور کی اللہ کریم اس کے بدلے قیامت کی تنگیوں میں سے تنگی دور فرمائیں گے، اور جس کسی نے مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ کریم اس کی (لغزشوں اور خطاؤں کی) پردہ پوشی فرمائیں گے۔

اس حدیث مبارکہ میں صرف دنیوی ہی نہیں اخروی حاجات پورے کرنے کا اللہ کریم نے ذریعہ دنیا میں اس کے کسی محتاج، پریشانی اور مجبور بندہ کے کام آنے کو بنایا ہے اور اس کی ستر پوشی کا حکم دے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کو سبق دے رہے ہیں کہ محتاج کی محتاجی دور کرتے وقت اس کی خطاؤں پر نظر نہ ہو بلکہ اس کی محتاجی کے دکھ پر نظر ہو، اسی لیے تو کریم کا وعدہ ہے:

والله فى عون العبد ما كان العبد فى عون أخيه. (رواه مسلم، رياض الصالحين، باب قضاء حوائج)

اللہ کریم بندہ کی مدد و نصرت میں رہتے ہیں جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد و نصرت میں لگا رہتا ہے۔

ظهر فليعد به على من لا ظهر له، ومن كان له فضل من زاد فليعد به على من لازاد له. قال: فذكر من أصناف المال فاذكر حتى رأينا أنه لاحق لأحد من في فضل.[1]

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کے پاس ضرورت سے فاضل سواری ہو اس کو چاہیے کہ جس کے پاس سواری نہیں ہے اس کو دے دے۔ اور جس کے پاس اپنی اصل حاجت سے زائد (زاد) خورد و نوش وغیرہ کا سامان ہو اس کو چاہیے کہ جس کے پاس سواری نہیں ہے اس کو دے دے۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اقسامِ اموال کو شمار کر کے اسی طرح فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ حاجت سے زائد مال پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے (بلکہ وہ جماعت کے ان دوسرے افراد کا حق ہے جو اس کے محتاج ہیں)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا اجماع ہے جس کی اطلاع حضرت ابو سعید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) دے رہے ہیں، اور اس حدیث میں جو حکم ہے ہم اس کے حرف بحرف قائل ہیں، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

إطعموا الجائع وفكوا العانى.[2]

---

(۱) ابوداؤد، السنن، ج ۱، کتاب الزکاۃ، باب فی حقوق المال - ریاض الصالحین، باب الایثار والمواسات

(۲) صحیح الامام البخاری، ج ۱، کتاب الجهاد، باب فكاك الأسير. رياض الصالحين، كتاب عيادة المريض. پوری حدیث اس طرح ہے:

عن ابى موسى رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عودوا المريض، واطعموا الجائع، وفكو العانى.

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (امت کو

ترجمہ: بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور قیدی کو رہائی دلاؤ۔

غرض نصوصِ قرآنی اور احادیث صحیحہ اس بارے میں بکثرت موجود ہیں۔

اور عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ کے سلسلۂ سند سے ہم کو یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا:

لو أستقبلت من أمري ماأستدبرت لأخذت فضول أموال الأغنياء فقسمتها على فقرآء المهاجرين.[1]

ترجمہ: جو بات مجھ کو بعد میں معلوم ہوئی اگر پہلے سے معلوم ہوتی تو میں دولت مندوں کی فاضل دولت کو ان سے لے کر فقراء مہاجرین پر تقسیم کر دیتا۔

اس روایت کی سند اپنی صحت اور وقعت کے لحاظ سے بہت رفیع المرتبہ ہے۔ (وهذا اسناد في غاية الصحة والجلالة)

اور سعید بن منصور رحمہ اللہ کے سلسلہ سند سے مجھ کو حضرت علیؓ بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت پہنچی کہ وہ فرماتے تھے:

ان الله تعالٰى فرض على الاغنياء في أموالهم بقدر ما يكفي فقراء هم. فإن جاءوا أوعروا أو جهدوا فبمنع الأغنياء. وحق على الله تعالٰى أن يحاسبهم يوم القيامة ويعذبهم عليه.[2]

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ دولت و ثروت پر اس قدر مال کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے جو ان کے فقراء اور حاجت مندوں کی حاجت کی کفایت کر سکے، پس اگر لوگ بھوکے اور ننگے اور تکالیف و شدائد میں

نصیحت کرتے ہوئے) فرمایا: مریض کی عیادت کرو، بھوکے کو کھانا کھلاؤ، اور قیدی کو رہا کرو (کراؤ)۔

(۱) ابن حزم: المحلی: ۱۶۷/۶

(۲) كذا في الدر، طبراني في الاوسط، ابو بكر الشافعي في الغيلانيات، مشكوة المصابيح، باب فضل الصدقة، فصل ثاني

مبتلا رہیں تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اصحابِ دولت نے اپنا فرض ادا نہیں کیا، اور اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ قیامت میں ان سے اس عدم ادائیگی فرض پر محاسبہ اور عذاب میں مبتلا کرے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے:

فی مالك حق سوی الزکوة [1]

ترجمہ: تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المؤمنین، حسن بن علی اور ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے جب کوئی اس سلسلہ میں سوال کرتا تو فرماتے:

إن كنت تسال فی دم موجّع أو غرم مفظّع أو فقر مدقّع فقد وجب حقك. [2]

ترجمہ: اگر تو اس حالت میں سوال کرے کہ دردناک عذخون کا معاملہ ہے، یا ناقابلِ برداشت تاوان کا اور یا مہلک فقر و فاقہ کا معاملہ ہے تو اصحابِ دولت پر تیرا حق واجب اور فرض ہو گیا (جس کی اداء ان کے ذمہ لازم ہے)۔

---

(۱) امام ترمذی: الجامع، ج ۱، ابواب الزکاۃ، ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکاۃ عن فاطمۃ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا

(۲) اسی مفہوم کی حدیث امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے:

عن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنه قال: المسئلة لا تحل إلا لثلاثة: لذی فقر مدقع أو لذی غرم مفظع أو لذی دم موجع.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوال کرنا تین طرح کے اشخاص کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں: مہلک فقر و فاقہ والا یا ناقابل واپسی تاوان والا یا دردناک خون والا۔ (دیکھئے: الشوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ: نیل الاوطار، ج ٤ ابواب الاصناف الثمانیۃ)

حضرت ابو عبید بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء تین سو صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے یہ بات صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ:

أنّ زادهم فني، فأمرهم أبوعبيدة رضى اللّٰه تعالٰى عنه فجمعوا أزدادهم في مزوّدين وجعل بقوتهم ايّاها على السواء. (١)

ترجمہ: جب مجاہدین کی اس جماعت کے پاس کھانے پینے کا سامان قریب بہ ختم ہو گیا، تب حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جس قدر سامان خورد و نوش باقی ہے وہ سب میرے پاس لائے اور جب سب جمع ہو گیا تو بغیر لحاظ کمی بیشی اس کو سب پر یکساں تقسیم کر دیا (یعنی جن حضرات کے پاس بالکل نہیں رہا تھا اور جس کے پاس کم تھا اور جس کے پاس قدرے زائد تھا، ان سب کے درمیان مساوی تقسیم فرما دیا)۔

پس یہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اجماع ہے، جس کے خلاف ایک رائے بھی نہیں ہے۔

فرض زکاۃ کے علاوہ فرد کے فاضل مال پر فقراء کے مالی حقوق:

اور مشہور تابعین شعبی، مجاہد طاؤس رحمہم اللہ تعالیٰ (٢) وغیرہ سے منقول ہے کہ وہ بالاتفاق اس کے قائل تھے کہ "في المال حق سوى الزكوة" مال میں زکوٰۃ کے

---

(١) متفق عليه، بخاري ج ٥، نمبر ٩٣. مسلم حديث نمبر ٢٥٠٠

(٢) طاؤس، ابو عبد الرحمٰن طاؤس بن کیسان الیمانی رحمہ اللہ بہت بڑے فقیہ، محدث اور امام تھے۔ عابد، زاہد اور متقی انسان تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے: "إني لأظن طاؤس من اهل الجنة" میرا گمان ہے کہ طاؤس رحمہ اللہ جنت والوں میں شامل ہوں گے۔ آپ کے پاس ایک کتاب ہوتی تھی، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ تھیں۔ آپ کی روایت کردہ احادیث لیث بن ابی سلیم رحمہ اللہ کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ آپ نے ١٠٠ھ میں وفات پائی۔ (برائے تفصیل دیکھیں: مزی: تهذيب: ٣٧١/٤، ابن ابي خيثمه: تاريخ. محمد مصطفى الاعظمي: دراسات في الحديث النبوي وتاريخ تدوينه، تذكره طاؤس بن كيسان رحمه اللّٰه تعالٰى)

علاوہ بھی حقِ مفروض ہے۔

مخالف اور موافق روایات پر ابن حزم رحمہ اللہ کا عالمانہ تبصرہ:

❶ میں کہتا ہوں کہ ان حضرات اہل علم میں سے میں نے ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ [1] کے علاوہ کسی کو اس کا مخالف نہیں پایا کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اور حقوقِ مال ہیں جو فرض و وجوب کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ تنہا ضحاک رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ فرضیتِ زکوٰۃ نے مال سے باقی حقوق واجبہ کو منسوخ کر دیا اور ضحاک رحمہ اللہ کی رائے تو کیا حجت ہوتی ان کی روایت بھی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس دلیل کے قائل ضحاک رحمہ اللہ خود دلیل کے خلاف اپنا مسلک رکھتے ہیں اور فرضیت زکوٰۃ کے علاوہ اس کے قائل ہیں کہ مالدار کے مال میں غریب والدین کا نفقہ، زوجہ کا نفقہ، غلام کا نفقہ، پالتو حیوان کی خورد و نوش اور قرض و تاوان کی ادا یہ سب حقوق و فرائض ہیں ان کی روایت اور رائے دونوں میں تناقض و تضاد پایا جاتا ہے۔

❷ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کے سلسلۂ سند سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے تم یہ نقل کرتے ہو کہ انہوں نے فرمایا:

من أدى زكوة ماله فليس عليه جناح أن لا يتصدق. [2]

ترجمہ: جس شخص نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو اس پر گناہ نہیں ہے اگر وہ صدقہ خیرات نہ کرے۔

❸ اور اسی طرح تم نے بطریق حکم [3] حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ

---

(۱) ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ محدث، فقیہہ اور امام تھے۔ آپ نے قرآن حکیم کی ایک تفسیر بھی لکھی۔ اسی طرح آپ نے مناسک حج پر ایک کتاب لکھی۔ آپ رحمہ اللہ کی احادیث حسین بن عقیل رحمہ اللہ نے نقل کی تھیں۔ آپ نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

(۲) ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی السنن، ج ۱، باب ما أدى زكاته فليس بكنز میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی مفہوم کی حدیث نقل کی ہے: "إذا أديت زكاة مالك فقد قضيت ما عليك" (جب تو نے اپنے مال کی زکاۃ ادا کر دی تو اس کے بعد تو (ان مالی فرائض سے) بری ہو گیا جو تجھ پر (فرض) تھا)۔

(۳) ❶ حکم، الحکم بن عتیبہ رحمہ اللہ تابعی ہیں۔ آپ محدث اور فقیہ تھے۔ آپ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵ھ

روایت کیا ہے کہ ﴿"وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ"﴾ کا حکم عشر اور نصف عشر کے حکم سے منسوخ ہو گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری روایت کو جس کو مقسم [1] نے روایت کیا ہے ساقط الاعتبار اور ضعیف ہے اور اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی ہمارے خلاف نہیں ہے (کیونکہ آیت میں حقِ واجب کا ذکر نہیں ہے نفل کا تذکرہ ہے)۔

❹ اور پہلی روایت جس کو عکرمہ رحمہ اللہ [2] نے روایت کیا ہے اس کا مطلب تو صاف طور پر یہ ہے کہ اس شخص پر مستحب و نفل صدقہ و خیرات لازم نہیں ہے۔

میں وفات پائی۔ آپ کی روایات کو امام شعبہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

❷ الحکم بن مقسم رحمہ اللہ ایک دوسرے تابعی بھی ہیں، جنہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔

(۱) مقسم بن بجرہ رحمہ اللہ نامور تابعی ہیں۔ آپ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بالخصوص اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بالعموم روایت کیا ہے آپ سے محدث الحکم رحمہ اللہ اور عثمان المشاہد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے آپ نے ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ (مزی: تہذیب، ۱۰/۲۸۹. محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینه، تذکرہ مقسم بن بجرہ رحمہ اللہ تعالیٰ)

(۲) عکرمہ مولی ابن عباس رحمہ اللہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے کبار تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ قرآن مجید کی تفسیر میں آپ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تمام طلبہ سے فائق تھے۔ مغیرہ رحمہ اللہ نے ایک بار حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے دریافت کیا: کیا کوئی آپ سے بھی بڑا عالم ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! عکرمہ مولی ابن عباس رحمہ اللہ۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: عکرمہ رحمہ اللہ سے بڑھ کر آج کتاب اللہ کا کوئی عالم نہیں۔ ایک بار ابو صالح رازی رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا کہ عکرمہ رحمہ اللہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ میں سے علم تفسیر کا کون بڑا عالم ہے؟ تو انہوں نے کہا: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے تمام اصحاب علم تفسیر میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کے محتاج ہیں۔ آپ کے شاگردوں کی جماعت مشرق سے مغرب تک پائی جاتی ہے۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے بصرہ، کوفہ، یمن، مغرب اور دیگر بہت سے شہروں کا سفر کیا۔

آپ کی احادیث کے راویوں میں حضرت ایوب سختیانی، جابر بن زید، حسین بن زید، سلمہ بن وہرام، عبد الملک بن عبد العزیز، عثمان بن غیاث، عمرو بن عبد اللہ بن اسوار الیمانی رحمہم اللہ تعالیٰ اور اہل یمن اور مشرق کے اہل علم کی بہت بڑی تعداد شامل ہے آپ نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: مزی: تہذیب، ۷/۲۷۱. ابن سعد: طبقات، ۵/۲۱۲. ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ص ۹۶ - تہذیب: ۸/۶۱)

لیکن نادار کی کفالت کا حق تو حقِ واجب اور اس کے ذمہ قرض ہے۔ صدقۂ نافلہ نہیں ہے۔

اگر کوئی ظالم سرمایہ دار یا وڈیرہ محتاج کا حق کفالت دبالے تو محتاج کیا کرے؟

اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ علماء کہتے ہیں جو شخص پیاسا ہو اور پیاس کی وجہ سے موت کا ڈر ہو تو اس پر فرض ہے کہ جس جگہ اور جس طرح سے پانی مل سکے پانی حاصل کر لے اگرچہ اس جدوجہد میں قتال کی نوبت ہی کیوں نہ آجائے، تو اب فرمائیے کہ یہ فرق کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو موت سے بچنے کے لیے پیاس بجھانے پر قتال تک کی اجازت دی جائے اور اسی شخص کو بھوک یا عریانی سے پیدا شدہ موت کے خوف سے بچنے کے لیے قتال کی ممانعت کر دی جائے، یہ بات تو اجماع کے خلاف قرآن و سنت اور قیاس سب ہی کے خلاف ہے (اور اگر قتال کی اجازت دی جائے تو یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اصل اصحاب مال کے مال پر یہ حق واجب تھا، جس کو حاجت مند شخص زبردستی حاصل کرنے کا مجاز ہے)۔

❷ میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس مثلاً اپنی حاجتِ اصلیہ سے زائد خورد و نوش کا سامان موجود ہے اور دوسرا شخص بھوک سے اس درجہ مضطرب ہے کہ موت طاری ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اس مضطر کو مردار یا خنزیر کھانا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کا حق ہے کہ زبردستی اس پر قبضہ کر کے بقدرِ حاجت استعمال کرے، خواہ وہ مال مسلمان کا ہو یا ذمی (غیر مسلم معاہد) کا اور یہ اس لیے کہ صاحبِ طعام پر فرض ہے کہ وہ بھوکے کو کھانا کھلائے، لہٰذا ایسی صورت میں اس حاجت مند کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خنزیر یا مردار کھانے پر مضطر ہو چکا ہے۔

بہرحال حاجت مند کے لیے درست ہے کہ وہ اس مال دار سے لڑ کر زبردستی ضرورت کی مقدار مال پر قبضہ کر لے، پس اگر اس نے قبضہ کر لیا تو سرمایہ دار مارنے

والے پر قصاص آئے گا اور اگر سرمایہ دار اس آویزش سے مارا گیا تو "الی لعنة اللّٰہ" (اللہ تعالیٰ کے پھٹکار کو پہنچا) اس لیے کہ اس نے اس حق کو ادا کرنے سے انکار کیا جو اس کے ذمہ فرض تھا اور اس صورت میں اس مالدار شخص کا حکم "طائفہ باغیہ" (باغی گروہ) کا حکم ہے، چنانچہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنۢ بَغَتۡ إِحۡدَىٰهُمَا عَلَى ٱلۡأُخۡرَىٰ فَقَٰتِلُواْ ٱلَّتِي تَبۡغِي حَتَّىٰ تَفِيٓءَ إِلَىٰٓ أَمۡرِ ٱللَّهِۚ﴾ (۱)

ترجمہ: اور اگر مسلمانوں میں سے ایک فریق دوسرے پر بغاوت کرے تو باغی فریق سے اس وقت تک جنگ کرتے رہو کہ وہ خدا کے حکم کی وفا پر آجائے۔

اور ظاہر ہے کہ صاحب حق کے مقابلے میں حق وفرض کا منکر باغی ہے، یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ میں جہاد کیا۔ و باللہ التوفیق (۲)

محلی کی اس عبارت کا بغور مطالعہ کیجئے اور پھر فیصلہ فرمائیے کہ اجتماعی نظام اقتصادی کی فلاح وسعادت کے لیے اسلام نے جن بنیادی حقوق کا اعلان کیا ہے اور نظام عمل میں جس طرح اس کی تشکیل کی ہے، عام بدحالی کے انسداد، طبقاتی جنگ کے سد باب اور رفاہیت عام کے لیے قیام کے لیے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور رفاہیتِ عمومی (Social Welfare) کے مدعی نظامہائے معاشی نے فلسفیانہ دلائل ونظریات کی روشنی میں جو حل تجویز کیا ہے، اسلام کا معاشی نظام کیا اس پر اس لیے برتری نہیں رکھتا کہ اس کے پیش کردہ حل میں نہ طبقاتی جنگ کے وجود پذیر ہونے کا اندیشہ ہے اور نہ دولت وغربت کے درمیان موجودہ تصادم کی صورت منصہ شہود پر آسکتی ہے۔

---

(۱) سورۃ الحجرات (۴۹): ۹

(۲) ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ: المحلی، ۱۵۶/۶، ۱۵۹

قانون وراثت:

مذموم سرمایہ داری اور "اکتناز" کی ایک بدترین شکل یہ ہے کہ دولت ایک جگہ جمع ہوتی رہے اور مرنے کے بعد بھی وہ ورثاء میں تقسیم نہ ہو بلکہ "اسٹیٹ" کی شکل میں ایک ہی جگہ محفوظ رہے، موجودہ زمانہ کے تعلقے اور ریاستیں اگر ورثاء میں تقسیم ہوتی رہتیں تو آج ایک تعلقہ بھی تعلقہ اور ایک ریاست بھی ریاست نظر نہ آتی بلکہ تقسیم ہو ہو کر دولت کے یہ خزانے ہزاروں، لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسانوں کے درمیان چلتی پھرتی چھاؤں کی طرح نظر آتے۔

"اسٹیٹ"(۱) اور تعلقہ کا یہ مذموم طریقہ جو سرمایہ داری کی اصل جڑ ہے اسلام

---

(۱) اس جگہ "اسٹیٹ" سے مراد خلافت (حکومت) نہیں ہے بلکہ تعلقہ داری یا زمینداری کی وہ سب سے اونچی شکل مراد ہے جو بااختیار حکومت کے ماتحت صرف اس لیے قائم ہے کہ اس کا رئیس بے روک ٹوک عیش پسند زندگی بسر کرے اور رعایا کی جان و مال کو اپنی ملکیت سمجھے اور اپنی ہر قسم کی مادی طاقت کو بالا طاقت کے لیے آلہ کار بنانے میں مجبور و مقہور ہو اور مرنے کے بعد اسلامی وراثت کے خلاف کسی ایک فرد خاندان کو تمام دولت کا مالک بنانے میں حکومتِ بالادست کے قانون یا خود ساختہ قانون کی رو سے مجبور ہو۔

(غالباً حضرت مصنف رحمہ اللہ جو یہاں اسٹیٹ (State) کا لفظ یا نام استعمال فرمایا ہے اس کی ان کی مراد ایمپائر (Empire) ہے "اسٹیٹ" سے جو انہوں نے مراد لیا ہے وہ سو فیصد وہی ہے جو ایمپائر (Empire) کی صورت میں قائم ہوتا ہے۔ دراصل ایک ملک کے اندر بڑی بڑی ایمپائرز وہاں قائم ہوتی رہتی ہیں جہاں یا تو حکومت نام کی کوئی چیز نہ ہو یا ہو تو سہی مگر کمزور ہو یا اس حکومت یا ملک کی بنیاد ہی ایسی ایمپائرز کے مالکان کے مفاد پر ہو یا ان مالکان کے سہارے پر قائم ہو۔ ایسے مالکان بڑے زمیندار (Land Lords) جاگیردار (Feudalists) بڑے بڑے کاروباری وڈیرے (Business Magnates)، دنیوی وجاہت والے بڑے گدی نشین اور قبائلی سردار (Tribal Chieftains) ہوتے ہیں، یہی مالکان تمام حکومتی اداروں —— بشمول قانون ساز اسمبلی اور کاروبارِ حکومت وغیرہ —— پر قابض ہوتے ہیں۔ تمام ملک کے غریب شہری —— جو عموماً ۸۰، ۹۰ فیصد ہوتے ہیں —— وہ ان کی رعایا اور ان کے دست نگر ہوتے ہیں۔ ایسے ممالک جہاں ایسا معاشی طریقہ کار رائج ہو وہاں ملک کے باسی دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں، ایک حصہ میں دولت کی ریل پیل اور اقتدار اپنے تمام حسین رنگوں کے ساتھ رقص کناں تو دوسری مفلسی و محتاجی کا دیو پابہ جولاں۔ ایسے معاشی رواجوں میں غریب کی عزت سربازار لٹتی رہتی ہے اور دادرس یا قانون اس کی ہمدردی میں حرکت میں نہیں آتا، وڈیرہ اس کی محتاجی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کی آبرو سے کھیلتا ہے، اسے غلام بنا کر رکھتا ہے اور اس کی انسانیت پائمال کرتا رہتا ہے اس کا معاشی استحصال کرتا ہے، اس کے تمام ذرائع پیدائش اور دولت پر قابض رہتا ہے۔

=

سے پہلے بھی دوسری قوموں میں رائج تھا، اور آج بھی دنیا کے اکثر حصوں میں رائج ہے اس لیے اسلام کے انقلابی پیغام نے دوسری اصلاحات کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اصلاح کا فیصلہ کیا اور اس قدیم طریقہ کو اقتصادی تباہی کا پیش خیمہ بتایا اور اس کو مٹا کر اس کی جگہ ''قانونِ وراثت'' کو قائم کیا۔

اسلام نے جب اس سسٹم کا اعلان کیا تو سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اس کے خلاف یہ نعرہ بلند کیا کہ اگر ''اسٹیٹ'' یا تعلقہ میں تقسیمِ وراثت کا یہ نظام جاری کر دیا جائے تو اس سے دولت و ثروت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تھوڑے ہی عرصے میں بڑی بڑی جائیدادیں تقسیم ہو کر چند کھیتوں کی صورت میں باقی رہ جائیں گی۔

اس وقت اگر ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ اسلام کا منشاء ہی یہ ہے کہ سرمایہ داری کا یہ نظام اس صورت میں باقی نہ رہے اور دولت تقسیم ہونے کے بجائے ''کنز'' بن کر مخصوص طبقہ میں محدود نہ ہو جائے تو دنیا کے لیے عجیب حیرت زا یا مضحکہ خیز معاملہ بن جاتا اور اس کو ظلم سے تعبیر کیا جاتا، لیکن زمانہ آیا کہ تقسیمِ دولت کے اس قانون کو رحمت سمجھا جانے لگا اور غیر مسلم اقوام نے بھی اس کو قانونی حیثیت دینے کی سعی

یہاں غریبوں کی غالب اکثریت (Over Whelming Majority) اپنی مرضی سے نہ اپنے عقیدہ کا دفاع کر سکتی ہے اور نہ اپنی رائے کا اظہار۔ اگر پاکستان میں ایسے معاشی رواج کا منحوس سایہ (Vicious Shadow) دیکھنا ہو تو بلوچستان کے قبائلی سرداروں کے زیر اثر علاقہ، سندھ کے مخدوموں اور وڈیروں اور پنجاب میں ملتان کے مخدوموں اور ڈیرہ غازی خاں میں بلوچ سرداروں کے علاقوں میں جا کر ملاحظہ کریں۔

حضرت مصنف رحمہ اللہ نے تو آج سے ۷۳، ۸۰ سال قبل ایک بدیشی غاصب برطانوی حکومت کے دور میں برصغیر پاک و ہند میں اس کے پروردہ (Adopted) اسٹیٹ مالکان یا ''ایمپائر'' قابضان کا ذکر کیا ہے وہ بدیشی غاصب انگریز چلا گیا مگر اس کے پروردہ یہ استحصالی گروہ جو زمینداروں، سرداروں، مخدوموں، میاؤں (Mians) اور سرمایہ داروں کے روپ میں ہے ـــــ آج بھی قائم ہے اور ملک کے معاشی وسائل پر قابض ہو کر غریبوں کی غالب اکثریت کا معاشی استحصال کر رہا ہے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تیری منتظر روزِ مکافات

شروع کر دی اور اب عقل و نقل (Wisdom & Narration) دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ دولت تقسیم کے لیے ہے، جمع کے لیے نہیں۔ بہرحال اسلام نے اس سلسلے میں تمام اقوام سے الگ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا اور قانونِ وراثت کے ذریعہ تقسیمِ دولت کی راہ کھول دی۔ (قرآن مجید میں ارشاد باری ہے):

❶ ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ ٱلْوَٰلِدَانِ وَٱلْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ ٱلْوَٰلِدَانِ وَٱلْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝٧﴾[1]

ترجمہ: مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ دیں اور عورتوں کا بھی اس (مال) میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ دیں تھوڑا ہو یا بہت اس میں (خدا کا) مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

❷ ﴿ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝١١﴾[2]

ترجمہ: تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے (ان کے متعلق) تم نہیں جانتے کہ تمہارے لیے ان میں سے کون نفع پہنچانے کے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو پابند کر دیا کہ اس کے دنیا سے رخصت ہونے والے اپنے اس دنیا میں زندہ رہنے والوں کو اپنا اندوختہ مال وراثت میں چھوڑیں اور وہ مال اس کے ورثاء میں شریعت اسلامی کی روشنی میں تقسیم ہو کر ارتکاز اور اکتناز دولت کا ذریعہ نہ بنے بلکہ منصفانہ تقسیم کا راستہ ہموار کرے)۔

عن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ

---

(۱) سورۃ النساء (٤) ۷

(۲) سورۃ النساء (٤): ۱۱

وسلم قال: اقسموا المال بین اهل الفرائض علی کتاب اللّٰه۔[1]

(۱) صحیح مسلم (اور ابو داؤد)، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض بأهلها.

اس حدیث مبارکہ میں جن "اهل الفرائض" (مقررہ حق والوں) کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی ترتیب تقسیمِ وراثت میں مندرجہ ذیل طریقہ پر ہوگی۔

❶ سب سے پہلے میت کے ترکہ سے اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات لیے جائیں گے۔

❷ اس کے بعد اگر اس میت کے ذمہ کسی کا قرض واجب الادا ہے تو وہ لیا جائے گا اگر قرض خواہ زیادہ ہوں تو سارے قرض کا مجموعہ نکالا جائے گا۔

❸ پھر اگر میت نے اللہ کریم کی رضا کی خاطر اپنے مال میں سے کچھ وصیت (Bequest) کی ہے جو ایک تہائی مال سے زیادہ نہ ہو۔۔۔۔ سے منہا کیا جائے گا۔

❹ مذکورہ بالا ادائیگیوں (Payments) کے بعد جو مال بچ جائے گا وہ ورثاء (Heirs) میں ان کے مقررہ شرعی حصص کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

ورثاء کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں:

(الف) ذوالفروض یعنی بیوی (اگر میت خاوند ہو) یا خاوند (اگر میت بیوی ہو)، والدین، اولاد (بیٹے بیٹیاں)

(ب) ذوالارحام (اگر ذوالفروض میں سے کوئی زندہ نہ ہو یا مفقود الخبر ہو یعنی اس کی موجودگی کی ایک زمانہ تک خبر ہی نہ ہو تو) حصہ دار ہوں گے ذوالارحام بھائیوں اور بہنوں پر مشتمل ہیں۔

(ج) اگر اللہ کریم نہ کرے، ذوالفروض اور ذوالارحام میں سے کوئی نہ ہو تو پھر دور کے (Remoter) رشتہ دار یعنی چچا، ماموں، پھوپھیاں، خالائیں، چچیرے بھائی، ماموں زاد وغیرہم۔ البتہ یہ یاد رہے کہ قاتل وارث نہیں بن سکتا، نہ کافر مسلمان کا، نہ مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہمارے لیے سند اور باعث کامیابی ہیں۔

❶ عن أسامه بن زید رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم. (متفق علیه، بخاری، کتاب الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر. مسلم: کتاب الفرائض)

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے۔

❷ عن ابی هریره رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه سلم: القاتل لا یرث. (جامع الترمذی، باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل. ابن ماجه، کتاب الفرائض)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قتل کرنے والا وارث نہیں ہوتا۔

لہٰذا اسلام کے اقتصادی نظام کی رو سے میت کی وراثت کی تقسیم کی مساوات یوں بنے گی۔

مساوات تقسیم وراثت: مجموعی وراثت ۔۔۔۔ کفن و دفن کے اخراجات ۔۔۔۔ قرض ۔۔۔۔ وصیت ۔۔۔۔ ورثاء =

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما راوی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن) کے مطابق اپنا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔

اسلامی قانونِ وراثت میں "تقسیمِ دولت" کا جو طریقہ ہے وہ ایسا معتدل اور مدبرانہ ہے کہ اگر صحیح طور پر اس کو اختیار کیا جائے اور سوسائٹی میں اس کا رواج عام ہو جائے تو نہ اس سے سرمایہ دارانہ دولت کے پیدا ہونے کا امکان باقی رہتا ہے کہ جس سے تعلقہ اور "اسٹیٹ" بنتے ہیں اور نہ افراد و اشخاص کے درمیان افلاس و فاقہ کشی (Poverty & Hunger) کو فروغ ہو سکتا ہے۔

کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس سے دولت کے سامان ہر وقت گردش میں رہتے ہیں اور ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں پہنچتے رہنے کی وجہ سے کم و بیش ہر ایک فرد کو فائدہ بخشتے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تقسیم وراثت پر تبصرہ:

مفکر اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [1] نے اس مسئلہ پر نہایت مفصل اور لطیف مقالہ حجۃ اللہ البالغہ میں "الفرائض" کے عنوان سے لکھا ہے جو قابل مراجعت ہے۔ اس مقالہ کی تمہید کے چند جملوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"غور کرو! بلاشبہ عقل و ہمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان یہ "طریقہ" لازمی اور ضروری ہونا چاہیے کہ اہلِ قبیلہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور درد مندی و بہی خواہی کا ثبوت دیں اور ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا ذاتی نفع و نقصان سمجھیں اور یہ بات ایسی خلقت اور جبلت (Instinct) کے بغیر ناممکن ہے جس کی پشت پر اس کو مضبوط بنانے کے لیے خارجی اسباب اور اس کو محفوظ رکھنے کے لیے

کا مقررہ شرعی حصہ۔ (ورثاء کی ترتیب انہی مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ہوگی)

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

سنتِ متوارثہ موجود ہو۔

جبلت ـــــ یہاں جبلت تو اس علاقہ کا نام ہے جو باپ اور بیٹے یا مثلاً بھائی بھائی کے درمیان موجود ہے اور اسی طرح وہ چند عزیزوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

اور اسباب خارجی، باہمی الفت و موادت، رہنمائی، غمگساری و ہمدردی وغیرہ کا نام ہے، کیونکہ یہ امور آپس میں محبت پیدا کرتے ہیں اور مصائب و آلام میں ایک دوسرے کی اعانت و نصرت کے لیے بہادر بناتے ہیں۔

سنت ـــــ اور سنت ان امور کو کہتے ہیں جن کو شریعت کی زبان لوگوں میں رشتۂ اخوت پیدا کرنے کے لیے ضروری قرار دیتی ہے اور اس کے نہ کرنے پر قابلِ ملامت ٹھہراتی ہے، مثلاً وہ حکم دیتی ہے کہ صلہ رحمی ضروری اور فرض ہے اور ایسا نہ کرنے والا آثم اور گنہگار ہے، مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض انسانی طبائع برے خیالات اور بیہودہ افکار کے پیچھے لگی رہتی ہیں اور صلۂ رحمی جیسے عمدہ اوصاف کے خلاف بغاوت کرتی ہیں تو بہت سے غیر ضروری کام کرنے پر آمادہ رہتی ہیں۔

تو ایسی حالت میں ایک بات کی ضرورت ہوئی کہ اس قسم کے (اخلاقی) امور کو ضروری قرار دیا جائے اور لوگوں کے قبول و انکار سے بالا تر ہو کر ان پر لازم کر دیا جائے، مثلاً عیادتِ مریض، مصیبت زدہ (مقروض اسیر وغیرہ) کی گلو خلاصی، دیت (اقرباء پر پڑے ہوئے تاوان کی ادائگی) اپنے ذی رحم محرم کی غلامی سے نجات دلانا وغیرہ اور اس قسم کی معاونت و نصرت کا سب سے زیادہ استحقاق اس وقت ہو جاتا ہے جب انسان موت کے کنارے کھڑا ہو اور مال سے بے پرواہ ہو جائے اس لیے کہ ایسے وقت میں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مال کو اپنے

ذاتی معاشرتی اور منزلی مفید کاموں پر زیادہ سے زیادہ صرف کرے اور یا
پھر اپنی موت کے بعد اپنے اقرباء کے لیے چھوڑ جائے اور اس طرح ان
کی اعانت و مدد کرے۔ بہرحال تقسیمِ دولت کا یہ ایک بہترین طریقہ
ہے۔"(۱)

موجودہ مسلمانوں کی حالت زار:

لیکن اسلام کے عادلانہ قانون کے خلاف خود مسلمانوں کی کیا روش ہے اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو مسلم تعلقہ داروں اور ریاست کے نوابوں کے اس مظہر کو دیکھئے جبکہ وہ عدالتوں میں کھڑے ہو کر بے محابا اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم کو قرآنِ عزیز کے بتائے ہوئے قانونِ وراثت کی ضرورت نہیں ہے، ہم تو اپنے املاک کے فیصلے رسم و رواج کے اصولوں پر کرانا چاہتے ہیں، یعنی انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانینِ تحفظ ریاست اور ہندوؤں کے قانون "عدم توریثِ ریاست" کو مانتے ہیں، اور "العیاذ باللہ" اسلام کے قانون توریثِ وراثت کو تسلیم کرنے سے بیزار ہیں۔
پنجاب، بمبئی، گجرات اور مختلف صوبوں کی ان عدالتی شہادتوں کے ریکارڈ کو اگر مطالعہ کیجیے گا جن میں مذکورہ بالا مطالبہ موجود ہے تو بے اختیار کہنا پڑے گا کہ:

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ ٱلْكِتَٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾ (۲)

ترجمہ: (ان یہود کی یہ خصلت ہے) یہ کتاب اللہ کے بعض حصوں پر تو
ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔
کا مظاہرہ اس سے بڑھ کر نا ممکن ہے، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱدْخُلُوا۟ فِى ٱلسِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا۟ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَٰنِ﴾ (۳)

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، باب الفرائض، ص ۱۱۷

(۲) سورۃ البقرہ (۲): ۸۵

(۳) سورۃ البقرہ (۲): ۲۰۸

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر چلنے کی سعی نہ کرو۔

خلاصۂ بحث:

انفرادی ملکیت کے بعض اور اہم جزئیات بھی ہیں جو اقتصادی نظام میں قابلِ غور ہیں مگر ہمارا مقصد تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہے بلکہ اصولی خاکہ پیش کرنا ہے اس لیے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ اسلام نے ایک جانب تو انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا اور دوسری جانب اس میں ایسی شرائط و حدود لگا دیں کہ کسی وقت بھی یہ انفرادی ملکیت اجتماعی معیشت کے لیے باعثِ تباہی و بربادی نہ ہو سکے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجیے کہ اس نے فطری اور نیچرل تفاوتِ مالی (Natural Financial Difference) کو انسانوں میں تسلیم تو کیا ہے، مگر سرمایہ داری کی اس زندگی کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جو سرمایہ کو مخصوص افراد یا گروہ میں جمع کر کے باقی عام مخلوقِ خدا کی اقتصادی تباہی کا باعث بنتی اور انسانوں کو انسانوں پر آقائی اور خداوندی کا حق دیتی ہے۔

وہ یہ تو جائز رکھتا ہے کہ آمدنی اور ذرائع آمدنی کے مختلف شعبوں میں اشخاص و افراد کو حقِ ملکیت حاصل ہو جائے، لیکن اس کو حرام قرار دیتا ہے کہ کوئی بھی انفرادیت کا شعبہ اجتماعی بدحالی کا سبب بن سکے گا، گویا وہ انسانوں کے لیے قدرِ مشترک کے طور پر ایک عادلانہ زندگی کا خواہاں ہے، نہ افراد کی راہ اس کو پسند ہے کہ سرمایہ داری فروغ پا جائے اور نہ تفریط کا راستہ اس کو بھاتا ہے کہ افراد کی ذاتی آمدنی و ذرائع پر بالکل ہی قفل ڈال دیئے جائیں۔

یا یہ کہہ دیجیے کہ اسلام اس فطری نظام (Natural System) کا حامی ہے جو ایسی

مساوات (Equation) تسلیم کرتا ہے جس میں تمام انسان بغیر کسی فرق کے اپنی معاشی زندگی میں بالکل مساوی ہوں اور ان کے درمیان "مالی درجات" (Financial Gradation) کا ادنی سا بھی تفاوت نہ پایا جاتا ہو اور نہ ایسے ظالمانہ تفاوت کا قائل ہے جس میں غربت و امارت کا امتیاز اس طرح قائم ہو جائے کہ غریب نانِ شبینہ کو محتاج ہو اور امیر دولتِ قارون کا مالک بن جائے۔

باب — (۱۲)

حصۂ دوم کے شعبے

اخلاقی معاشی ذمہ داریاں

تعارف:

اسلام کے معاشی نظام میں حکومت پر براہِ راست جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا ذکر صفحاتِ گزشتہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے، اب مختصر طور پر بعض ان ذمہ داریوں کا تذکرہ بھی کر دینا مناسب ہے جو نظامِ اسلامی میں قانون کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ترغیب و تلقین (Inducement & Advice) اور اخلاقی خطابت (Ethical Address) کے ذریعہ پبلک کو ان کی جانب توجہ دلائی جاتی اور یہ ذہنیت پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے کہ افراد ملت میں سے ہر فرد کی زندگی جس طرح انفرادیت (Individuality) رکھتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس میں اجتماعیت (Collectivism & Society) کے فرد ہونے کی ذمہ داری عائد ہے اس لیے اس کو زندگی کے کسی ایک لمحہ میں بھی اپنی انفرادیت میں اس طرح گم نہ ہونا چاہیے کہ اجتماعیت کے فرد ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہیں وہ نذرِ تغافل ہو جائیں اور اس کی تمام مالی جد و جہد اور اس کی کامرانی جماعت کے افراد کی مالی ترقی کے لیے مفید و نافع ثابت ہو نہ کہ ضیق اور تنگی (Constraint & Narrowness) کا باعث۔

انفاق فی سبیل اللہ:

قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو اپنے خاص انداز میں ''انفاق فی سبیل اللہ

(Spending in the way of Allah) کانام بخشا ہے۔

﴿وَأَنفِقُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾ [1]

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

افرادِ ملت کے وہ تمام طریقے کہ جن سے ایک دوسرے کو کسی نہ کسی طرح مالی مدد مل سکتی ہے "انفاق" کی حدود میں شامل ہیں، چنانچہ یہ انفاق واجب بھی ہے جیسا کہ گزر چکا اور نفل (حقِ فاضل) (Right In Surplus) بھی ہے جو اس جگہ زیر بحث بھی ہے اور انفاق کی اس دوسری (قسم کو مزید دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے):

❶ پہلی قسم میں کسی حاجت مند کی مالی عطا (مدد) بھی انفاق کی ایک شکل ہے۔
(اس قسم کے انفاق کی فقہاء کرام اور مسلم معیشت دانوں نے یہ شکلیں تجویز کی ہیں:

(الف) صدقات نافلہ

(ب) وقف

(ج) وصیت

(د) ہبہ وغیرہا)

❷ (دوسری قسم میں) مالک بنائے بغیر منفعت کے خیال سے بے پرواہ اور یکسو ہو کر ضرورت مندوں کی مالی مدد کرنا بھی انفاق ہی کے شعبہ میں داخل (کیا گیا) ہے۔
اس قسم انفاق کی شکلیں یہ ہیں:

(الف) قرض حسنہ

(ب) عاریت

(ج) امانت وغیرہا۔

علم الاخلاق میں اس قسم کی اعانت و مدد کو "ایثار و قربانی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(ان تمام مذکورہ شکلوں کا تعارف آئندہ صفحات میں کرایا جارہا ہے)۔

---

(۱) القرآن الکریم، سورۃ البقرہ (۲):۱۹۵

انفاق فی سبیل اللہ کی پہلی قسم کی صورتیں:

صدقات نافلہ (Optional Charities):

اسلام کے معاشی نظام میں "انفرادی صدقات" (Individual Charities) کو بھی اہمیت حاصل ہے اور زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اسلام نے حاجت مندوں کی وقتی حاجت کے لیے انفرادی عطایا کو "عمل خیر" (Noble Deed) کہہ کر اس کے لیے ترغیب دی ہے اور دنیا و آخرت کے ثواب کو نعم البدل بتا کر قرآنِ عزیز اور احادیث نے اس کے متعلق جگہ جگہ برانگیختہ اور آمادہ کیا ہے[1] اور چونکہ اس کا

---

(۱) یہاں ان کثیر تعداد میں آیات اور احادیث میں سے صرف چند نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔
قرآن کریم میں اللہ کریم نے اس اہم موضوع کو ترغیب و تہدید دونوں انداز میں اجاگر فرمایا اور انداز اتنا دلکش کہ روئیں روئیں کو برانگیختہ کر دینے والا۔ آپ بھی پڑھئے:

❶ ﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ ٱللَّهِ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُواْ مِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَٰرَةً لَّن تَبُورَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٣٠﴾ ﴾ (سورۃ فاطر (۳۵):)

ترجمہ: یقیناً وہ لوگ جو اللہ کریم کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں بطور رزق دے رکھا ہے، اس میں سے وہ کھلے چھپے خرچ کرتے ہیں، دراصل وہ ایسی تجارت کے طلب گار ہیں جس میں گھاٹے کا تو امکان ہی نہیں۔ ان کے ہی اعمال کا نتیجہ ہے کہ (اللہ کریم) انہیں پورا پورا بدلہ دے اور اپنی خصوصی مہربانی سے انہیں اس کے علاوہ مزید انعام سے بھی نوازے، یقیناً وہ (قادر کریم) خطاؤں کو بخش دینے والا، قدر شناس ہے۔

❷ ﴿ وَبَشِّرِ ٱلْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَٱلصَّٰبِرِينَ عَلَىٰ مَآ أَصَابَهُمْ وَٱلْمُقِيمِى ٱلصَّلَوٰةِ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾ ﴾ (سورۃ الحج (۲۲):۳۴،۳۵)

ترجمہ: اور سر افگندہ لوگوں کو خوشخبری دیجئے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کریم کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل فرطِ خشیت سے پھڑک اٹھتے ہیں، جو انہیں تکلیف پہنچتی ہے اس پر صبر کر لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے انہیں بطور رزق دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

❸ ﴿ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ ٱلْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِىَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾ ﴾ (سورۃ السجدۃ (۳۲): ۱۶،۱۷)

ترجمہ: ان (مخلص بندوں) کے پہلو (رات تہجد کے لیے) خواب گاہوں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں وہ اپنے

پروردگار کو خوف اور امید کے ملے جلے جذبات سے پکارتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق کے طور پر دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ کوئی بھی اس راز کو نہیں جانتا کہ ایسے لوگوں کے لیے (پردہ غیب میں) آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پوشیدہ ہے ان کے اعمال کے بدلہ میں جو وہ کیا کرتے تھے۔

ایسی خوش خبری دینے والے، اور وجد ان پر گہرا اثر چھوڑنے والے ارشادات الٰہیہ کا اثر تھا جس نے مومنین کو ایسا بنا دیا جس کی خبر قرآن نے دی۔

❹ ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (سورۃ الحشر (۵۹):۹)

ترجمہ: اور وہ (سچے مومنین اور مخلص بندے) تو ہیں ہی ایسے کہ اپنی ذات پر دوسرے (محتاجوں) کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ خود کتنی تنگدستی اور فاقہ کشی کا شکار ہوں۔

اب نمونہ کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سن لیجئے، اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کا اندازہ کرتے جائیے۔

❶ عن ابی هريرة رضی الله تعالىٰ عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: انفق يا ابن آدم، ينفق عليك. (متفق عليه، رياض الصالحين، باب الكرم والجود والأنفاق الخ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے آدم کے بیٹے (انسان) (اللہ کریم کی راہ میں محتاجوں پر) خرچ کر (قدردانی کے طور پر) تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔

❷ عن إبن مسعود رضی الله تعالىٰ عنهما عن النبی صلى الله عليه وسلم قال: ولا حسد إلا فی اثنين: رجل آتاه الله مالا فسلطه على هلكته فی الحق، ورجل آتاه الله حكمة فهو يقضی بها ويعلمها. (متفق عليه، رياض الصالحين، حواله بالا)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: دو بندوں کے سوا کسی پر رشک کرنا نہیں چاہیے: ایک وہ جسے اللہ کریم نے مال عطا فرمایا پھر اسے حق کی راہ میں خرچ کرنے پر لگا دیا، دوسرا وہ جسے اللہ کریم نے حکمت (دانائی) عطا فرمائی، پھر وہ اس دانائی سے فیصلہ کرے اور اسے آگے سکھائے بھی۔

❸ عن ابی هريرة رضی الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه سلم: ما من يوم يصبح العباد فيه إلا ملكان ينزلان فيقول أحدهما: أللهم إعط منفقا خلفا، ويقول الآخر: أللهم إعط ممسكا تلفا. (متفق عليه، رياض الصالحين، حواله بالا)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی دن صبح نہیں ہوئی مگر اس میں (آسمان سے) دو فرشتے نازل ہوتے ہیں: ان میں کا ایک کہتا ہے: اے اللہ کریم! (تیری راہ میں محتاجوں پر خرچ کرنے والے کو اور دے، دوسرا دعا کرتا ہے: اے اللہ کریم! روک رکھنے والے (بخیل) کو تباہی دے۔

❹ عن أبی أمامة صدی بن عجلان رضی الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه

تعلق انفرادی عطاء سے ہے اور یہ اخلاق حسنہ اور اعمال فاضلہ (Good Actions) کی ایک کڑی ہے اس لیے اس میں دو اخلاقی خطرات کے پیش آجانے کا اندیشہ تھا:

❶ ایک یہ کہ معطی (Granter - Grantor) اپنی عطا کا احسان جتانے اور حاجت مند کو نادم اور شرم سار کر کے اس کو اذیت پہنچائے۔

❷ دوسرے یہ کہ اس کا یہ انفاق رضائے الٰہی اور غرباء کے لیے حاجت روائی کے لیے نہ ہو بلکہ دکھاوے اور نمائش کے لیے ہو، چنانچہ ان دونوں کے انسداد کے لیے نفس امارہ (Self inclined to evil) کی زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) اور انانیت و خودی (Selfness & Egotism) پر تہدید (Warning) کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُبۡطِلُواْ صَدَقَٰتِكُم بِٱلۡمَنِّ وَٱلۡأَذَىٰ كَٱلَّذِي يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۖ ﴾[1]

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات و خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر ضائع مت کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر یقین رکھتا ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔

اوقاف (Endowments):

انفاق فی سبیل اللہ کے اخلاقی وسائل میں سے ایک بہترین وسیلہ (Best Mean)

وسلم: يا إبن آدم! إنك أن تبذل الفضل خير لك، وإن تمسكه شر لك، ولا تلام على كفاف، وابداء بمن تعول واليد العليا خير من اليد السفلى. (رواه مسلم، رياض الصالحين، حواله بالا)

ترجمہ: حضرت ابو امامہ صدی بن عجلان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے آدم کے بیٹے (یعنی انسان)! اگر تو ضرورت سے زائد مال (اللہ کریم کی راہ میں) خرچ کر دے تو بہتر ہے۔ اور اگر تو اسے روکے رکھے تو تیرے (دنیوی معاش اور آخرت دونوں کے) لیے برا ہے، البتہ بقدر ضرورت روک رکھنے میں حرج نہیں، اور (جب خرچ کرنے لگو تو) اس سے شروع کرو، جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہو۔ اور (یاد رکھو!) دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

(۱) سورة البقرہ (۲): ۲٦٤

وقف بھی ہے۔ اس لیے اسلام کے معاشی نظام نے اس کے اجراء اور توسیع کے لیے بہت زیادہ ترغیب دی ہے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے اس کو مستحکم اور مضبوط بنادیا ہے۔

اربابِ ثروت (The Rich) کی شبانہ روز زندگی کا یہ نقشہ ہمارے سامنے ہے کہ ایک شخص اپنی پیدا کی ہوئی یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کو اگرچہ اپنی ضروریات سے فاضل سمجھتا ہے پھر بھی دولت کی محبت اور سرمایہ کی فراہمی کا عشق اکثر و بیشتر اس کو حاجت مندوں کی اعانت اور جماعت کے غریب افراد کی امداد کی جانب کسی طرح متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ لیکن جب اس کا آخری وقت آتا ہے اور وہ موت کے فولادی پنجہ (Steely Clutch) کی گرفت میں آکر مغلوب ہو جاتا ہے تو باحسرت و یاس اس دولت سے منہ موڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مگر اس صبح و شام پیش آنے والے منظر کے باوجود دولت میں سرشار دولت مندوں کو وقت سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں آتا اور یتامی، بیوگان اور دوسرے حاجت مندوں کی فریادیں اس کی ہوس کے مستحکم قلعوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اس لیے اسلام اہل ثروت کے اجتماعی حقوق سے تغافل کو دور کرنے اور جذبات عالیہ اور اخلاقِ حسنہ کی روح پیدا کرنے کے لیے توجہ دلاتا ہے کہ اہل ثروت کی فاضل دولت کو کارِ خیر میں صرف کرنے اور اجتماعی حیات کو فروغ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آنے سے قبل بحالتِ صحت و تندرستی اور بقاء ہوش و حواس اپنی دولت کا ایک حصہ ''صدقہ جاریہ'' (Continuous Charity) کردے اسی کا نام ''وقف'' ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز میں اس قسم کے انفاق اور اجتماعی افادیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿لَن تَنَالُوا۟ ٱلْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا۟ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (۱)

---

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۹۲

ترجمہ: تم ہرگز خیر اور بھلائی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک (خدا کی راہ میں) اس چیز کو خرچ نہ کر دو جو تمہارے لیے سب سے پیاری اور محبوب ہے۔

اور داعیٔ انقلاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کی تشریح اس طرح فرمائی:

عن ابی هريرة رضی الله تعالٰی عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم، قال: إذا مات الإنسان إنقطع عنه عمله، إلا من ثلثة، صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے تمام عمل ختم ہو جاتے ہیں مگر تین مُستثنیٰ ہیں: ایک "صدقہ جاریہ" دوسرا "علم نافع" اور تیسرا "نیک اولاد" جو اس کے لیے ہر وقت دعا گو رہے۔[2]

---

(۱) مسلم، صحيح ج ۲ كتاب الوصية، باب ما يلحق الانسان من الثواب بعد وفاته. نسائی: السنن، ج ۲، كتاب الوصايا، باب فضل الصدقة عن الميت

(۲) ایک دوسری حدیث میں نبی الرحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف بننے والے اموال و اشیاء اور جاری ثواب کا ذریعہ بننے والے اعمال و افعال کی فہرست میں اضافہ فرمایا تاکہ امت کے نیکو کاروں کو کوتاہ اعمال والوں کو زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کی خوشخبری اور حوصلہ و امید سے آس دلائی جائے۔

عن أبي هريرة رضي الله تعالٰی عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أن مما يلحق المؤمن من عمله حسناته بعد موته: علما علمه ونشره، وولدا صالحا تركه، ومصحفا ورثه، أو مسجداً بناه أو بيتا لابن السبيل بناه، أو نهرا أكراه، أو صدقة أخرجها من ماله في صحة حياته تلحقه من بعد موته. (رواه ابن ماجه)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن بندہ کو موت کے بعد جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب ملتا رہتا ہے ان میں شامل ہیں:

1. علم جو کسی کو سکھایا ہو اور اس کی اشاعت کی ہو۔
2. صالح اولاد جسے وہ (تربیت کر کے) چھوڑ گیا ہو۔
3. قرآن مجید جو میراث میں (پڑھ کر کتاب کی صورت میں یا اولاد کو پڑھایا پڑھوا کر) چھوڑ گیا ہو۔

=

صدقۂ جاریہ کی جس قدر جزئیات علمائے اسلام نے شمار کرائی ہیں ان سب میں "وقف" اعلیٰ اور مقدم ہے اور اسی لیے سب سے پہلے متمول صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس ترغیب پر لبیک کہا اور اپنی ملکیت کو وقف کر کے خدا کی ملک بنایا۔

اس سلسلہ میں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقف کا واقعہ تمام محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی کتب احادیث میں نقل کیا ہے۔ آیئے امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت کردہ حدیث پڑھتے ہیں:

(عن أنس رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: كان أبو طلحه رضی اللّٰه تعالٰی عنه أكثر الأنصار رضی اللّٰه تعالٰی عنهم بالمدینة مالا من نخل، وكان أحب أمواله إلیه بیرحاء، وكانت مستقبلة المسجد وكان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یدخلها و یشرب من ماء فیها طیب. قال انس رضی اللّٰه تعالٰی عنه: فلما انزلت هذه الایة: ﴿لَن تَنَالُواْ ٱلۡبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾"[1]

قام أبو طلحة رضی اللّٰه تعالٰی عنه إلی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، فقال: یا رسول اللّٰه! أن اللّٰه تعالٰی یقول: ﴿لَن تَنَالُواْ ٱلۡبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ وأن أحب مالی إلیّ بیرحاء وأنّها صدقة! اللّٰه تعالٰی اجرو برها وذخرها عند اللّٰه. فضعها یا رسول اللّٰه! حیث أراك اللّٰه الخ.)[2]

---

❹ مسجد یا مسافر خانہ (فقیر اور محتاج مسافروں کے لیے) بنا کر چھوڑ گیا ہو۔

❺ نہر جو جاری کر یا کرا گیا ہو۔

❻ اپنے مال میں سے ایسا صدقہ جس کو اپنی زندگی اور صحت میں کر گیا ہو۔

مرنے کے بعد ان کا ثواب اس (خوش نصیب) کو ملتا رہے گا۔ (اللهم اجعلنا منه)

(۱) سورة آل عمران (۳): ۹۲

(۲) صحیح الامام البخاری، کتاب الزکاة، باب الزکاة علی الأقارب، کتاب الوصایا، باب من تصدق إلی وکیله الخ. ترمذی، کتاب الوقف. ریاض الصالحین، باب الإنفاق مما یحب ومن الجید

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کے انصاریوں رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سب سے زیادہ مالدار تھے اور ان کا سب سے زیادہ محبوب مال بیر حا تھا (کھجوروں کا باغ) جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب اور سامنے تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جاتے اور وہاں کا شیریں پانی پیتے، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَن تَنَالُواْ ٱلۡبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَۚ﴾ تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یہ فرماتا ہے اور میں اپنے مال میں سب سے زیادہ محبوب بیر حا کو سمجھتا ہوں اور آج سے یہ اللہ کے نام صدقہ ہے (وقف ہے) میں خدا تعالیٰ کے اجر اور اس کے ذخیرۂ خیر کا طالب ہوں، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختار ہیں جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں۔

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کے اقرباء واعزاء میں اس کی آمدنی کو وقف کر دیا، اسی طرح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارض خیبر کی "جاگیر" کو جو ان کے حصہ میں آئی تھی، اللہ کے نام پر وقف کر دیا تھا۔

محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی کتبِ احادیث میں اس وقف کو مختلف عنادین —— مثلاً الوقف، العطایا، الصدقۃ الجاریۃ وغیرہ —— کے تحت ذکر کیا ہے مگر حدیث کا متن تمام محدثین کے ہاں ایک ہی ہے۔ آیئے پہلے پورا متن پھر اس کا ترجمہ پڑھ لیتے ہیں:

(عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه ان عمر رضی اللّٰہ عنه اصاب أرضا بخيبر، فاتى النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: يا رسول اللّٰه (صلى اللّٰه عليه وسلم)! أنى أصبت أرضا بخيبر، لم أصب مالا قط أنفس عندى منه، فما تأمر نى به؟ قال: إن شئت

حبثت أصلها وتصدقت بها، فتصدق بها عمر رضی الله تعالٰی عنه، أنه لا یباع أصلها، ولا یوهب، ولا یورث وتصدق بها فی الفقراء وفی القربٰی وفی الرقاب وفی سبیل اللّٰہ وابن السبیل، والضیف لا جناح علی من ولیها ان یأکل منها بالمعروف أو یطعم غیر متمول.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں: (میرے والد) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر (کے اموالِ غنیمت) سے ایک زمین بطور جاگیر ملی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: مجھے خیبر (کے غنائم) سے زمین ملی ہے، اور میرے پاس اس سے عمدہ مال آج تک نہیں آیا (اور عمدہ مال تو اللہ کریم کی رضا کے لیے خرچ ہونا چاہیے) اب آپ مجھے کیا حکم فرمانا چاہیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر چاہو تو اصل زمین باقی اور (اس کے ثمرات اور پیداوار سے اللہ کریم کی راہ میں) صدقہ کرتے رہو۔)
پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو صدقہ (وقف) کر دیا اس شرط کے ساتھ کہ اس زمین کو نہ خرید و فروخت کیا جائے، نہ وراثت اس میں جاری ہو اور نہ ہبہ کیا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو فقراء، اقرباء، غلاموں کی آزادی کارہائے خیر اور مسافروں اور مہمانوں کے لیے وقف کر دیا اور یہ بھی تصریح کر دی کہ جو اس کا متولی ہو وہ اس سے مناسب طور پر اپنا روزینہ لے سکتا ہے اور ذخیرہ کیے بغیر اپنے دوست کو بھی مناسب طریق پر کھلا سکتا ہے۔[2]

---

(۱) متفق علیه، مشکوۃ المصابیح باب العطایا، فصل اول - ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۷ء: ص ۲۷۲

(۲) صحیح بخاری، کتاب الوصایا، باب الوقف کیف یکتب. صحیح مسلم اور جامع

وقف کی تعریف:

وقف کی صحیح تعریف یہی ہے جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ میں مذکور ہے یعنی جو جائداد یا کوئی شے خدا کے نام پر وقف ہو اس کی آمدنی فقراء مساکین، مسافر قرض خواہوں ذوی القربیٰ، یتامیٰ وغیرہ پر صرف کی جائے اور اس کو نہ کوئی فروخت کر سکتا ہے نہ ہبہ کر سکتا ہے اور نہ وہ واقف کے ورثاء میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

قوانین وقف:

❶ وقف اگر جائداد اور اراضی کی شکل میں ہے تو وہ "خلیفہ" اور حاکم کے ان تصرفات اور مداخلت سے آزاد رہتا ہے جو مصالح وقف کے خلاف ہوں جو دوسری قسم کی اراضی میں عموماً جائز سمجھے جاتے ہیں اس لیے بغیر مصالح وقف کے اس میں تبدیلی درست ہے اور نہ اس پر کوئی ایسا عمل کیا جا سکتا ہے جو اس کی آمدنی اور ذرائع آمدنی میں کمی کا باعث ہو یا اس کو تباہ و برباد کرنے کا موجب ہو۔

❷ وقف میں سب سے زیادہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ واقف کی بیان کردہ جائز اغراض کو شریعت کے صاف اور صریح احکام کی طرح پورا کرنا ازبس ضروری ہے۔ البتہ عرف عام بعض اوقات کسی حکم عام (General Rule) میں تخصیص (Specification) پیدا کر سکتا ہے۔

❸ بہرحال لگان و مالگذاری کے طے شدہ مالیہ کے علاوہ وقف کی اصلاح و مصالح سے الگ اس پر مزید ٹیکس لگانے اور باعث نقصان قیود و عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اس لیے کہ وہ کسی ذاتی (پراپرٹی) یا شخصی ملکیت نہیں رہتا بلکہ "رفاہ عامہ" (Commen Weal) کا ایک قائم و دائم سرمایہ بن جاتا ہے۔[1]

ترمذی میں کتاب الوقف. ابن عابدین: الدر المختار، ج ۳، کتاب الوقف. شیخ منصور علی ناشف رحمہ اللہ تعالیٰ: التاج الجامع الاصول، ۲/ ۲۷۳

(۱) ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: ردالمحتار، ج ۳، کتاب الوقف. جامع الفصول: ۲/ ۱۷۷

اقسام وقف:

وقف کی دو قسمیں ہیں، ایک وقف اہلی (وقف علی الاولاد) (Endowment for Family's Welfare) اور دوسری وقف خیری (وقف علی الخیر (Endowment for Commen Welfare) وقف اہل یعنی وقف علی الاولاد میں، اولاد و اقرباء کے نام بھی وقف ہوتا ہے اور ساتھ ہی امور خیر کے لیے بھی اور وقف خیری میں صرف امور خیر ہی کے لیے وقف کیا جاتا ہے، بہرحال وقف میں تابید (Perpetuity) شرط ہے۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقف (وقف اہلی (Endowment for the endower's in laws) میں شمار کیا گیا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقف، وقف علی الخیر (Endowment for common Welfare) کی قسم میں رکھا گیا۔[2]

لیکن قانونِ وقف میں یہ سب اقسام بحیثیت وقف ایک ہی حکم رکھتی ہیں، البتہ وقف علی الاولاد میں آمدنی وقف جب افرادِ اہلی میں تقسیم ہو جائے تو اس پر ٹیکس اور مزید محصولات کی وہ تمام قیود اور پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں جو ذاتی املاک رکھنے والوں پر عائد ہوتی ہیں۔

ہبہ (Gift):

مقصد و مدعا:

اجتماعی معاشی نظام میں ہبہ بھی ایک مفید طریقِ کار ہے بشرطیکہ واہب (Grantor) کا مقصد نیک ہو اور حقوق اللہ (زکوٰۃ و صدقات) اور حقوقِ عباد (دوسرے انسانوں کے عائد شدہ حقوق) میں سے کسی کی حق تلفی پیشِ نظر نہ ہو۔ اس لیے اس کی افادیت کی شکل یہ ہے کہ ایک متمول شخص اگر اپنے ذاتی حقوق اور اجتماعی حقوق سے سبکدوشی کے بعد بھی فاضل (Surplus) مال پاتا ہے تو اس کے لیے یہ مناسب ہے

---

(۱) یعنی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو، خاص وقت میں محدود نہ ہو۔

(۲) ناشف، شیخ منصور علی: التاج الجامع الاصول، ۷۳/۲

کہ وہ اس فاضل پونجی (Surplus Possession) کو حاجت مندوں کی حاجت میں صرف کرے اور اخلاقی راہ سے بھی اجتماعی خدمت سے منہ نہ موڑے اور اس ''انفاق'' (Spending) کی جہاں اور مختلف راہیں ہیں ان میں سے ایک راہ یہ ہے کہ وہ نقد یا مال کسی ضرورت مند کو ہبہ کر دے۔

قانونِ ہبہ میں اگرچہ فقیر یا حاجت مند کی شرط نہیں بلکہ غنی اور مالدار کے نام بھی ہبہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کے معاشی نظام میں ہماری بحث ہبہ کی صرف اسی شق کے ساتھ محدود ہے، جس کا تعلق غرباء اور اہلِ حاجت کی غربت و حاجت کے انسداد سے ہے [1]، حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہبہ کی ترغیب دیتے

---

(۱) پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہدیہ —— جو معاشی دکھوں کے ماروں کی معاشی مشکلات کا مداوہ یا کم از کم کرنے میں مددگار ہو —— کو واپس لے لینے اور اس معاشی مدد کو اگرچہ کم ہی ہو، کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے سختی سے منع فرمادیا۔

عن إبن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: العائد فی هبة کالکلب یعود فی قیئه، لیس لنا مثل السوء. (صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب لا یحل لاحد أن یرجع فی هبته. صحیح مسلم، کتاب الهبات، باب تحریم الرجوع فی الصدقة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے (کسی کو دیئے گئے) ہبہ کو واپس لینے والا اس کتا کی طرح ہے جو اپنی کی ہوئی قے کو چاٹ لیتا ہے، ہم مسلمانوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم ایسی بری مثال کے مشابہ قرار دیئے جائیں (یعنی اپنا دیا ہوا ہبہ ہرگز واپس نہ لیں)۔

گویا یہ مسلمان کی —— نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کے شرف کی وجہ سے —— عظمت کے خلاف ہے کہ کسی محتاج کو ہبہ دے کر اور اس کا معاشی ذریعہ بنا کر بھی واپس لے لیں۔ البتہ فقہاء احناف کے نزدیک باپ اپنے بیٹے کو کیا ہوا ہبہ —— اس کی کسی گستاخی یا دیگر اولاد میں انصاف قائم رکھنے کے لیے —— واپس لے سکتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دوسرا ارشاد ہے:

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یرجع أحد فی هبته إلا الوالد من ولده. (النسائی، کتاب الهبة، باب رجوع الوالد فیما یعطی ولده. ابن ماجه، کتاب الهبات، باب من اعطی ولده ثم رجع فیه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہوئے یہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ ہدیہ اور ہبہ کی عادت ڈالو کہ یہ رسم باہمی محبت و مؤدت کے قیام و استحکام (Strengthning) کے لیے ازبس مفید ہے ارشاد مبارک ہے:

(عن عائشة رضی اللّٰہ تعالٰی عنها، عن النبی صلی اللّٰہ علیہ

کوئی شخص اپنا دیا ہوا ہبہ واپس نہ لے، البتہ باپ بیٹے سے واپس لے سکتا ہے۔

مذکورہ دونوں ارشادات نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہدیہ دینے والا ایسا کریم النفس انسان ہو جو دے کر پچھتائے نہ اور واپس لینے کے لیے للچائے نہ۔ کیونکہ ہمارے موضوع کی رو سے کسی کا معاشی وسیلہ —— اگرچہ وہ کتنا عارضی اور کم کیوں نہ ہو بنانے کے بعد اسے واپس لے کر اس محتاج کو مزید پریشان کرنا اخلاقی اور دینی دونوں اعتبار سے بہت ہی برا ہے کہ اسے کتے کی قے اور پھر اسے چاٹ لینے کے مترادف قرار دیا گیا۔

ان ارشادات میں ایک اور لطیف اشارہ اور اعلیٰ نفسیاتی درس بھی پوشیدہ ہے کہ ایسے کم ظرف کا ہدیہ ہی قبول نہ کیا جائے جس سے دے کر واپس لینے کی توقع ہو یا سابقہ تجربہ سے اس کی کم ظرفی کا علم ہو، کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ایک واقعہ اسی کی طرف مشیر ہے:

عن أبی هريرة رضی اللّٰہ عنه أن أعرابيا أهدی لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ عليه وسلم بكرة فعرضه (فعوضه) منها ست بكرات. فتسخط. فبلغ ذلك النبی صلی اللّٰہ عليه وسلم، فحمد اللّٰہ واثنی عليه ثم قال: أن فلانا أهدی إلی ناقه، فعوضته منها ست بكرات، فظل ساخطا. لقد همت أن لا أقبل هدية إلا من قرشی أو انصاری أو ثقفی أو دوسی. (ابوداود، كتاب البيوع، باب فی قبول الهدايا. نسائی: كتاب العمری، باب عطية المرأة. جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی مناق ثقيف)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ میں ایک اونٹنی پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قبول کر کے) بدلہ میں اسے چھ اونٹنیاں عنایت فرمائیں۔ مگر وہ پھر بھی رنجیدہ رہا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے پہلے اللہ کریم کی تعریف کی، اس کی پاکیزگی بیان کی، پھر فرمایا: مجھے فلاں شخص نے ایک اونٹنی ہدیہ میں دی، میں نے اس کے بدلہ میں اسے چھ اونٹنیاں دیں، مگر وہ پھر بھی ناخوش ہے اب (اس کے رویہ سے) میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ قریشی یا انصاری یا ثقفی یا دوسی کے سوا کسی کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا۔

قریشی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ سے تھے، انصاری سے مراد مدینہ منورہ کے انصار یا دفارضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں ثقفی قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھنے والا اور دوسی قبیلہ دوس کا فرد مراد ہے۔ یہ مذکورہ قبائل کرامۃ النفس، سخاوت، علو ظرف اور وسعت قلب میں اپنا نام رکھتے تھے، دراصل یہ وہی قبائل تھے جنہوں نے مشکل حالات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

وسلم قال): تهادوا تحابوا فان الهدية تذهب الضغائن.[۱]

ترجمہ: (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا): آپس میں ہدیہ لیا دیا کرو، اس طرح باہم محبت کی طرح ڈالو (کیونکہ ہدیہ (کا تبادلہ) دل کی کدورتیں مٹادیتا ہے۔)

تعریف:

فقہ اسلامی میں ہبہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے "کسی شے کو دوسرے کی ملکیت میں بغیر عوض کے دے دینا ہبہ کہلاتا ہے" اور حدیث صحیح میں اس کی حکمت "معاشی وسائل میں اضافہ" بتائی گئی ہے، ارشاد ہے:

(عن خالد بن علی الجهنی قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من بلغه عن أخیه معروف من غیر مسئلة ولا أشراف نفس فلیقبله ولا یرده، فأنما هو رزق ساقه الله عزوجل.[۲]

ترجمہ: حضرت خالد بن علی جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں:

---

(۱) ابو یعلی: مسند از جامع صغیر، ۱/۴۵۴. مشکوۃ المصابیح باب العطایا، فصل ثانی
امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کچھ اضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے:

عن ابی هریرة رضی الله تعالٰی عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: تهادوا، فان الهدیة تذهب وحر الصدر. ولا تحقرهن جارة لجارتها ولو بشق فرسن بشاة. (جامع الترمذی، ابواب الهبة والولاء، باب فی حث النبی صلی الله علیه وسلم علی التهادی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہدیہ دیا کرو۔ یقیناً ہدیہ (کا لینا دینا) سینہ کی کدورت دور کرتا ہے۔ لہٰذا کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی کے ہدیہ کو حقیر نہ جانے خواہ وہ بکری کے کھر کا ایک حصہ ہی ہو۔

(۲) سعدیات حصہ دوم ص ۱۳ النصف آخر۔ اسی مضمون کی ابوداد نے نقل کی ہے جیسا کہ مشکوۃ المصابیح، باب من لاتحلہ المسئلۃ ومن تحل لہ، الفصل الثالث میں آیا ہے۔ امام احمد: مسند، روایات خالد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن حبان، صحیح امام حاکم، الترغیب میں نقل کیا گیا ہے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:) اگر سوال اور انتظار کے بغیر ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مالی بھلائی کرتا ہے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے اور رد نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بہانہ سے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔

وصیت (Will):

مدعا:

وصیت بھی بظاہر ایسے امور میں سے ہے جن کے متعلق یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس کا بھی کوئی تعلق معاشی نظام سے ہو سکتا ہے لیکن اس کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بے شبہ اس کو بھی معاشی نظام میں ایک حد تک دخل ہے اور مفید دخل ہے۔

انسان اپنی زندگی کے لمحات میں موت کی حقیقت سے آگاہ ہونے اور مسلسل مشاہدہ کرتے رہنے کے باوجود اکثر حقوقِ واجبہ و نافلہ (Obligatory & Optional Rights) سے غافل رہتا ہے لیکن جب یقین یہ ہو جاتا ہے کہ پنجۂ موت نے دبالیا ہے تب اضطرابی کیفیت کے ساتھ تلاش کرتا ہے کہ کیا اب بھی مکافات (Compensation) کی کوئی شکل ممکن ہے، تو اسلامی قانون میں صرف ایک شکل نظر آتی ہے، جس کا نام وصیت ہے۔

تعریف اور شرائط:

اسلامی شریعت میں کسی شے کو یا اس کے منافع کو بہ طریق حسنِ سلوک یہ کہہ دینا یا لکھ دینا کہ میری موت کے بعد فلاں کے لیے ہے، وصیت کہلاتا ہے (شریعت مطہرہ نے اس اہم ذریعہ گردشِ دولت (Circulation of Wealth) اور انفاق فی سبیل اللہ کو چند اہم شرائط سے مشروط کیا ہے مثلاً)

❶ اب چونکہ مرنے والے کے مال میں ورثہ کا حق بھی ہو گیا ہے اس لیے شریعت

نے صرف ثلث (تہائی) میں وصیت کو جائز اور نافذ قرار دیا ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أوص بالثلث والثلث كثير.[1]

ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک تہائی کی وصیت کرو اور ایک تہائی حصہ بھی بہت زیادہ ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں اشارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکیمانہ نصیحت کی طرف ہے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مالدار، مگر سخی اور دنیا کی محبت پر آخرت کی کامیابی اور اللہ کریم کی رضا کو ترجیح دینے والے، صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمائی۔ سارا واقعہ انہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی سن لیجئے:

قال عادني رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأنا مريض. فقال: أوصيت؟ قلت: نعم. قال: بكم؟ قلت: بمالي كله في سبيل الله. قال فما تركت لولدك؟ قلت: هم اغنياء بخير. فقال: أوص بالعشر. مما زلت أنا قصه حتى قال (رسول الله صلى الله عليه وسلم): أوص بالثلث، والثلث كثير. إنك أن تدعو ورثتك اغنياء خير أن تدعهم عالة يتكففون الناس في أيديهم.[2]

ترجمہ: میں بیمار تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے میرے ہاں تشریف لائے، مجھ سے دریافت فرمایا: کیا تو نے وصیت کر دی ہے؟ میں نے جواب میں عرض کیا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کتنے (مال) میں؟ میں نے عرض کیا: میں نے اپنا سارا مال

---

(۱) صحيح بخاري، كتاب الوصايا، باب ان يترك ورثة اغنياء خير من ان يتكففوا الناس. الشوكاني: نيل الاوطار، ج ٦، كتاب الوصايا، باب ماجاء في كراهية مجاوزة الثلث والايصاء للوارث

(۲) رواه الترمذي كذا في مشكوة المصابيح، باب الوصايا، الفصل الثاني.

اللہ کریم کی راہ میں وصیت کر دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: تو نے اپنی اولاد کے لیے کیا چھوڑا؟ میں نے عرض کیا: وہ سارے امیر و تونگر ہیں، خوشحال ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: (مال کا) دسواں (۱۰واں) حصہ وصیت کر دو۔ میں اس (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دسواں حصہ وصیت میں دینے کے حکم) کو برابر تھوڑا کہتا رہا، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (تیسرا حصہ وصیت دینے میں آمادہ ہوئے تو آپ) نے فرمایا: بس تیسرے حصہ میں وصیت جاری کر دو، اور تیسرا حصہ بھی بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اگر تم اپنے ورثہ کو غنی چھوڑو، یہ تمہارے لیے اس لیے بہتر ہے کہ انہیں مفلس چھوڑو کہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔)

۴ اور اس کے علاوہ بھی اور شرائط مقرر فرمادی ہیں مثلاً:

لا وصية لوارث.[1]

ترجمہ: وارث کے لیے وصیت درست نہیں۔

اس لیے کہ وہ بحیثیت وراثت حقدار ہے تو اب اس کا وصیت کرنا گویا دوسرے ورثہ کی حق تلفی کرنا ہے مثلاً:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. الاضرار في الوصية من الكبائر.[2]

(۱) مشکوۃ المصابیح، باب الوصایا، الفصل الثانی میں نقل کیا ہے ابن ماجہ: السنن، ج ۱، باب لا وصية لوارث

(۲) الشوکانی، نیل الاوطار، ج ٦، کتاب الوصایا باب اول کی حدیث اول کی شرح میں درج ہے رواہ سعید بن منصور موقوفا باسناد صحیح رواہ النسائی مرفوعا.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنی ساری جائید اد ——— جو چھ غلاموں پر مشتمل تھی ——— وصیت کے ذریعہ خیرات کر دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے۔ آئیے حدیث کا پورا متن اور ترجمہ پڑھ لیتے ہیں۔

=

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لیے وصیت کرنا کہ اس کے ذریعہ کسی حقدار کو نقصان پہنچایا جائے کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

۳ یا مثلاً:

وليس لقاتل وصية.[1]

ترجمہ: قاتل کے لیے کسی حال میں بھی وصیت درست نہیں ہے۔

۴ اور ان سب شرائط سے مقدم شرط یہ ہے کہ وصیت کرنے والا اس قدر مقروض نہ ہو کہ جس مال کی وصیت وہ کر رہا ہے، سب اداء قرض ہی میں چلا جائے کیونکہ ادائے قرض وصیت اور وراثت دونوں پر مقدم ہے۔

غرض وصیت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ سے ایک متمول اپنے آخری

عن عمران بن حصين رضى الله تعالى عنه أن رجلا أعتق ستة مملوكين له عند موته، ولم يكن له مال غيرهم. فدعا بهم رسول الله صلى الله عليه وسلم فجزّاهم أثلاثا، ثم أقرع بينهم فأعتق إثنين وأرق أربعة. وقال قولا شديدا. (رواه مسلم و رواه نسائى عنه و ذكر: لقد همّت أن لا أُصلّى عليه بدل و قال له قولا شديدا. و فى رواية ابى داود قال: لو شهدته قبل أن يدفن لم يدفن فى مقابر المسلمين)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھ غلام آزاد کر دیئے جبکہ اس کے پاس ان چھ غلاموں کے سوا کوئی مال نہ تھا (جب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے ان غلاموں کو بلایا اور (دو دو کی تعداد میں) ان کے تین حصہ کیے۔ پھر ان کے درمیان قرعہ ڈالا۔ اس کے نتیجہ میں دو کو آزاد فرمادیا اور چار کو باقی رکھا۔ اور (یوں تمام چھ کو) زآزاد کرنے والے سے اظہار ناراضگی فرماتے ہوئے سخت الفاظ فرمائے۔

نسائی کی روایت ـــــ جو انہی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے ـــــ میں ہے: ان "سخت الفاظ فرمائے" کی بجائے یہ الفاظ ہیں: میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ اس شخص کی نماز جنازہ نہ پڑھوں۔ ابو داود کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں اس (کی تدفین سے پہلے اس کے جنازہ) کو پالیتا تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جاتا۔

غالباً ان صاحب سے یہ غلطی ہوئی ہوگی کہ انہوں نے ورثاء کو ضرر پہنچانے یعنی حق وراثت سے محروم کرنے کے لیے چھ غلاموں ـــــ جو اسکی کل دنیوی جائیداد تھے ـــــ کو وصیت میں آزاد کر دیا۔

(۱) ابن قدامه: المغنى ج ٦، كتاب الوصايا، باب الوصية للقاتل

لمحات حیات میں تبرع (Voluntary Charity) اور حسنِ سلوک کے طور پر غرباء اور اہلِ حاجات کو مالی فائدہ پہنچا دیتا ہے اور بسا اوقات اس طریقِ کار سے اہم اور ضروری اجتماعی کام بخوبی انجام پا جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن عزیز نے وراثت کے احکام بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ وصیت وراثت سے مقدم ہے۔ ﴿مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ﴾[1]

انفاق کی دوسری قسم کی شکلیں:

قرضِ حسنہ:

مدعا:

"انفاق فی سبیل اللہ" اور "تعاون باہمی" (Mutual Co- Operation) کے وسائل میں سے ایک مفید اور کارآمد وسیلہ "قرضِ حسنہ" ہے، یہ حاجت مند کی وقتی حاجت روائی کا بھی ذریعہ ہے اور غریب اور بے مایہ انسان کو تجارتی زراعتی یا صنعتی کاروبار کے لیے بھی مؤثر وسیلہ ہے۔

تعریف و ضوابط:

قرض حسن کی تعریف یہ ہے کہ ایک دولت مند کسی ضرورت مند کی ضرورت

(۱) سورۃ النساء (٤): ۱۲ وصیت کی معاشی اہمیت اور دینی فضیلت کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بخشش کی خوشخبری دی ہے۔ ارشاد گرامی پڑھئے:

عن جابر رضی اللہ تعالٰی عنه قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: من مات علی وصیة مات علی سبیل وسنة، ومات علی تقی وشهادة، ومات مغفور له. (ابن ماجه: السنن، کتاب الوصایا، باب الحث علی الوصیة)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالٰی عنہ سے روایت ہے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص وصیت کر کے فوت ہوا (یعنی اس نے وصیت کی کہ اس کے مال کچھ حصہ اللہ کریم کی رضا کی خاطر محتاجوں کی معاشی کفالت پر خرچ کیا جائے) تو وہ (تین طرح کی بشارتوں کے ساتھ) ہے:

1. راہ مستقیم اور سنت (یعنی پسندیدہ طریقہ) پر مرا۔
2. وہ تقوی اور شہادت (اللہ کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی دے یا شہادت) کی موت مرا۔
3. وہ اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش کر دی گئی۔ (سبحان اللہ)

کے انسداد اور اس کی حاجت روائی کے لیے اس طرح اپنی رقم سے اس کو فائدہ پہنچائے کہ اس کا کوئی بدل (سود) اس سے حاصل نہ کرے اور چونکہ یہ اخلاقی مسئلہ ہے اس لیے احادیث میں قرض خواہ کو قرض دار کی دعوت قبول کرنے سے بھی احتیاط کا حکم دیا گیا ہے تاکہ عوض خواہی کا قطعاً سد باب ہو جائے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ قرض دار اس لیے قرض خواہ کی دعوت کرتا یا اس کو ہدیہ پیش کرتا ہے کہ وہ اپنے قرض کا جلد مطالبہ نہ کرے اور اس حالت میں یہ بھی ایک قسم کا ربوا ہو جائے گا الا یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس معاملہ سے قبل بھی اس قسم کے تعلقات قائم ہوں۔ (اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

اذا أقرض أحدكم أخاه قرضا فأهدى اليه طبقا فلا يقبله أو حمله على دابته فلا يركبها إلا أن يكون جيرى بينه و بينه قبل ذالك.[1]

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو قرض دے اور قرض دار اسے کوئی تحفہ دے تو قرض خواہ کو وہ تحفہ قبول نہ کرنا چاہیے یا اگر قرض دار قرض خواہ کو سواری کے لیے کوئی جانور پیش کرے تو قرض خواہ کو اس پر سوار نہ ہونا چاہیے البتہ اگر ان دونوں میں اس قسم کی راہ و رسم پہلے سے موجود ہو (تو حرج نہیں)۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی فتویٰ اور تعامل ہے۔)[2]

اور چونکہ اس معاملہ میں قرض ۔ ر کی جانب سے بد دیانتی اور وفائے عہد کے فقدان کا زبردست خطرہ ہے اس لیے اس قسم کی اعانت کو واجب نہیں کیا گیا بلکہ خدا تعالیٰ کے انعام و اکرام کے وعدوں کے ساتھ صرف اخلاقی ترغیب ہی پر اکتفا کیا گیا

(۱) سیوطی، جامع الصغیر، روایت نمبر ٤٦٧

(۲) ابن قیم جوزیہ: اعلام المعوقین، ۱۴۹/۳، ۱۵۲

ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١١﴾ ﴾[1]

ترجمہ: کوئی شخص ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے اور اللہ اس کو اپنی مرضی سے چند در چند کر کے ادا کر دے (یعنی آخرت کا اجر عطا فرمائے) جو دنیوی منافع سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے لیے پسندیدہ ثواب ہے۔

اور ساتھ ہی قرض دار کو بھی سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ قرض حسن کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدرتِ ادا کے باوجود دوسرے کی رقم کو ہضم کر جائے یا تاخیر کر کے قرض دہندہ کو نقصان پہنچائے، چنانچہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشادات مبارک ہیں:

❶ مطل الغني ظلم.[2]

ترجمہ: دینے کی قدرت کے باوجود دوسروں کے حق مطالبہ کی اداء میں تاخیر بہت بڑا ظلم ہے۔

❷ عن أبي امامة رضي الله تعالىٰ عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه سلم يقول: الدين مقضى.[3]

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: قرض کی بروقت واپسی واجب اور فرض ہے۔

---

(۱) سورة الحديد (۵۷): ۱۱

(۲) صحيح الامام البخاری، ج ۱، کتاب الاستقراض واداء الديون الخ. ابن ماجه، السنن، ج ۱، باب الحواله. امام نووی رحمه الله تعالىٰ: رياض الصالحين، باب تحريم مطل الغنى بحق طلبه صاحبه. مشكوة المصابيح، باب الأفلاس والأنظار

(۳) ابوداود: السنن، ج ۲. ابن ماجه: ج ۱، باب كتاب البيوع. مشكوة المصابيح، باب الغصب والعارية، فصل دوم

۳ (عن سمرة رضی اللہ تعالٰی عنه قال:) قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: عمل الید ما اخذت حتی تودیه۔[۱]

ترجمہ: حضرت سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۲] سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چیز کسی نے کسی سے لی ہے جب تک اس کو ادا نہ کرے اس کا بارِ ادا اس پر برابر قائم ہے۔

بہرحال قرض حسنہ میں دینے والا اگر دیانت دار اور بد دیانت کا لحاظ رکھ کر اس کے لیے اقدام کرتا ہے تو یہ اس کا واجبی حق ہے اور قرض لینے والوں کی اخلاقی قوت پر ہی اس کی ترویج کا دارومدار ہے۔[۳]

---

(۱) مشکوۃ المصابیح، باب الغصب والعاریة، فصل دوم. ابن ماجه: السنن، باب العاریة، عن سمرة رضی اللہ تعالٰی عنه

(۲) حضرت سمرہ بن جندب الفزاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ مدینہ منورہ میں پلے بڑھے، سیکھے پڑھے، پھر کوفہ یا بصرہ چلے گئے۔ کوفہ اور بصرہ کے نائب گورنر بنے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں بصرہ کے مستقل گورنر بنے۔ بیمار رہ کر ۹۰ھ میں وفات پائی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سو (۱۰۰) سے زائد احادیث صحاح ستہ میں منقول ہیں۔ (اکمال فی اسماء الرجال ذیل مشکوۃ المصابیح)

(۳) جہاں قرض دار (Borrower) کو سخت الفاظ میں تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنا لیا ہوا قرض استطاعت کے ہوتے ہوئے وعدہ کے مطابق فوراً ادا کرے بلکہ احسن طریقہ پر احسان مندی کے اظہار کے ساتھ ادا کرے، اسی طرح قرض خواہ (Leander) کو بھی تلقین کی گئی ہے، بشارتیں اور خوشخبریاں سنا کر تیار کیا گیا ہے کہ وہ مفلس مقروض کو مہلت دے بلکہ اگر اسے سارا قرض یا اس کا کچھ حصہ معاف ہی کر دے تو باہمی تعلقات، مفلس کی معاشی سہولت اور قرض خواہ کے بلندی درجات کے لیے بہتر ہوگا۔ قرآن کریم میں اللہ کریم کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۸۰)

ترجمہ: اور اگر مقروض تنگدست ہے تو اسے فراخی (حاصل ہونے) تک مہلت دے دو اور اگر اسے (اس کی مفلوک الحال پر ترس کھا کر) معاف ہی کر دو تو ایسا کرنا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہوتے (تو ایسا ضرور کرتے)۔

فقراء اور معاشی دکھوں کے مارے انسانوں کے سچے غم خوار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے بس و مجبور مقروضوں کو سہولت دینے یا معاف کر دینے کی ترغیب اپنے بہت سے ارشادات میں فرمائی، صرف تین ارشادات یہاں نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں آپ بھی پڑھئے اور اندازہ لگائیے کہ نبی کریم صلی اللہ =

علیہ وسلم مجبور و مفلس مقروضوں کا مقام اور ان سے امیر قرضخواہوں کے درگذر کرنے کو کس قدر گہرا اثر چھوڑنے والے انداز میں بیان فرماتے ہیں:

❶ عن ابی قتادة رضی الله تعالیٰ عنه قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من سره ینجیه الله من کرب یوم القیامة، فلینفس عن معسر أو یصنع عنه. (رواه مسلم، کتاب البیوع، باب فصل انظار المعسر. ریاض الصالحین، باب فضل السماحة فی البیع والشراء)

ترجمہ: حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جس کسی (قرض خواہ) کو یہ بات بھلی لگتی ہو کہ اللہ کریم اسے قیامت کی تنگیوں سے خلاصی عطا فرمادے تو پھر اسے چاہیے کہ وہ تنگدست (قرض دار) کو مہلت دیا کرے یا اس کا قرضہ معاف ہی کر دیا کرے۔

❷ عن أبی مسعود رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: حوسب رجل ممن کان قبلکم، فلم یوجد له من الخیر شیٔ، إلا أنه کان یخالط الناس. وکان مؤسرا، وکان یأمر غلمانه أن یتجاوز عن المعسر. قال الله عزوجل: نحن أحق بذلك منه، تجاوزوا عنه. (حواله بالا)

ترجمہ: حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ —— جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت فرمائی تھی —— روایت کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں میں سے ایک شخص کا (موت کے بعد) حساب لیا گیا، تو اس کے (نامۂ اعمال میں اس کے) پاس کوئی بھلائی کا کام نہ ملا۔ البتہ وہ لوگوں سے لین دین کا معاملہ کرتا تھا اور خوشحال تھا۔ اور اس نے اپنے کاروباری نوجوانوں کو سمجھا رکھا تھا کہ وہ تنگدست (مقروض) سے درگذر کیا کریں۔ عظیم و جلیل اللہ نے (اس کے اس عمل کی قدر دانی فرماتے ہوئے فرشتوں سے) فرمایا: ہم اس درگزر کرنے میں اس شخص سے زیادہ اہل ہیں، اس (میرے بندہ) سے درگذر کر لو۔

❸ عن أبی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من أنظر معسرا، أو وضع له، اظله الله یوم القیامة تحت ظل عرشه، یوم لا ظل إلا ظله. (جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی انظار المعسر والرفق به)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے تنگدست کو مہلت دی یا اس کو (بار قرض سے) سبکدوش کر دیا، اللہ کریم (قدردانی کے طور پر) قیامت کے دن اپنے عرش کے سایہ میں جگہ عطا فرمائیں گے، جس دن اس (عرش) کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ مل سکے گا۔

اب ذرا مزید رخ قرض دار کے لیے تعلیمات کا بھی ملاحظہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیکھئے کتنی تہدید آمیز تلقین کرتے نظر آتے ہیں:

من أدان أموال الناس، یرید أداءها أدی الله عنه، ومن اخذها یرید أتلافها اتلفه الله. (بخاری: کتاب استقراض)

=

عاریت (Lending):

اقتصادی نظام کے اخلاقی شعبہ میں "عاریت" بھی نمایاں جگہ رکھتی ہے، کسی شخص کا اپنی ملکیت کے منافع کو بغیر معاوضہ کے دوسرے کی ملک بنا دینا اسلامی نقطۂ نظر سے عاریت کہلاتا ہے، عاریت کا سسٹم کس لیے ہے اس کا جواز اسلامی فقہ میں اس طرح دیا جاتا ہے:

واجتمعت الأمة على جوازها واستحباها واستحسانها لما فيها من إجابة المضطر و إغاثة الملهوف.[1]

ترجمہ: امت کا اس پر اجماع ہے کہ عاریت نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اس لیے کہ اس میں مضطر کی حاجت روائی اور نادار کی اعانت وامداد ہے۔

افادیت:

کون نہیں جانتا کہ ضرورت کی ہر شے ہر شخص کے پاس نہیں ہوتی اور وہ بھی انسان ہیں جو قوتِ خرید بھی نہیں رکھتے، پس اگر ان کی اعانت کا یہ طریقہ جو عاریت کی

ترجمہ: جس کسی نے لوگوں (سے ان) کے اموال قرض لیے اور اسے ادا کرنا چاہا۔ اللہ کریم نے اسے ادا کرنے کی توفیق سے نواز دیا، مگر جس نے (لوگوں کے اموال بطور) قرض لیے اور انہیں (واپس نہ کر کے) تلف کر دیا، اللہ کریم اس کو بھی (بطور سزا معاشی اور اخروی لحاظ سے) تباہ کر دیں گے۔

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرض سے بکثرت پناہ مانگا کرتے تھے۔ بخاری رحمہ اللہ ہی کی روایت پڑھئے:

أللهم انى اعوذبك من المأثم والمغرم. فقيل له: إنك تستعيد من المغرم كثيرا يا رسول الله! فقال: ان الرجل اذا غرم حدث فكذب، ووعد فأخلف. (بخاري: كتاب الاستقراض واداء الديون، باب من استعاذ من الدين)

ترجمہ: اے اللہ کریم! میں تیری پناہ چاہتا ہوں، گناہگاری (کے مقام وسبب) سے اور قرض (کے وبال) سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا: اے اللہ کریم کے رسول کریم! آپ (موجب) قرض سے بہت زیادہ پناہ کیوں چاہتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لیے کہ (قرض بہت سی برائیوں کا موجب بنتا ہے): جب کوئی شخص قرض لیتا ہے وہ (ادائیگی قرض کی) بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب (ادائیگی قرض کا) وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔

(۱) سعیدیات: ۱۳۱/۲

شکل میں پیش آتا ہے معاشی نظام کا حصہ نہ بنے اور اس کو رائج کرنے کے لیے اقدام نہ کیا جائے تو باہمی معاشی تعاون کا ایک ضروری حصہ معدوم ہو جائے، قرآن عزیز میں ان انسانوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو ایسے مضطر اور نادار کی امداد و اعانت سے باز رہتے اور اپنی چیز کو عاریت پر دینے سے گریز کرتے ہیں (چنانچہ قرآن مجید میں اللہ کریم کا) ارشاد ہے:

﴿ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴿٧﴾ ﴾[1]

ترجمہ: اور ان کے لیے بھی ہلاکت ہے جو برتنے کی چیز عاریت پر نہ دیں۔

بہرحال عاریت، ایثار اور اخلاقی بلندی کا ایک ثبوت ہے جس کے لیے اخلاقی ترغیبات ہی سے کام لیا گیا ہے اور چونکہ اس میں چیز کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے اس لیے عاریت پر لینے والے کو بھی سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ عاریت پر لی ہوئی چیز کو اپنی ملک نہ سمجھے اور ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد فوراً مالک کو واپس کر دے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع ارشاد جو بہت سے معاشی مضامین کو شامل ہے، جن کا تعلق اس حصہ دوم کے شعبہ سے ہے۔

عن أبي امامة رضي اللّٰه تعالٰى عنه قال: سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: العارية مؤداة والمنيحة مردودة، والدين مقضي والزعم غارم.[2]

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: عاریت کی واپسی عاریت لینے

---

(۱) سورة الماعون (۱۰۷): ۷

(۲) رواه الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی العاریة مواداة. ابن ماجه: السنن، ج ۱، باب العاریة علاوہ ازیں اس حدیث کو ترمذی ابوداود نے بھی روایت کیا ہے، کذا فی مشکوة المصابیح، باب الغصب والعاریة، فصل دوم

والے کے ذمہ ہے۔ منحہ کا لوٹانا ضروری ہے، قرض کا ادا کرنا ضروری ہے
اور ضامن ضمانت پوری کرنے کا پابند ہے۔
منحہ کسی شخص کا اپنا جانور دودھ والا یا بیل (وغیرہ) یا اپنی زمین یا باغ
وغیرہ کسی دوسرے ضرورت مند شخص کو صرف اس کی معاشی کفالت کے
لیے دے دینے کو کہتے ہیں۔"

عاریت کی واپسی اور اس کی حفاظت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ
ارشاد قابل توجہ ہے:

عن السائب بن یزید عن ابیه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم
قال: علی الید ما اخذت حتی تؤدی.[1]

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید[2] اپنے والد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل
کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کسی سے مستعار لی
گئی شے اس مستعیر) ہاتھ کے ذمہ ہے جب تک وہ واپس نہ کر دی
جائے۔

امانت:

اگرچہ ظاہر بین نگاہوں میں اس کا تعلق معاشی نظام سے نظر نہیں آتا لیکن

---

(۱) جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی تضمین العاریة. ابن ماجه، کتاب
الصدقات، باب العاریة

(۲) حضرت سائب بن یزید کندی لیثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۲ھ یا ۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ چھ سات سال کی عمر میں
والد محترم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ حجۃ الوداع میں شرکت کی سعادت پائی۔ انہیں عموماً ابن اخت النمر (شیر
کی بہن کا بیٹا) کہا جاتا تھا کیونکہ نمر بن جبل ان کے والد حضرت یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماموں تھے۔ ایک
بار بیمار ہوئے تو ان کی والدہ محترمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے
گئیں، آپ نے دعا کی، سر پر دست شفقت پھیرا، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی پیا۔ حضرت
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں مدینہ منورہ کے بازار کا محتسب یا نگران بنایا تھا۔ آپ نے ۸۰ھ میں وفات پائی۔
آپ سے امام زہری رحمہ اللہ، محمد بن یوسف رحمہ اللہ وغیرہما نے روایت کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (الکمال فی
اسماء الرجال، ترجمه السائب بن یزید رضی اللّٰه تعالٰی عنه)

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی بعض حالات میں اہم معاشی ضرورت کے پورا کرنے کی کفیل ہے، ایک شخص اگر نقد یا مال کسی دوسرے شخص کے پاس امانت رکھتا ہے اور امین کو اس کی ضرورت کے وقت امانت میں تصرف کرنے کی اجازت دے دیتا ہے تو کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کس قدر اہلِ حاجات کی ضروری حاجات کو پورا کیا جا سکتا ہے اور جبکہ امانت کے معاملہ میں خیانت کا ہر وقت خوف رہتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ دونوں جانب اخلاقی دباؤ ڈالا جائے، ذاتی ضرورت سے فاضل مال رکھنے والوں کو جہاں انفاق فی سبیل اللہ کے دوسرے طریقوں کی ترغیب دی جائے وہاں "امانت" کی بھی ترغیب دی جائے تاکہ اس بہانہ سے اہل حاجات کی حاجت پورا ہونے کی ایک اور سبیل پیدا ہو اور ساتھ ہی امین (Trustee) کو خائن (Treacherous) نہ بننے کی ترغیب دی جائے اور عذاب الٰہی اور دنیا کی رسوائی کا خوف دلا کر صحیح معنی میں "امین" رہنے پر آمادہ کیا جائے، چنانچہ قرآن عزیز میں ان دونوں باتوں کی جانب توجہ دلائی گئی ہے:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا۟ ٱلْأَمَـٰنَـٰتِ إِلَىٰٓ أَهْلِهَا﴾ [1]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ جس شے کے تم امین بنائے گئے ہو اس کے مالک شے کے پاس امانت کے ساتھ واپس کرو۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کی حفاظت کرنے کی کس طرح تلقین فرمائی ملاحظہ کیجئے):

1. أدّ الأمانة الی من ائتمنك ولا تخن من خانك. [2]

ترجمہ: امانت کو امین کے پاس رکھو اور اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ

---

(۱) سورة النساء (٤) ٥٨

(۲) ترمذی: الجامع، ابواب البیوع ماجاء أن أد الأمانة باب ماجاء ان العارية مؤداة مشكوة المصابيح، كتاب الايمان، ابوداود: السنن، كتاب البيوع، باب من يأخذ حقه، الشوكانی نيل الاوطار ج ٦ كتاب الودية والعارية

خیانت کی ہے تب بھی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

❷ لا إيمان لمن لا أمانة له.[1]

ترجمہ: جس میں امانت کا مادہ نہیں اس کو ایمان سے بھی حصہ نہیں ملا۔

قرآن کریم میں اللہ کریم نے امانت میں خیانت کرنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْخَآئِنِينَ ﴿٥٨﴾﴾[2]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

امین (Trustee) اور جدید بینکوں کے کردار کا موازنہ:

غرض ''امانت'' اجتماعی معاشیات میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اس لیے کہ اگر ایک متمول اور دولت مند اپنی فاضل ''دولت'' کو بغرضِ حفاظت کسی امین کے پاس امانت رکھتا ہے اور ساتھ ہی اس کو اجازت دیتا ہے کہ وہ حسبِ ضرورت اس سے اس شرط کے ساتھ استفادہ کر سکتا ہے کہ بوقتِ طلب بجنسہ واپس کر دے تو یہ معاملہ قریب قریب موجودہ زمانے میں بینکوں کے اندر روپیہ داخل کرنے کی مثال بن جاتا ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ بینک میں روپیہ داخل کرنے پر سود کی ایک مقدار سالانہ ملتی رہتی ہے اور خود بینک بھی اس روپیہ سے سودی کاروبار کرتے رہتے ہیں، لیکن ''امانت بشرطِ تصرف'' (Deposit with permission to use) میں سود کے لین دین دونوں صفر اور نفی کے درجہ میں رہتے ہیں۔

پس بینک میں سپرد امانت کا نتیجہ تو بینکر (Banker) کے لیے مذموم سرمایہ داری کی تخلیق نکلتا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ''امانت سے استفادہ'' (To Benefit)

---

(۱) ترمذی: الجامع، ابواب البیوع باب ماجاء ان ادلامانة قبل باب ماجاء ان العارية مؤداة. مشكوة المصابيح، كتاب الايمان. ابوداود: السنن، كتاب البيوع، باب من يأخذ حقه. الشوكاني نيل الاوطار، ج ٦، كتاب الودية والعارية

(۲) سورة الانفال (۸): ۵۸

اس مذموم طریقہ کا انسداد کر کے صاحب دولت کی دولت کو بھی ہلاکت سے بچاتا ہے اور اصحابِ حاجت کی تکمیل حاجات مثلاً تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ یا وقتی حصولِ معیشت کے لیے مد و معاون ثابت ہوتا ہے اور "بنک سسٹم" کی طرح چند افراد میں "اکتناز" کی راہ سے دولت کو سمیٹ کر عوام کی معاشی تباہی و تنگ دستی اور ان کے افلاس کا باعث نہیں بنتا۔

اسی لیے اسلام کے معاشی نظام میں "امانت" کے مفید پہلو کو باقی رکھا گیا اور سرمایہ دارانہ نظام کی مضرت کو فنا کرنے کے لیے اس کے ربوی (Usurious) شعبہ کو حرام قرار دے دیا۔

چنانچہ ایک حدیث میں اس کے افادی پہلو کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا:

الامانة غنى.(۱)

ترجمہ: امانت ایک قسم کی مالی رفاہیت ہے۔

اور مشہور محدث ابن اثیر رحمہ اللہ نے نہایہ میں اس جملہ کی یہ تصریح فرمائی ہے:

"حدیث کے جملہ کی مراد یہ ہے کہ امانت، امین کی رفاہیت کا باعث بنتی ہے اس لیے کہ جب اس کی امانت داری کی شہرت ہوگی تو لوگ کثرت سے اپنے فاضل مال کو اس کی امانت میں رکھنے کا اقدام کریں گے اور اس طرح یہ معاملات اس کی رفاہیت کے باعث ہوں گے۔"(۲)

اقتصادی انقلاب کے دو فطری طریقے

عقل اور دلیل دونوں اس بات کی راہنمائی کرتے ہیں کہ جماعتی زندگی میں معاشی وسائل کو عام کرنے، سرمایہ اور دولت کو محدود طبقوں میں "کنز" اور "جمع"

---

(۱) ابن اثیر: النهاية، مطبوعه مصر: ج ۱، باب الامانة

(۲) ابن اثیر: النهاية، مطبوعه مصر ج ۱، باب الامانة

(Hoarding & Concentration) ہونے سے بچانے اور مذموم سرمایہ دارانہ نظام کو قائم نہ ہونے دینے کے لیے دو ہی مؤثر طریقے ہوسکتے ہیں۔

❶ ایک یہ کہ قانون کے ذریعے ایسی تمام راہیں بند کردی جائیں کہ جن سے عوام کی تباہی و بربادی پر خواص (Selected Persons / Elites) کی مالی سربلندی (Development) کی عمارت تعمیر ہوتی ہو اور جو شخص بھی اس کی خلاف ورزی کرے وہ قانونی مجرم قرار دیا جائے اور اس طرح لوگوں کی خوشی و ناخوشی سے بلند تر ہو کر قانون کی ایسی حدود قائم کردی جائیں کہ اقتصادی نظام کی تمام تر بنیادیں صرف اسی پر قائم ہوں اور اس کا فائدہ زیادہ سے زیادہ عام ہو جائے۔

❷ دوسرے یہ کہ سوسائٹی اور جماعت میں مذہب کی راہ سے اخلاق کی ایسی عملی تعلیم دی جائے جو مذموم سرمایہ داری کا قلع قمع کرتی اور احتکار و اکتناز کی جگہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

چنانچہ اسلام نے ان دونوں پہلوؤں کو اپنے اقتصادی نظام میں مؤثر جگہ دے کر کائنات انسانی کی فلاح عام کا بیڑہ اٹھایا اور خلافتِ راشدہ کے مقدس دور نے عملاً ان کو بحد کمال پہنچایا۔

پس اسلامی احکام میں سود، مسکرات (Intoxicants) کی خرید و فروخت، نجس اشیاء کی بیع و شراء، قمار اور قمار کی طرح کے کاروبار اور تعلقہ داری اور جاگیر داری کے ظالمانہ رسم و رواج کا انسداد اور زکوٰۃ، صدقاتِ واجبہ، عشر و خراج، وراثت کا ایجاب و لزوم (Acceptance of their obligation and then compulsarily carry it into effect) پہلی قسم کی بہترین مثالیں ہیں۔

اور حتی الامکان زمینداری کو مستقل معاشی زندگی بنانے سے پرہیز، مضاربت، عنان اور عقدِ شرکت کے ذریعے باہمی تعاون اور صدقات و اوقاف اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے دوسروں کے ساتھ اخوت و ہمدردی، دوسری قسم کی صحیح اور عمدہ مثالیں ہیں۔

لہذا بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عالمگیر اقتصادی نظام کے لیے جو طریقِ کار اختیار کیا ہے وہ اپنے عملی تجربہ اور علمی نظریہ دونوں کے اعتبار سے اس مشکل کا بہترین اور منصفانہ حل ہے جو دنیا کے مدبروں کے سامنے اقتصادی نقطۂ نظر سے سرمایہ دار و مزدور یا سرمایہ و محنت کی جنگ کا باعث بنتی ہے اور بنتی رہی ہے۔

باب ــــــ (۱۴)

اسلام کے اقتصادی نظام اور دیگر نظامہائے اقتصادی کا موازنہ

اسلام کے اقتصادی نظام کا یہ مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد حسبِ وعدہ ہم کو بعض دوسرے نظامہائے اقتصادی پر نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ موضوع کتاب پر مزید روشنی پڑ سکے، ہمارے سامنے عالم کے اقتصادی نظام دو راہوں سے آتے ہیں، ایک مذہبی اور دوسرے دنیوی۔

مذاہب عالم اور اسلام کا اقتصادی نظام:

مذاہبِ عالم کی تاریخ میں اسلام کے علاوہ نصرانیت، یہودیت، ویدک دھرم اور زرتشتی مذہب بڑے مذاہب شمار ہوتے ہیں جن کی پشت پر اپنی مستقل تاریخ ہے۔ اس لیے ہمارا موضوعِ سخن ان چار کے اندر ہی محدود رہنا مناسب ہے۔

(الف) عیسائیت کی معاشی تعلیمات:

ان مذاہب میں سے نصرانیت (Christianity) کی بنیاد یوحنا، متی، مرقش، لوقا، حواریوں کی چار انجیلوں (Evangels) پر قائم ہے ان چار انجیلوں کی تعلیم کا بغور مطالعہ کرنے سے ہم پر یہ اثر پڑتا ہے کہ عیسوی عقیدہ میں یہ بات نمایاں طور پر ملتی ہے کہ وہ بار بار لوگوں کو رہبانیت (جوگی پن) (Monasticism) کی تعلیم دیتا ہے اور اربابِ ثروت و دولت کے لیے خدا کی بادشاہت میں کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتا۔

محنت سے نفرت کی تعلیم:

"تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے کیا پئیں گے؟ اور نہ ہی اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بولتے ہیں اور نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی ہمارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے۔"(۱)

جوڑ اور سنبھال کر نہ رکھنے کی تعلیم:

"اور اس نے اس سے کہا کہ خبردار اپنے آپ کو ہر طرح کے لالچ سے بچائے رکھو کیونکہ کسی کی زندگی اس کے مال کی کثرت پر موقوف نہیں، اس نے ان سے ایک تمثیل کہی کہ کسی دولت مند کی زمین میں بڑی فصل ہوئی، پس وہ اپنے دل میں سوچ کر کہنے لگا کہ میں کیا کروں کہ میرے یہاں جگہ نہیں جہاں پیداوار بھر رکھوں، اس نے کہا میں یہ کروں گا: اپنی کوٹھیاں ان سے بڑی بناؤں گا اور ان میں اپنا سارا اناج اور مال بھر رکھوں گا اور اپنی جان سے کہوں گا اے جان! تیرے پاس بہت برسوں کے لیے بہت سامال جمع ہے، چین کر، کھاپی خوش رہ۔ مگر خدا نے اس سے کہا اے نادان! اسی رات تیری جان تجھ سے طلب کر لی جائے گی، پس جو تو نے تیار کیا ہے وہ کس کا ہو گا، ایسا ہی وہ شخص ہے جو اپنے لیے خزانہ جمع کرتا ہے اور خدا کے نزدیک دولت مند نہیں۔"(۲)

دولت سے نفرت کی تعلیم:

پھر اس نے اپنے شاگردوں سے کہا اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان

---

(۱) انجیل متی، باب ٦ آیات ٢٤، ٢٦

(۲) انجیل متی، باب ٦ آیات ٢٤، ٢٦

کا فکر نہ کیا کرو کہ ہم کیا کھائیں گے اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے؟ کیونکہ جان خوراک سے بڑھ کر ہے اور بدن پوشاک سے۔"(۱)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔"(۲)

سرمایہ داری ناپسندیدہ:

غرض عہد نامہ جدید (اناجیل اَربعہ) کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت "سرمایہ داری" کو ناپسند کرتی ہے لیکن اقتصادی نظام کے نقطۂ نظر سے اس میں ترغیب و تلقین کے علاوہ کوئی قانونی عملی حیثیت مذکور نہیں کہ جس کو سامنے رکھ کر اقتصادی عادلانہ نظام مرتب کیا جاسکے اور ایک دیندار کو صحیح دنیا دار بنا کر جماعتی زندگی کا مفید جز بنایا جاسکے، بلکہ اس کے برعکس اس سے صرف "رہبانیت" اور دنیا کشی کی تعلیم نکلتی ہے اور بس، اور ایک دیندار اور خدا رسیدہ انسان کو بہترین دنیا دار بنانے اور جماعتی زندگی میں کسی بہتر مالی نظام قائم کرانے کی اس میں مطلق کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

کسی اقتصادی نظام کی عدم موجودگی:

عہد نامۂ جدید (انجیل) کے بعد عہد نامۂ قدیم (توراۃ) (Torah) کو لے لیجئے اور اس کے ابواب "قاضیوں" اور "سلاطین" کا غائر نظر سے مطالعہ کیجئے جو حکومت سے متعلق ہیں تو کسی ایک مقام میں بھی "اقتصادی نظام" کی جھلک نظر نہ آئے گی (۳)

(۱) بوقا، انجیل، آیات ۱۵، ۲۱

(۲) انجیل متی، باب ٦ آیات ۲۳، ۲٤

(۳) اناجیل اربعہ (Four Evangels) ـــــ عہد نامہ جدید (New Testaments) ـــــ ہو یا تورات (Torah) ـــــ عہد نامہ قدیم (Old Testaments) ہوں ان میں معاشی جدوجہد، کمانے اور خرچ کرنے کی تعلیمات کا =

ان کی پوری داستان یا دشمنوں سے مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے متعلق ہے، اور یا بادشاہت کے جاہ و حشم، دولت و ثروت صولت و شوکت کی مدح و منقبت سے معمور ہے اور ان دونوں ابواب کے علاوہ جو اس مسئلہ کے خصوصی مواقع ہو سکتے تھے پورے عہد نامہ میں کوئی مضمون ایسا نہیں ملتا کہ جس سے چند اصول یا چند احکام اس نظام کے لیے حاصل کیے جا سکیں یا کم از کم عہد نامہ جدید کی طرح سرمایہ داری کی مذمت کے لیے اخلاقی سرمایہ ہی بہم پہنچا سکے۔

کاروبار شراب کا جواز:

علاوہ ازیں عہد نامہ جدید و قدیم میں ایک بات نمایاں اور امتیازی طور پر یہ بھی نظر آتی ہے کہ ان میں ”شراب“ کے استعمال کا نہ صرف جواز بتایا گیا ہے بلکہ مقدس نبیوں اور رسولوں کی ضیافتوں میں بھی اس کا استعمال تقدس اور برکت کی شکل میں ظاہر

ورق سرے سے خالی نظر آتا ہے، یہاں کسی معاشی نظام کا ذکر نہیں، فرد کے لیے معاشی تعلیمات ہیں نہ معاشرہ وحکومت کے لیے یہاں نہ کوئی اثباتی معاشیات (Positive Economic) کا تصور ابھرتا ہے نہ معیاری معاشیات (Normative Economics) کا ذکر، نہ کہیں جزوی معاشیات (Micro- Economics) ڈھونڈنے سے ملتی ہے نہ کلی معاشیات (Macro- Economics) کے قدموں کے نشان، صرف توکل (میں نے جوگی مین (Monasticism) کا لفظ مصلحتاً استعمال نہیں کیا، ورنہ حقیقت وہی ہے) کی تعلیم ملتی ہے۔ پھر یہ عیسائیوں کی روز افزوں جدید معاشیات میں نئی نئی تعلیمات اور اختراعات کیونکر؟ کیا عیسائیت کے بعد کے مذہبی پیشواؤں کی ان تعلیمات کا اثر ہے کہ قیصر (بادشاہ، حکومت، معیشت) کو قیصر کا حق دو اور گرجا گھر (خدا، یسوع مسیح، عبادت خانہ) کو گرجا گھر کا حق دو یعنی مذہب کا کھاتہ الگ، معیشت کا دھندہ الگ۔ دونوں اکٹھے نہیں رہ اور چل سکتے۔ یا یوں کہیں کہ عیسائیت کے پیرو کاروں نے اپنے مذہب کو پس پشت ڈال کر معیشت (Economics) کی الگ راہ نکالی ہے کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں کار گاہ حیات میں جہاں جس سے کام نکلتا نظر آیا اسے استعمال کر لیا۔ عربوں کا تیل ہتھیانہ ہو تو معیشت کا استحصالی حربہ (Exploitative Tool) استعمال کر لیا، جب عراق پر قبضہ کرنا ہو تو مقدس مذہبی صلیبی جنگ کا مجاہد (Crusader) بن گیا

انجیل (قدیم ہو یا جدید) کے بعد کے مذہبی پیشواؤں نے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں سے متاثر ہو کر معاشی تعلیمات کو اپنی دینی تعلیمات اور مواعظ کا موضوع نہیں بنایا۔ میرے محدود مطالعہ میں صرف سینٹ پیوس (Saint Pius) دہم وہ پہلے (اور غالباً آخری) پاپائے روم ہیں جو فقراء کے طبقہ کی اصلاح کے لیے فکر مند ہوئے۔ (منیر بعلبکی المورد (قاموس، انگلیزی۔ عربی) جزو معجم الأعلام حصہ ”P“ میں دیکھیں)

کیا گیا ہے جس سے بآسانی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس نظام میں شراب کی خرید و فروخت اور عام بیع و شرا اور استعمال اقتصادی زندگی کے لیے مفید سمجھا گیا ہے بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزو مانا گیا ہے۔

سودی کاروبار:

علاوہ ازیں انجیل و تورات سے "سودی" لین دین کی بھی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ البتہ تورات میں یہ شرط بھی مذکور ہے کہ "سود" محتاج اسرائیلی سے نہ لیا جائے۔ بلکہ صرف اسرائیلی (یہودی) سے نہیں لینا چاہیے، باقی افرادِ انسانی سے سود لینا درست ہے، چنانچہ موجودہ انجیل کے مطابق حضرت مسیح (علیہ السلام) ایک تمثیل میں فرماتے ہیں۔

"اس کے مالک نے جواب میں اس سے کہا: اے شریر اور سست نوکر! تو جانتا تھا کہ جہاں میں نے نہیں بویا وہاں سے کاٹتا ہوں اور جہاں میں نے نہیں بکھیرا وہاں سے جمع کرتا ہوں بس تجھے لازم تھا کہ میرا روپیہ ساہو کاروں کو دیتا تو میں آکر اپنا سود سمیت لیتا۔"(۱)

اور انجیل لوقا میں ہے:

"پھر تو نے میرا روپیہ ساہو کار کے یہاں کیوں نہ رکھ دیا تاکہ میں آکر اسے سود سمیت لے لیتا۔"(۲)

اور توراۃ میں ہے:

"اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر۔"(۳)

اور دوسری جگہ مذکور ہے:

---

(۱) انجیل متی، باب ۲۵ آیات: ۲۷، ۲۸

(۲) انجیل لوقا، باب ۱۹، آیت ۲۴

(۳) تورات، باب ۲۲، آیت ۲۵ خروج

''تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دیجیو، نہ نقد کے سود پر، نہ غلہ جات کے سود پر نہ کسی چیز کے جس کی رعایت سود پر کی جاتی ہو، تو اجنبی کو سودی قرض دے سکتا ہے پر اپنے بھائی کو سودی مت دیجیو۔''(۱)

---

(۱) تورات استثناء، باب ۲۳، آیات ۱۹، ۲۰۔ حضرت مصنف رحمہ اللہ نے گو یہاں نصرانیت کے ساتھ ملا کر یہودیت کی معاشی تعلیمات کا ذکر کر دیا ہے اور بالخصوص حوالہ ۷، ۸ توراۃ (Torah) یہود کی مذہبی کتاب ہی کے حوالہ جات ہیں مگر دونوں ـــــ یعنی عیسایت اور یہودیت کی معاشی تعلیم ـــــ الگ الگ بیان نہیں کیا۔ میں نے ابھی تک توراۃ کا مطالعہ نہیں کیا البتہ عالم اسلام کے مقتدر عالم شیخ الاستاذ محمد یوسف قرضاوی، پروفیسر شریعۃ کالج دوحہ، قطر کا ایک بیان جو یہودیت کی معاشی تعلیمات پر روشنی ڈالتا ہے ـــــ میرے سامنے ہے، اس کا ترجمہ یہاں نقل کر رہا ہوں۔ آپ بھی پڑھ لیں:

''اسلامی معاشرہ نے دین کے زیر سایہ اپنا دنیوی (معاشی) سفر جاری رکھا۔ مسلمان تجارتی کاروبار کرتے تھے اور یہ کاروباری سرگرمیاں (Business Activities) انہیں اللہ کریم کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھیں۔ اس کے برعکس قرون وسطیٰ (Middle Ages) کے بڑے بڑے ممالک اور عیسائی یورپ کی حکومتوں کے عوام تجارتی سرگرمیوں کے بارہ میں دو نظریوں (Theories) کی کشمکش کا شکار تھے۔ ایک نظریہ تخلیص تھا، جس کے مطابق معاشی گرمی اور تجارت میں مشغولی کی وجہ سے دل میں جو گناہوں کی گندگی پیدا ہوئی ہے اس سے اسے کس طرح پاک و صاف کیا جائے؟ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ ان (یہود) کے دینی رہنماؤں کی مخالفانہ تعلیمات کے باوجود جو لوگ تجارت اور صنعت و حرفت (Commerce & Industry) میں لگ جاتے ہیں وہ ملعون (Cursed) ہو جاتے ہیں کیونکہ معاشی سرگرمیوں میں مشغول ہو جانا کوئی عام گناہ نہیں بلکہ ابدالآباد کی (Ever Lasting) لعنت کا موجب بن جاتا ہے۔ (ایسے کاروباری لوگوں پر) یہ لعنت زمین میں بھی برستی ہے اور آسمان سے بھی، دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ مشہور یہودی قسیس (Priest) اگیستن کے بقول: معاشی کاروبار دراصل گناہ ہے کیونکہ یہ نفس (دل) کی توجہ حق (اللہ کریم) سے ہٹا دیتا ہے۔'' (علامہ قرضاوی: الحلال والحرام فی الاسلام، باب ثانی، الکسب، موقف الکنیسۃ فی التجارۃ)

اب آپ اندازہ فرمائیں کہ اتنی سخت اور تہدید آمیز مذہبی مخالفت کے بعد کون ہو گا جو معاشی سرگرمیوں میں حصہ لے گا جو ایسی مذہبی تعلیمات کا پیرو ہوتے ہوئے کمانے اور خرچ کرنے کا سوچے گا؟ غالباً یہ مخالفت مذہبی نہیں اس مذہب کے قسیسین (Priests) اور راہبوں کے ذہن اور رجحان کی پیداوار ہوں گی، جن سے آخر کار یہود نے بغاوت کی ہوگی اور آج وہ دنیا کے سرمایہ اور بازار زر (Money Market) کو سود خواری کے آلہ (Tool) سے کنٹرول کر رہے ہیں یہاں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ علامہ قرضاوی نے کنیسہ (Synagogue- Synagog) (یہودی عبادت گاہوں کو کہتے ہیں۔) کا ذکر کر کے دراصل یہاں یہودیت کی معاشی تعلیمات پر ہی روشنی ڈالی ہے۔

یہود کے قسیسین (Priests) نے نہایت عیاری سے جواز سود کے لیے طریقہ اختیار کیا کہ توراۃ کی پرانی

(ب) زرتشتی مذہب کی معاشی تعلیم:

زرتشتی تعلیم کی مبینہ الہامی کتابیں "ژند اور اوستا" کا اگرچہ میں نے مطالعہ نہیں کیا لیکن اس مذہب کے عقیدہ کے مطابق بانی مذہب (زرتشت) کے علاوہ نبیوں اور رسولوں کے صحیفے جو "دساتیر آسمانی" کے نام سے موسوم ہیں، فارسی اور پہلوی زبان میں نہ صرف میری نظر سے گزرے ہیں بلکہ عرصۂ دراز تک زیر مطالعہ رہے ہیں، مگر توراۃ اور انجیل کی طرح یہاں بھی اس سلسلے میں مجھے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور ظالمانہ طریق پر حصولِ دولت و ثروت کی ہجو و مذمت کے باوجود بصورت احکام و قوانین اقتصادی نظام کی تربیت میں مطلق کوئی مدد نہیں ملتی۔

(ج) ویدک دھرم کی معاشی تعلیم:

اسی طرح ویدوں کی اصل زبان سنسکرت سے ناواقفیت کی وجہ سے مجھ کو ان کے معتبر تراجم اور ان کی بنیادی تشریحات کی کتابوں ستھیارتھ پرکاش "اور آدی بھاشیہ بھومکا" پر ہی اعتماد کرنا پڑا، میں نے عرصۂ دراز تک ایک مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ مختلف اوقات میں ان کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اور کافی غور و خوض کے ساتھ ان کے مطالب و معانی اور مفہوم و مراد تک پہنچنے کی سعی بلیغ کی ہے لیکن بلا شائبہ تعصب و ارادہ مبالغہ، دیانت و انصاف کے ساتھ اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان میں بھی یہ مسئلہ دولت مندوں کے بے جا مظالم کے خلاف چند پند و نصائح یا ان کے مقابلہ میں جنگ کے علاوہ اقتصادی نظام کے لیے احکام و قوانین کی دفعات و جزئیات کی شکل میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

تعلیمات یعنی عہد نامہ قدیم (Old Testaments) میں تحریف کر کے "اپنے بھائی" کا مفہوم صرف "یہودی بھائی" لے لیا اور باقی تمام انسانیت کو سود کے استحصالی حربہ (Exploitative Tool) سے معاشی ہلاکت سے ہمکنار کرنے کا راستہ تلاش کر لیا۔ چنانچہ "سفر تثنیۃ الاشتراع" میں ہے۔

"تو اجنبی (غیر یہودی) کو سود پر قرضہ دے دیا کر مگر اپنے بھائی (یہودی) کو سود پر قرضہ مت دینا۔" (استثنا: ۲۳، ۲۰)

آج ساری دنیا کی معاشی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے۔ (العیاذ باللہ)

(د) منو کا قانون برائے سود و سرمایہ کاری:

مزید برآں یہ کہ "منو" کا قانون جس پر ہندوستان کے مشہور و قدیم مذہب کے نظامِ تمدن کی بنیاد قائم ہے، ایک حد تک "سود" کی اجازت دیتا ہے، وراثت میں تقسیمِ دولت کی بجائے مشترک خاندان (Joint Family) کے نام سے "کنز" اور "جمع دولت" کو جائز قرار دیتا ہے اور اس طرح "مذموم سرمایہ داری" کو دھرم کی پناہ مل جاتی ہے۔

> "اس کی شہادت موجود ہے کہ سودی قرض دینے کا کام ویدوں کے عہد میں یعنی اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے بھی کیا جاتا تھا، پانچویں صدی قبل مسیح سے ایسے پیشہ ور بینکروں کے بارے میں پکی شہادتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں جو روپیہ قرض دیتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنڈیاں روانہ کرتے تھے، ان بینکروں کو "سریستی" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔"

بدھ عہد کے مشہور تجارتی مرکزوں یعنی چمپا کا راجہ گریہا، سراوستی، کوسامبی اور آونتی میں بہت سے نہایت باثر سریستی، یعنی بینکر (Bankers) رہا کرتے تھے۔[1]

کوتلیا کے ارتھ شاستر میں یہ بتلایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنی شرح سود لی جا سکتی ہے؟ دھرم شاستروں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے، ارتھ شاستروں اور دھرم شاستروں کے بیان میں فرق صرف اتنا ہے کہ ارتھ شاستروں میں کسی خاص ذات کے لیے ساہوکاری کے پیشہ کو مخصوص نہیں کیا گیا ہے لکہ دھرم شاستروں میں یہ پیشہ صرف "ویشوں" کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔[2]

(ر) مباحث کا خلاصہ:

ان حوالہ جات سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس نظامِ

---

(۱) ماخوذ از مضمون رسالہ جامعہ دہلی، فروری ۱۹۳۹ء

(۲) حوالہ بالا

اقتصادی میں ''مہاجنی سود'' اور ''جمع سرمایہ'' کو باقاعدہ قبول کیا گیا ہو، اس میں مذموم سرمایہ داری کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے اور مزدور و سرمایہ دار کی کشمکش اور سرمایہ و محنت کی کشائش کا اس کے ذریعہ سے حل کرنا، ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔(۱)

---

(۱) علاوہ ازیں، جہاں معاشی پیشوں (Economic Professions) کی مذہبی تقسیم معاشرتی طبقات کی بنیاد پر کی جائے کہ اعلیٰ نسل کا برہمن صرف وعظ اور حکومتی حکم کے ذریعہ سے معاش کمائے گا، شتری (کھتری) فوجی خدمات کو ذریعہ روزگار بنائے گا، ویش زراعت اور تجارت کر کے معاش بنائیں گے اور شودر صرف حقیر خدمات یا زیادہ سے زیادہ عام پیشے مثلاً آہن گری، نجاری، ظروف سازی وغیرہ اختیار کر کے ذلت آمیز معاش پر قانع رہیں گے۔ وہاں معاشی خوشحالی کہاں سے آئے گی؟ البتہ یہاں دولت اور ذرائع دولت کی غیر منصفانہ بلکہ ظالمانہ تقسیم ہوگی، غریب اور امیر کا فرق نمایاں ہوگا اور طبقاتی کشمکش کو زور آزمائی کا کھلا میدان ملے گا۔

اس طبقاتی نظام کے قانون کا مؤلف منو سمرتی (۵۰۰ ق م) لکھتا ہے: بھگوان (عظیم و جلیل پروردگار) نے دنیا کی بھلائی کے لیے برہمن کو اپنے منہ سے، مشتری کو اپنے بازوؤں سے، ویش کو اپنی رانوں سے اور شودر کو اپنے پاؤں سے پیدا کیا اور ان کے لیے دنیا کی بھلائی کے لیے علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں تفویض (Assign) کر دیں۔ برہمن کے ذمہ وید کا پڑھانا سکھانا، بھگوان کے نذر و نیاز اور صدقات کا قبول کرنا اور لاگو کرنا، شتری (کھتری) کے ذمہ لوگوں کا دفاع کرنا، صدقہ اور نذر و نیاز دینا اور وید کا پڑھانا لکھانا اور شہوات سے بچ کر رہنا ویش مواشی پالے گا ان کی دیکھ بھال کرے گا، وید کی تلاوت کرے گا اور تجارت اور زراعت کرے گا جبکہ شودر کے ذمہ صرف مذکورہ بالا تین طبقات کی خدمت کرنا ہوگی۔ (منو شاستر: باب اول) علاوہ ازیں برہمن کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شودر کا مال بغیر کسی رکاوٹ جب چاہے اور جتنا چاہے لے لے، شودر اس کا غلام ہے اور غلام کا مال آقا کا مال ہوتا ہے (منو، باب ۸) بادشاہ (حکومت) اس (برہمن) پر کسی بھی حالت میں کوئی ٹیکس نہیں لگا سکتا، مجبوری (فاقہ وغیرہ) کی حالت میں برہمن لڑ کر (یعنی دوسروں سے چھین کر) بھی اپنی بھوک مٹا سکتا ہے، اور اس کشمکش میں اگر برہمن (اس کو بھوک مٹانے سے روکنے والے کو) قتل کر دے تو حکومت قصاص میں صرف اس کا سر مونڈ سکتی ہے، اگر دوسرا برہمن کو قتل کرے تو اسے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا (منو، باب ۲) اور شودر مال کما سکتا ہے نہ جمع کر سکتا ہے کیونکہ اس طرح وہ برہمن کو ناراض کرے گا۔ (منو، باب ۱۰)

پھر اس تقسیم کو مذہبی تقدس (Sanctity) بھی حاصل ہو۔ اس معاشرہ یا ملک میں معاشی ترقی کبھی متوازن (Balanced) نہیں ہوگی، فرد (Individual) مخصوص خاندان، گروپ یا طبقات ترقی کریں گے مگر عام یا تمام معاشرہ ترقی نہیں کرے گا، یہاں ایک طرف کروڑپتی (Millionaires) ہوں گے تو ان کے ساتھ بنیادی ضروریات زندگی سے محروم (Paupers) بھی ہوں گے موجودہ ہندوستان ـــــ جو اب معاشی میدان میں ایک دوسری عالمی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے کی معاشی ترقی کا حال دیکھ لیں۔ جہاں ایک طرف بے حساب دھن =

اس جگہ مذاہب عالم کے ان شواہد و نظائر پیش کرنے سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ اقتصادی نظام کے اساس و بنیاد اور نصب العین (Creed) کے پیشِ نظر نیز سرمایہ و محنت اور سرمایہ دار غریب سے متعلق جدید و قدیم کشمکش کے متعلق "مذہب" اور دھرم کی معرفت قانونی اور اخلاقی دونوں طریقوں سے جس قدر صاف اور تفصیلی حل اسلام کے اقتصادی نظام میں پایا جاتا ہے، دوسرے مذاہب کی روایات و تعلیم بھی نظر نہیں آتا، بلکہ اکثر مذاہب و ادیانِ موجودہ میں مذہب کی معرفت اقتصادی نظام کا وجود ہی مفقود ہے۔

دیگر دنیوی نظام ہائے معاش اور اسلام کا اقتصادی نظام

گذشتہ سطور میں اسلام کے اقتصادی نظام کا اور موجودہ مذاہبِ عالم کے اقتصادی نقطۂ ہائے نظر کا مقابلہ زیر بحث آچکا، اب ضروری ہے کہ اس کے دوسرے جزو کو بھی زیر بحث لایا جائے، یعنی اسلام کے معاشی نظام اور دنیوی معاشی نظام کے درمیان بھی موازنہ کیا جائے تاکہ اسلام کے نظامِ معاشی کی برتری واضح ہوسکے۔

اس بحث کا مطمح نظر ہے کہ دنیوی نظامہائے اقتصادی جو اس دورِ جدید میں دنیا یا دنیا کی حکومتوں پر مسلط ہیں اور یا پراپیگنڈا کے ذریعے مسلط ہونا چاہتے ہیں، اسلامی اقتصادی نظام کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اور کیا واقعی اقتصادی نظام کے مقصد عظمی (Great Aim) کا حل ان کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے؟ یا اسلام کا اقتصادی نصام ہی اس مرض کا واحد علاج ہے؟

موجودہ دور میں دنیا کی حکومتوں پر مختلف شکلوں میں مکمل یا ناقص دو ہی انتظاموں کا تسلط ہے اور اس لیے وہی دونوں قابل بحث ہیں ایک فیسزم (Fascism) اور دوسرا سوشلزم (Socialism)۔

پائے کوب ہے تو دوسری طرف بھوک، افلاس اور محرومی کا دیو رقص کناں نظر آرہا ہے یہ معاشی ترقی تو نہیں معاشیات کی طبقاتی تقسیم ضرور ہے۔

فاشیت یا ناتسیت (Fascist):

بنیادی معاشی اصول:

❶ فسیزم یا فاشیت کا نظریہ یا فلسفہ اگرچہ اپنے اندر ایک طویل بحث رکھتا ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ حسبِ ذیل چند اصول پر قائم ہے اور اس کا تمام نظام ان ہی اصول کے ساتھ وابستہ ہے۔ (۱)

---

(۱) نازی ازم (Nazi Ism) یا ناتسیت بھی اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ نازی ازم یا فاشزم کا اصل روپ وہی ہے جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء میں اوڈلف ہٹلر (Adolf Hitler) کے دور اقتدار میں جرمنی میں نظر آیا، مگر اس کا فلسفہ یا سوچ کے ڈانڈے انسان اور حکومت کے تصور کے ابتدائی دور سے جا ملتے ہیں۔ اگر سادہ الفاظ میں کہنے کی کوشش کی جائے تو فاشزم نسلی برتری کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان یا گروہ اس لیے برتر ہے کہ وہ خاص نسل یا خون سے تعلق رکھتا ہے یہی بات ہٹلر نے یہودیوں کے خلاف اپنے آپ کو آریائی ہونے کی وجہ سے برتر ہونے کے لیے کہی تھی۔ دراصل یہ قوم اسی کا فلسفہ ہے مگر اس کے بہت سے اور پہلو بھی ہیں۔ یہ ہنگامہ آرائی میں پھلتا پھولتا ہے اور امن پسندی سے نفرت کرتا ہے بینتو مسولینی (Benito Mussolini) (۱۸۸۳ء - ۱۹۴۵ء) انسائیکلو پیڈیا اٹالیانہ (Encyclopaedia Italiana) میں لکھتا ہے: فاشزم مستقل امن کی ضروریات یا افادیت پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ امن پسندی سے نفرت کرتا ہے۔ اس کے مطابق امن پسندی جدوجہد سے گریز اں اور قربانی کے موقع پر بزدلی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ صرف اور صرف جنگ ہی تناؤ کی شدت کے مطابق انسانی توانائیوں کو ابھارتی ہے اور ان لوگوں کی عظمت پر مہر ثبت کر دیتی ہے، جو اسے قبول کرتے ہیں، بقیہ تمام آزمائش افراد کو موت یا زندگی کے انتخاب سے دوچار نہیں کرتیں۔ فاشزم ریاست کو ایک دیوتا کا درجہ دیتا ہے جس کی قربان گاہ پر فرد کے حقوق اور آزادی کی بھینٹ چڑھانا ضروری ہے۔ بقول گیووانی جیسٹائل (ایک ممتاز فاشسٹ فلاسفر) میری شخصیت دبی نہیں بلکہ خاندان، ریاست اور جذبہ میں مدغم ہو کر ابھری، مضبوط اور وسیع ہوئی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ فاشزم کا سارا نظریہ ہی ریاست کا رہین منت ہے لہذا فاشزم کا شعار (Motto) ہی ریاست کو تقویت دینے، زیادہ با اختیار بنانے بلکہ مقدس گائے بنانے پر ہے۔ فاشسٹ ماٹو (Fascist Motto) کے الفاظ پڑھ کر آپ اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

"Each for all and all for each. Nothting outside the state. Nothing against the State. Every thing in the state" (Quoted by Al- Haj A. d. Ajijola: The Islamic Concept of Social Justice., Islamic Publications, Lahore,. 1977. P. 286)

ترجمہ: ہر ایک سب کے لیے اور سب ہر ایک کے لیے مگر ریاست کے باہر کچھ (ایسا) نہیں (ہو گا) ریاست کے خلاف کچھ نہیں ہو گا، ہر شے (پر تعلق دور کوشش) ریاست کے اندر رہ کر ہی ہو گی۔

=

❶ تمام ذرائع پیداوار افراد کے ہاتھوں میں اس طرح آزاد ہوں کہ ان کا مفاد مخصوص افراد (Certain Individuals) کے حق میں ثابت ہو نہ کہ جماعت اور سماج کی اکثریت (Majority of the Society) کے حق میں۔

❷ پیداوار نجی فائدہ (Personal or private benefit) کے اصول پر ہو نہ کہ عوام کی ضروریات کے فائدہ کے اصول پر اور اس لیے وہ ضروریات کے تخمینہ کی مطابقت کی بجائے ذاتی اغراض (Personal Motives) کے اندھا دھند طریقہ پر ہو۔

❸ ان ہر دو مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے ایسے طرزِ حکومت کی طرح (Base) ڈالی جائے جس میں قوانین کے ذریعے سرمایہ داری کی حفاظت و ترقی کا سامان فراہم ہو سکے۔

فاشیت کی مختصر تاریخ:

اس اجمال کی تفصیل کے لیے فاشیٹ یا نسطائیت کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے کائناتِ انسانی میں عادلانہ نظام کے مقابلہ میں سرمایہ دارانہ نظام نے ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں ابھرنے اور دنیا پر چھا جانے کی سعی کی ہے اور اس کو اپنی سعی میں کامیابی بھی ہوتی رہی ہے۔ قریبی زمانے میں ایسی سعی و کوشش کا ترقی یافتہ نظام ''فسطائیت'' کے نام سے موسوم ہے جو یورپ کی حکومتوں میں جرمنی اور اٹلی پر خصوصیت کے ساتھ حاوی ہے اور انگلستان و فرانس کو بڑی حد تک اس نے فتح کر لیا

سرمایہ داری کے خلاف متعدد نعرے اور انقلابی طریقہ کار رکھنے کے باوجود فاشزم رجعت پسند عناصر اور سرمایہ داروں کا خلیف ہے کیونکہ سرمایہ داروں کو جب محنت کشوں (Working Class) کی طرف سے خطرہ ہو اور خطرہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب ہنگامہ اقتصادی بحران (Economic Depression) کا زمانہ ہو اگر ملکیت رکھنے والا اور حکمران طبقہ محنت کشوں کو پولیس یا فوج کے ذریعہ معمول کے جمہوری طریقہ سے نہ دبا سکے تو یہ فاشٹ طریقہ اپنا لیتا ہے۔ یہ مقبول عوامی تحریک پیدا کرتا ہے، جسے بے روزگار نوجوانوں کی حمایت جلد اور زیادہ مل جاتی ہے اور نتیجہ سرمایہ داروں کا دفاع میں نکلتا ہے۔

فاشزم جمہوریت اور سوشلزم کا مخالف اور سرمایہ دارانہ ڈکٹیٹر شپ کا حامی بلکہ داعی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: معارف فیچر سروس اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، شمارہ نمبر ۱۶۵، یکم جولائی ۲۰۰۷ء جمہوریت اور آمریت از جواہر لال نہرو: ص ۱ تا ۴)

ہے اور امریکہ اور جاپان بھی اس کے لیے گہوارہ بنے ہوئے ہیں۔

جاگیر داری دور:

یورپ میں تقریباً پندرہویں صدی عیسوی سے دورِ جہالت ختم اور دورِ علم و ترقی شروع ہو گیا تھا، اور بعض یورپین حکومتیں دنیا کی جدید دریافت اور حصول زر و مال کے لیے ادھر ادھر تگ و دو میں منہمک نظر آنے لگی تھیں، اس وقت انگلستان میں جاگیر داری (Land Lordism) اور شاہی استبدادیت (Tyranny of Monarchisn) کا دور دورہ تھا، مگر آہستہ آہستہ تجارتی اور کاروباری طبقہ (Business Class) مضبوط ہوتا جارہا تھا، اور بعض سیاسی حالات نے ان کی قوت کو اور زیادہ مضبوط بنا دیا تھا اور وہ ملک کی بہت بڑی طاقت سمجھے جانے لگے تھے۔ ان کا بیشتر کاروبارِ تجارت ''اون کی تجارت'' تھا۔ خاندانِ اسٹوارٹ (Staurt) جب انگلستان پر حکمران ہوا تو اس نے ان تاجروں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر تجارت پر قانونی پابندیاں عائد کرنی شروع کر دیں، نتیجہ یہ نکلا کہ تاجر پیشہ طبقہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور ۱۶۴۴ء میں انگلستان کی مشہور خانہ جنگی میں انہوں نے فتح پائی اور جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔ اور شاہی نام کو برقرار رکھتے ہوئے شاہی اقتدار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب ان کو اپنی تجارت کے فروغ دینے کا کافی موقع میسر آیا اور قوانینِ حکومت کے ذریعے ان کو بیش از بیش مدد ملی۔

تجارتی دور:

اگرچہ انگلستان کے اس دور میں جاگیرداری سسٹم ختم ہو چکا تھا مگر تجارت کے اس دور میں تجارت کا مفہوم عوام کی فلاح و بہبود نہ تھا بلکہ مخصوص افراد اور خاص طبقہ کی برتری تھا۔ اس لیے اس طبقہ نے ذاتی اور نجی کارخانے کھول کر دولت کمائی شروع کی اور قوانین کی مدد سے اس کی ترقی کے ممکن ذرائع بہم پہنچائے، لیکن ابھی تک چونکہ کارخانوں میں صرف ہاتھ ہی سے کام (Manual Work) ہوتا تھا اس لیے آمدنی

بھی محدود ہوتی تھی اور مال بھی حسبِ ضرورت تیار نہ ہو پاتا تھا اور دولت و سرمایہ کے پجاری (Avaricious) فراوانی دولت کے دوسرے بہترین ذرائع کے لیے بیقراری کے ساتھ متلاشی نظر آتے تھے۔

مشینی دور:

تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد یعنی اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشینوں کی ایجاد شروع ہو گئی۔ اب دستی کارخانوں (Handi Factories) کی جگہ مشینری کارخانوں نے لے لی اور اس طرح ان تاجروں اور سرمایہ داری کے مخصوص طبقہ نے دولت کے بے شمار خزانے حاصل کرنے شروع کر دیئے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب مشینوں کے ذریعے کام شروع ہو گیا تو دست کاروں پر آفت نازل ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو اپنا کام بند کر دینا پڑا اور افلاس کی مصیبت سے محفوظ رہنے کے لیے مشینی کارخانوں میں ایک مزدور کی حیثیت سے وہ اپنی ''محنت'' کو کم سے کم قیمت پر بیچنے کے لیے مجبور ہوئے اور کارخانہ دار ہونے کی بجائے مشین مالک کے غلام بن کر رہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔

اس واقعہ سے ہٹ کر پھر ایک مرتبہ چودھویں صدی عیسوی کی طرف نظر ڈالیے، انگلستان میں اون کی تجارت کے فروغ پا جانے سے زمینداروں کو فراوانی دولت کے لالچ نے مجبور کیا کہ وہ کاشتکاروں سے زمینیں خالی کرائیں اور ان میں ''باڑے'' قائم کر کے بھیڑوں کی پرورش کریں تاکہ اون کی تجارت سے فائدہ اٹھائیں، جو زمینداری آمدنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی، یہ وباء اس قدر پھیلی کہ ہزاروں لاکھوں کسان افلاس اور بھوک کا شکار ہونے لگے اور بیکاری ترقی پانے لگی۔

اب جبکہ مشینوں کا دور شروع ہوا تو زمینداروں نے کاشت بھی مشینوں کے ذریعہ شروع کر دی اور کسانوں کی رہی سہی معاشی سبیل (Economic Means) کو اس طرح ختم کر دیا گیا۔ اب ان کے لیے بھی بجز غلامانہ مزدوری (Slavish Labour) کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ پھر بھی ایک بہت بڑی تعداد کی قوت لایموت کے لیے

سامان مہیا نہ ہوسکا اور طرفہ یہ کہ مشینوں کے اس صنعتی انقلاب نے ان دونوں ''کاریگروں'' (Artisons) اور ''کسانوں'' (Farmers) کو دیہات و قصبات کی آزاد اور پر فضا زندگی کو خیر باد کہہ کر شہروں کے غلیظ اور گندہ مقامات میں غلامی کی طرح آباد ہونا پڑے۔

صنعتی دور:

صنعتی انقلاب کا یہ وہ ابتدائی دور تھا جس میں فیکٹریوں کے متعلق نہ قوانین تھے اور نہ مزدوروں کی ترقی یافتہ یونین تھی۔ لہذا سرمایہ داروں نے من مانی حکومت کی اور اپنی فراوانی دولت کے لیے مزدوروں پر بے پناہ مظالم روا رکھے۔ ان سے چودہ سے لے کر سولہ سترہ گھنٹہ تک عموماً کام لیا جاتا اور بعض اہم کاموں کے موقع پر مسلسل بیس سے تیس گھنٹہ تک بھی ان کو مصروف رہنا پڑتا، اور اس طرح ضعیف و ناتواں افراد بہت جلد موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس بہیمانہ محنت (Beastly Labour) کرانے کے بعد ان کو کم سے کم اجرت دی جاتی تھی۔ اور رہنے کے لیے ایک چھوٹی کوٹھڑی یا ایک ایسا کمرہ دیا جاتا تھا، جس میں بہ مشکل لیٹنے کے لیے جگہ میسر آسکتی تھی اور وہ غلاظت، عفونت اور کمروں میں ہوا کے نفوذ کے لیے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے جہنم زار بنے ہوتے تھے۔

سرمایہ داری دور:

سرمایہ داری کا یہ وہ بھیانک نقشہ ہے جو سب سے پہلے انگلستان میں بروئے کار آیا اور اس کے بعد یورپ کی تمام حکومتوں پر اصول بن کر چھا گیا، چونکہ سرمایہ داری کے اس سسٹم میں مفادِ عامہ (Common Weal) اور عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی سوال ہی نہ تھا، بلکہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تمام ذرائع پیدائش کو اپنی ذاتی مفاد کے لیے خاص کر لیا جاتا تھا اس لیے فیکٹریوں اور مشینوں میں جو سامان تیار ہوتا تھا وہ کم سے کم اجرت دے کر زائد سے زائد مال تیار کرانے اور ذاتی فائدہ

حاصل کرنے کے اصول پر عالم وجود میں آتا تھا۔ اس لیے گوداموں میں مال کی فراوانی ہونے لگی اور نکاسی کی محدود راہوں کی وجہ سے مال ضائع ہونے لگا، نیز اس فراوانی سے مزدوروں اور غریبوں کو مطلق فائدہ نہ پہنچا اور وہ اپنی ضروریات کے لیے ان چیزوں کی خریداری سے اب بھی اسی طرح محروم رہے جس طرح مال کے بنانے کے ابتدائی دور میں تھے۔ [۱]

نوآبادیات کا آغاز (Start of Colonization):

لہذا سرمایہ داری کے اس بھوت نے دوسرے ممالک پر لالچ اور حرص و آز کی نگاہ ڈالنی شروع کر دی اور "ھل من مزید" پکارتے ہوئے ان کو محکوم بنانے کے لیے قدم آگے بڑھایا اور اپنی جوع الارض (زمین کی بھوک) کو پورا کرنے کے لیے اپنے ملک کے آزاد کاروباری لوگوں کو غلام بنانے کے بعد کمزور ملکوں اور قوموں کو غلام بنانا شروع کر دیا اور اٹھارہویں، انیسویں صدی میں افریقہ جیسے براعظم میں یورپین نوآبادیات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہندوستان جیسا بڑا ملک بھی آخر اسی استعمار (Colonialism) کی نظر ہو گیا اور اس طرح تھوڑے سے عرصہ میں ساری دنیا ایک طرح انگلستان کے سرمایہ داروں کی خصوصاً اور دوسری سرمایہ دار طاقتوں کی عموماً تجارتی منڈی بن گئی۔

ذرائع پیداوار کو مخصوص طبقے کی ذاتی ملکیت قرار دینے اور عوام کی بہبودی سے قطع نظر ان کی پیداوار کو نجی اور انفرادی مفاد کی بھینٹ چڑھا دینے کا یہ سسٹم اب بھی مطمئن نہیں ہے اور اب خود آپس میں دست بہ گریباں نظر آتا ہے۔ ہر ایک ملک اپنی اس تجارتی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے جانا چاہتا ہے اور اس دوڑ میں آزاد

---

(۱) یہ بات کہ مشینوں کی بدولت کثرت سے مال تیار ہونے اور گوداموں کے پُر ہو کر مال کے ضائع جانے کی حالت میں مزدور اور غریب کی قوت خرید اس سے فائدہ اٹھا نہیں سکتی اور سابق بدحالی ہی میں گزارتی ہے، تفصیل طلب اقتصادی مسئلہ ہے جو قوت خرید اور توازن تیاری کی بحثوں پر مبنی ہے اس کے لیے اقتصادی معلومات کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (مصنف)

قوموں کو غلام بنانے، تباہ و برباد کرنے اور صفحۂ دنیا سے مٹا دینے کو بھی اپنا جائز حق تصور کرتا ہے۔ جرمنی، اٹلی، انگلستان، فرانس، جاپان، امریکہ وغیرہ فاشیت حکومتوں کی اس مسابقت میں عراق، البانیہ، فلسطین، زیکو سلیو یکیہ، چین اور خود فرانس کا جو حشر ہوا اور ہو رہا ہے وہ اس دعوی کی روشن دلیل ہے۔ (۱)

سرمایہ دارانہ نظام کا اصل روپ:

اس تفصیل سے اب آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ سرمایہ داری نظام (فسطائیت) کیا ہے اور یہ کس طرح آہستہ آہستہ عوام کی تباہی و بربادی کا باعث بنتا اور امن عام کو جنگ کی شعلہ زار ہولناکیوں میں ڈال کر خاکستر بنا دیتا ہے؟ یہ شروع میں تو اپنی شکل و صورت کو جمہوریت کی نام نہاد شکل و صورت میں چھپا کر دنیا کے سامنے آتا اور فریب دے کر عوام کو تباہ کرتا ہے جیسا کہ انگلستان اور امریکہ میں نظر آتا ہے۔ اور جب اس کا مفاد اس شکل و صورت میں خطرہ میں پڑنے لگتا ہے تو صاف کھل کر خالص آمریت (Dictatorship) کے اصل رنگ و روپ میں ظاہر ہو جاتا ہے، جیسا کہ جرمن، اٹلی اور جاپان میں ہو رہا ہے، اس لیے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ جمہوری حکومتیں فسیسزم (فسطائیت) سے الگ کوئی چیز ہیں بلکہ ڈکٹیٹری (آمریت) ہو یا کوئی موجودہ جمہوری نظام ان سب میں وہی سرمایہ دارانہ

(۱) اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے وقت میں تو اس جنگِ عظیم نے بہت ہی بھیانک نقشہ تیار کر دیا ہے اور جوع الارض میں مسابقت اور تنگ و دو کے نتیجہ نے ان طاقتوں کی باہمی رقابت کو ہلاکتِ عالم کا اجارہ دار بنا دیا ہے سچ ہے ”ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ“ خشکی اور تری میں جو فساد برپا ہے یہ انسانوں کے خود اپنے ہاتھوں کا کمایا ہوا ہے۔

اور جبکہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے بساطِ جنگ پر جرمنی، اٹلی اور جاپان کا فاسشزم اور نازی ازم تو شکست کھا کر موت کی آغوش میں جا چکا ہے اور برطانیہ اور امریکہ کی مفروضہ ڈیماکریسی (جمہوریت) فریب آمیز رنگ میں اسی فسطائیت اور نازسیت کا نفرت انگیز مظاہرہ کر رہی ہے اور ایشیائی اقوام کو غلام رکھنے میں ہولناک استبداد کا ثبوت دے رہی ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ روس جو عوام کی فلاح اور انسانی مساوات کا علمبردار بننے کا دعوی کرتا ہے اپنی مکمل مصالح کے پیشِ نظر ان دونوں کا حلیف اور معین بنا ہوا ہے۔ ”ان هذا لشی عجاب“

نظام کار فرما ہے اور ان سب کے پیشِ نظر یہی ایک مقصد ہے (بقول شاعر مشرق علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

بہرحال تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی ابتداء انگلستان سے ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ تمام یورپ پر چھا گیا، اور آج جرمنی و اٹلی اس کے بہت بڑے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور مملکت انگلستان و امریکہ بھی اصولاً ان کی تائید ہی میں ہے اور اگرچہ اس وقت حریف یا باہمی مسابقت میں قریب نظر آتے ہیں لیکن اصول میں متحد و متفق ہیں اور اس طرح جرمنی کا نازی ازم، جمہوریتِ امریکہ، برٹش ڈیماکریسی (British Democracy) و شاہی نظام، اٹلی کی فسطائیت اور جاپان کا شہنشاہیت پسند نظام (Imperialism) یہ سب ایک ہی قسم کی سرمایہ داری کے مختلف نام یا ایک ہی صورت کے مختلف رنگ سے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام (فسطائی نظام) کا اسلامی اقتصادی نظام سے موازنہ:

اس تفصیل کے بعد بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے مقابلے میں ''فسطائیت'' کو پیش کرنا دراصل اقتصادی نظام کی توہین کرنا ہے۔

اسلام میں اگرچہ پیداوار اور ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت (Individual Private Ownership) ایک حد تک جائز رکھی گئی ہے لیکن اس کا جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ انفرادی ملکیت جماعتی مفاد (Collective Welfare) سے کسی حال میں متصادم نہ ہونے پائے، بلکہ اجتماعی مفاد (Social Welfare) کے لیے ممد و معاون اور باعثِ تقویت ثابت ہو۔ اور جس جگہ اس تصادم کا غالب گمان ہو، وہاں اس کے مقابلہ میں جماعتی مفاد کو ترجیح دی جائے اس لیے محض اس جواز کی مشابہت سے اسلامی نظام کو فاشیت کے ہمنوا قرار دینا یا اس کے قریب تر ثابت کرنا اسلام پر بہت بڑا ظلم اور حد درجہ ناانصافی ہے۔ ذیل کے نقشہ سے اس کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام	فسطائی اقتصادی نظام
① دولت و ذرائع دولت کا مخصوص طبقہ میں محدود ہو کر عوام کی معاشی ہلاکت کا باعث بننا حرام ہے۔	① دولت و ذرائع دولت کو مخصوص طبقہ کی انفرادی و اجتماعی اغراض کے لیے ہونا از بس ضروری ہے۔
② انفرادی ملکیت پر شرائط کی حدود عائد ہیں۔	② انفرادی ملکیت لامحدود ہے۔
③ انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق کے زیر اثر ہے۔	③ انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق اور مفادِ عامہ سے مستغنی و بالاتر (Over & Above) ہے۔
④ اقتصادی نظام کی بنیاد عوام کے مفاد اور حاجات کے انسداد (Fulfillment of Needs) پر قائم ہے۔	④ اقتصادی نصام کی بنیاد مخصوص افراد اور خاص طبقہ کے مفاد پر قائم ہے۔
⑤ عام معاشی خوشحالی (Common Weal) ضروری ہے۔	⑤ عوام کی معاشی تباہی (Economic Crisis) و کساد بازاری (Commercial Decline) اس کا لازمی نتیجہ ہے۔
⑥ معاشی دستبرد (Economic Exploitation) کے ذریعہ حاکمیت و محکومیت اقوام لعنت ہے۔	⑥ معاشی دستبرد کے ذریعے غلامی اور اقوام کی محکومی لازمی و ضروری ہے۔

⑦ اکتناز (جمع خزانہ) واحتکار (اجتماعی حقوق سے باز رہنا) کی مطلق گنجائش نہیں۔	⑦ اکتناز و احتکار ضروری اور موجبِ سعادت امورِ اقتصادی ہیں۔
⑧ نسلی، خاندانی اور جغرافیائی، امتیازات اس سلسلہ میں قابلِ تسلیم نہیں۔	⑧ نسلی، جغرافیائی اور طبقاتی امتیازات ضروری ہیں۔

خلاصہ بحث:

ان امتیازات سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام اور فسطائی سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان کوئی ایسی مشترک کڑی (Common Feature) نہیں پائی جاتی جس کی بدولت ان دونوں میں کسی قسم کی بھی مفاہمت (Compromise) ممکن ہو سکے، اسی لیے یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایسے نظام کو اسلامی اقتصادی نظام کے ساتھ کس طرح جوڑا جا سکتا ہے جو چند سو یا چند ہزار یا چند لاکھ انسانوں کی خوشحالی، عیش پسندی اور راحت کوشی کی قربان گاہ پر کروڑوں انسانوں کو بھینٹ چڑھادے، اور صرف یہی نہیں بلکہ عام کساد بازاری اور بیروزگاری کا باعث بن کر دنیا کے امن و امان کی تباہی و بربادی اور مظلوموں کو محکوم بنا کر ظالم کے ہاتھوں ہلاکت آفرینی کا موقع بہم پہنچائے۔

اشتراکیت (Socialism):

مختصر تعارف:

سرمایہ دارانہ نظام کے اس ظالمانہ دستبرد نے آخر مزدوروں اور غریبوں میں بھی شعور، احساس اور بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا اور انہوں نے ردِ عمل کے طور پر حقوق کے نام سے شور و غوغا مچایا، مجالس اور یونینیں قائم کیں، بغاوتیں کیں اور اٹھارہویں صدی کے آخر ہی سے شوشلزم کے نظریہ نے ان کی حمایت شروع کر دی اور روس جیسے بڑے ملک میں اس بیسویں صدی میں انقلاب برپا ہونے کے بعد کارل مارکس (Karl Marx) کے نظریہ "شوشلزم" کے ماتحت جدید اقتصادی نظام بھی قائم ہو گیا۔

جس کا دعوی یہ ہے کہ وہ مفادِ عامہ کا داعی اور مزدوروں، کسانوں اور پست مظلوم طبقوں کا حامی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا اس سے بھی موازنہ کیا جائے اور محض مذہب کے اتباع اور حسنِ ظن کی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ دونوں نظامہائے اقتصادی کے اصولوں اور عملی تجربوں کے زیرِ اثر عدل و انصاف کے ساتھ محاکمہ اور تبصرہ کیا جائے۔

مختصر تاریخ:

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سوشلزم کی تاریخ کا آغاز بھی اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ہی ہو جاتا ہے "ہیگل" [1] نے اس کو اول ایک علمی نظریہ (Theory) کی شکل میں پیش کیا اور اقتصادی امور میں بنیاد قرار دیا اور اس کے اس نظریہ کو اقتصادی زندگی بخشنے بلکہ معاشرتی اصول بنانے اور تمدنی پروگرام میں ڈھالنے والا شخص "کارل مارکس" ہے [2] اور یہی نظریہ آج کل کمیونزم کی شکل میں روس پر حاوی ہے اور دنیا میں

(۱) ہیگل، جورج ولہلم فریڈرک (Georg Wilhelm Friedrich Hagel) (۱۷۷۰ــــ ۱۸۳۱م) مشہور جرمن فلسفی اور معیشت دان تھا۔ دراصل سوشلزم کی بنیاد اور اسے علمی اور منطقی مواد فراہم کرنے والا ہی شخص تھا۔ اس نے سوشلزم کی ابتداء اپنے نظریہ "جدلی منطق" سے کی جس کے مطابق تمام معاشی نظام بنتے، کمزور اور ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے معاشی نظام لے لیتے ہیں۔ اس کی ساری منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی ایک معاشی نظام اپنی تعلیمات اور نظریات کے ساتھ آتا ہے، لوگ اس کے پیروکار بن کر اس کے معاون بن جاتے ہیں کچھ عرصہ بعد ـــــ جغرافیائی یا قدرتی یا انسانی ذرائع کی تبدیلی کی وجہ سے وہ نظام کمزور یا غیر مقبول ہو جاتا ہے، ایک دوسرا نظام آتا ہے کچھ لوگ اس کے پیروکار بن جاتے ہیں، کچھ پہلے نظام سے چمٹے رہتے ہیں، دونوں نظاموں کے پیروکاروں میں جدل (جنگ) ہوتی ہے، بعد میں آنے والے نظام کے پیرو کار پہلے پرانے نظام کے پیرو کاروں کو ہرا کر دوسرا نظام لاگو کر دیتے ہیں۔ اور ہیگل کے مطابق یہ قصہ ابتدائے آفرینش (دنیا) سے چل رہا ہے، اور چلتا رہے گا، ہیگل کے اس نظریہ کی رو سے تمام دنیوی جنگوں اور اختلافات کا موجب یہی معاشی نظام ہی ہوتا ہے۔

دراصل وہ اس بعید از قیاس اور دور از کار نظریہ کی آڑ میں کہنا یہ چاہتا ہے کہ سوشلزم کے پرچاک اس نظام کو لاگو کرنے کے لیے پہلے تمام معاشی نظاموں ـــــ اور کوئی ہیں تو ـــــ کے ماننے والوں سے جنگ و جدال کریں اور سوشلزم کو کامیاب کریں کیونکہ یہی نظام ان کے معاشی دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے۔

(۲) فریڈرک انگلز (Engels Friedrich) (۱۸۲۰ــــ ۱۸۹۵م) مشہور جرمن معیشت دان کارل مارکس کے =

انقلاب برپا کرنے میں مشغول و مصروف نظر آتا ہے۔[1]

اسلام کا اقتصادی نظام اور سوشلزم:

گزشتہ صفحات میں جو اشارات اس سلسلہ میں سپرد قلم کیے گئے ہیں ان سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام جس مکمل قانون کا نام ہے اس کے ساتھ اشتراکیت (کمیونزم) کا بھی رابطہ اتحاد ناممکن ہے، اس لیے کہ کارل مارکس اور دوسرے اشتراکی راہنماؤں نے جس فلسفہ پر (مارکسزم) کی بنیاد قائم کی ہے اس میں خدا سے انکار اور الہیات کی نفی (Negation) صفِ اول میں درجہ پاتے ہیں اور اس لیے اس کا علم الاخلاق بھی اسی روشنی میں مہذب و مرتب کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے فلسفہ لادینیت کے ساتھ اسلام کا کوئی رابطہ اور تعلق قائم نہیں ہو سکتا، لیکن جب ہم اس فلسفہ کے فقط اقتصادی پہلو سے بحث کرتے ہیں اور دنیا کے دوسرے غیر اسلامی نظامہائے معاشی کے مقابلہ میں اس کو پیشِ نظر لاتے ہیں تو اس وقت ہم کو اس حقیقتِ ثابتہ (Acknowledged Reality) کے اظہار میں کوئی باک (Hesitation) نہ ہونا چاہیے کہ اس میں شک نہیں کہ اقتصادی نظام کے بہت سے امور میں اسلام اور اشتراکیت باہم متقارب (Complementary) نظر آتے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف دونوں ہم آہنگ ہیں اگرچہ بطریقِ کار کے اختلاف سے دونوں کی راہیں اس وادی میں قطعاً جدا جدا ہیں۔

دست راست تصور کیے جاتے تھے۔ ان علمی و عملی جدوجہد کا بھی اس تحریک میں بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سوشلزم کی تحریک و اشاعت میں ایک بڑا نام فرانسیسی معیشت دان فوریر شارل (۱۷۷۲ــــــ۱۸۳۷) (Fourier Charles) کا ہے، جس نے سوشلزم کے پرچار اور اس کی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ (منیر بعلبکی، المورد، جزو "معجم اعلام" حصہ F)

(۱) اگرچہ آج جرمنی کے جارحانہ اقدام کا بری طرح شکار ہے۔ (مصنف)

یہ حضرت مصنف رحمہ اللہ کی رائے آج سے ۷۰، ۲۷ سال قبل کی تھی، جب اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا تھا۔ مگر آج کا روس اس دور کا "سویت اشتراکی جمہوریاؤں کا اتحاد" (USSR. Union of Soviet Socialist Republic) نہیں رہا، نہ اشتراکی نقلابات کی بات۔ مزید تفصیل کے لیے پہلے باب کا حاشیہ دیکھیں۔

بظاہر مشترکہ امور:

اسلامی نظامِ اقتصادی اور اشتراکی نظامِ اقتصادی کے درمیان جن امور میں اتفاق ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

1. اکتناز اور احتکار یا جمع دولت اور مخصوص طبقہ میں دولت کی تحدید، نہ یہ جائز قرار دیتا ہے اور نہ وہ، دونوں ان ہر دو امور کو باطل اور اقتصادی زندگی کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں۔
2. دونوں ضروری سمجھتے ہیں کہ اقتصادی نظام کی اساس و بنیاد عام معاشی مفاد پر قائم ہو اور ہر شخص کو معاش سے حصہ ملے اور کوئی شخص بھی اس سے محروم نہ رہے۔
3. دونوں کا یہ دعوی ہے کہ اقتصادی نظام کے دائرہ میں تمام انسانی دنیا جغرافیائی طبقاتی اور نسلی و خاندانی امتیازات سے یکسر جدا ہو کر یکساں اور برابر حیثیت میں شمار ہو۔
4. ان دونوں کے درمیان اس میں بھی اتفاق ہے کہ جماعتی حقوق انفرادی حقوق پر مقدم ہوں۔
5. ان دونوں کے درمیان یہ بھی مسلم ہے کہ معاشی دستبرد کے ذریعہ حاکم و محکوم اور غلام و آقا کا سسٹم قائم نہ ہو سکے اور قائم شدہ کو مٹا دیا جائے۔

اختلافی امور:

یہ وہ امور ہیں جن میں دونوں اقتصادی نظام ہم آہنگ نظر آتے ہیں لیکن دو امر ایسے ہیں کہ جن میں ان دونوں کے درمیان بنیادی اور اساسی اختلاف ہے اور ان ہر دو امور میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح مطابقت نہیں پیدا کی جا سکتی اور یہ اختلاف اس وقت اور زیادہ وضاحت کے ساتھ رونما ہو جاتا ہے جبکہ سوشلزم کا آخری درجہ ”کمیونزم“ کی شکل میں سامنے آتا ہے اور جس کا تجربہ آج کل روس میں کیا جا رہا ہے:

اسلامی اقتصادی نظام	اشتراکی اقتصادی نظام
① دولت و ذرائع دولت میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حدود قائم کردی جائیں۔	① دولت و ذرائع دولت سے انفرادی ملکیت کو مٹا دیا جائے۔
② حق معیشت کی مساوات کے اعتراف کے ساتھ بلحاظِ معیشت، اختلاف مدارج تسلیم کرتے ہوئے احتکار کو روکا جائے۔	② بلحاظِ معیشت اختلافِ درجات کا انکار کیا جائے اور معاشی لحاظ سے بھی سوسائٹی میں مساوات تسلیم کی جائے۔

انفرادی ملکیت کا مسئلہ:

پہلا اختلافی مسئلہ اس طرح قابلِ غور ہے کہ اگر آمدنی اور ذرائع آمدنی پر انفرادی ملکیت کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو عقل اور تجربہ اس طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ ایسا ہو جانے کے بعد ذرائع پیداوار اور آمدنی میں بہت بڑا اختلال (Helter- Skelter) اور اضمحلال (Decline) پیدا ہو جائے گا اس لیے کہ انفرادی ملکیت کے نظام کو یکسر تباہ و برباد کرنے اور اس تمام سلسلہ کو اسٹیٹ کے حوالہ کر دینے کے بعد انسانوں کے قوائے عمل میں وہ زبردست تحریک پیدا نہیں ہو سکتی جو انفرادی ملکیت کی مسابقت کی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ جبکہ میری تمام ذاتی جد و جہد اور حاجات و ضروریات کا عملی نظام اسٹیٹ کے ذمہ اور صرف اس کے ہاتھ میں ہے تو میں کس لیے اپنے قواءِ دماغی (Intellectual Powers) قواءِ جسمانی (Physical Powers) اور قواءِ عملی (Practical Powers) کو زیادہ محنت میں لگاؤں اور تنازع للبقاء (Struggle for Survival) کے اس میدان میں کس لیے گوئے مسابقت (Victory) حاصل کرنے کی سعی کروں۔

لیکن اس کے برعکس انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی مسابقت اور دوڑ میں جو خرابی پیدا ہونے اور اجتماعی نقصانات کے بروئے کار آنے کے اندیشے پائے جاتے ہیں، اگر ان کا انسداد ضروری قرار دے کر قواءِ عملی و دماغی کو بھی اپنی فطری نشو و

نما (Natural Growth) کے مطابق کام کرنے کے لیے موقع بہم پہنچایا جائے تو یہ طریقِ کار ہی صحیح طریقِ کار ہو سکتا ہے، چنانچہ روس کے گزشتہ دس سالہ پروگرام کی ترمیم نے بھی اس کی تصدیق اس طرح کر دی ہے کہ بہت سی زمینیں معطل (Waste) رہ جانے اور ذرائع پیداوار میں رفتار کے سست پڑ جانے کی وجہ سے اب جدید دس سالہ پروگرام میں ایک حد تک زمینوں میں انفرادی قبضہ کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور بعض مقامات پر ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت داخل ہونے لگی ہے اور تجربہ سے حقائق تک پہنچنے کی اگر یہی طلب صادق رہی تو وہ وقت دور نہیں کہ اسلام کے نظریہ اور اصول ہی کو اصولِ کار بنانا پڑے۔

اس لیے قرآن عزیز نے باوجود اس بات کے تسلیم کر لینے کے کہ اصل ملکیت صرف خدا کی ہے اور اسی لیے تمہاری انفرادی ملکیت میں خدا کی عام مخلوق کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس میں اجتماعی حقوق مقدم ہیں، ذاتی ملکیت کا اعتراف و اقرار کر کے انسان کے فطری قوائے عملی و دماغی (Natural Practical & Intallectual Powers) میں مسابقت (Competition) کا جذبہ پیدا کیا جائے ان کو کشمکشِ حیات (Struggle for Life) میں داخل کر کے ان پر حصولِ معاش کی راہیں کھول دیں، نیز عقل و تجربہ کی بنا پر یہی راہ صحیح اور درست ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جائے اور پھر اس پر یہ جماعتی بوجھ ڈالا جائے۔

﴿لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾[1]

ترجمہ: تم ہرگز بھلائی کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنے پسندیدہ اور محبوب مال میں سے خرچ نہ کرو۔

اور قانونی و غیر قانونی ضابطوں کے ذریعہ انفرادی ملکیت کا رخ بھی جماعتی فلاح اور بہبودی عامہ کی طرف پھیر دیا جائے اس موقعہ پر اس اندیشہ کا اظہار کیا جاتا ہے یہ

---

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۹۲

ایسی حالت میں تو ممکن ہے کہ انفرادی ملکیت کو تو کسی حالت تک تسلیم کر لیا جائے لیکن اس کے غیر محدود ہونے اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے حیلہ بن جانے کے انسدادی قوانین موجود نہ ہوں لیکن جب اسلام انفرادی ملکیت کو محدود صورت میں تسلیم کرنے کے بعد اقتصادی نظام میں ایسی دفعاتِ قانونی بھی بیان کرتا ہے جو انفرادیت کو اجتماعیت پر قابو پانے سے روکتی اور سرمایہ دارانہ نظام کا سر کچلتے رہنے کے لیے اپنی قانونی تیشہ سے کام لیتی رہتی ہیں تو پھر ایک وہمی اندیشہ کی بنا پر انسانوں کو ان کے فطری حق سے روک دینا ظلم ہے اور راہِ عدل سے ہٹ کر افراط و تفریط کے غار میں گر جانا ہے۔

معاشی درجہ بندی:

دوسرا اختلاف "معیشت کے درجات" سے متعلق ہے، اسلام حقِ معیشت کی مساوات کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ ضروری قرار دیتا ہے، لیکن مدارجِ معیشت میں مساوات کا قائل نہیں ہے یعنی وہ اس کو نہیں مانتا کہ یہ ضروری ہے کہ سب کو ایک ہی طرح پر سامانِ معیشت حاصل ہو لیکن یہ ضروری سمجھتا ہے کہ سب کو ملے، اور جدوجہد اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر سب کے سامنے کھل جائیں، اس کے برعکس سوشلزم حقِ معیشت کی مساوات کے ساتھ نفسِ معیشت کی بھی مساوات کا قائل ہے اور مدارجِ معیشت کا قطعاً انکار کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ احوالِ معیشت کا یہ اختلاف قدرتی نہیں ہے بلکہ سوسائٹی کا خود پیدا کردہ ہے، پس اگر آئندہ سوسائٹی کا نظامِ معیشت مساوات کے اصول پر قائم کر دیا جائے تو دوسری طرح کے محرکاتِ ذہنی پیدا ہو جائیں گے اور کارخانۂ معیشت کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں گی جس طرح آج جاری ہیں۔

اس دوسری صورتِ اختلاف کو بھی غائر نظر سے دیکھا جائے تو اقرار کرنا پڑے گا کہ اس میں بھی اسلام کی بتائی ہوئی راہ ہی صحیح ہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام انسانوں کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں ہے اور جب استعداد یکساں نہیں

ہے تو سعی معیشت (Economic Struggle) کے نتائج و ثمرات کا اختلاف بھی ضروری اور ناگزیر ہے اور ایسی صورت میں سوسائٹی کا ایسا نظام قائم کرنا جس کی بنیاد معیشت کی مساوات پر ہو کسی طرح بھی صحیح اور درست نہیں ہے اور یہ کہنا بھی ناقابلِ قبول ہے کہ اس قسم کے نظام کے بعد ذہنی و معنوی محرکات (Intellectual & Metaphorical Motives) میں بھی ایسی تبدیلی ہو جائے گی کہ جس سے معیشت کا کارخانہ اسی طرح سرگرمی سے جاری رہے گا۔

بہرحال جسمانی و دماغی استعداد کے اختلاف کو مان لینے کے بعد معیشت کا اختلاف بالکل فطری ہو جاتا ہے، اسی لیے قرآنِ عزیز نے اس طرف راہنمائی کی ہے کہ یہ اختلاف قدرتی ہے۔ اور کارخانۂ عالم کی فطری قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لیے ایسا ہونا ضروری تھا، اگر یہ نہ ہوتا اور سب کی حالت یکساں ہوتی تو مسابقت اور مزاحمت (Competition & Resistance) کی حالت کبھی پیدا نہ ہوتی اور ان قوتوں کو ابھرنے کا موقعہ کبھی نہ ملتا اور اگر یہ موقعہ میسر نہ آتا تو اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں سرد ہو کر رہ جاتیں، جس پر نظامِ عالم کا یہ کارخانہ چل رہا ہے:

❶ ﴿وَٱللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِى ٱلرِّزْقِ ۚ﴾ (۱)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔

❷ ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَـٰتٍ﴾ (۲)

ترجمہ: ہم نے دنیوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے اور ان سب کو یکساں درجہ میں نہیں رکھا بلکہ بعض کو بعض پر برتری دی ہے۔

---

(۱) سورۃ النحل (۱۶): ۷۱

(۲) سورۃ الزخرف (۴۳): ۳۲

۳ ﴿وَهُوَ ٱلَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ ٱلْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ ٱلْعِقَابِ وَإِنَّهُۥ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٥﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے بلاشبہ تمہارا پروردگار (بدعملیوں کی) فوراً سزا دینے والا اور بلاشبہ وہ بڑا ہی بخش دینے والا رحمت والا ہے۔

ان تمام آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے اس چکر میں ایک دوسرے کی جانشینی کا سلسلہ قائم ہے یعنی ایک جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اور اس کے ثمرات کا وارث بنتا ہے اور یہ کہ تمام انسان درجہ کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں، نیز یہ کہ معیشت کے مدارج کی یہ اونچ نیچ اس لیے قائم کی گئی ہے تاکہ انسان کو اس کے عمل و تصرف میں آزمایا جائے اور یہ موقعہ دیا جائے کہ جس درجہ کو وہ اپنی سعی عمل سے حاصل کر سکتا ہے کر لے اور یہ بھی امتحان لیا جائے کہ وہ ان تفاوتِ درجات کی موجودگی میں کس حالت میں خدا سے غافل رہتا ہے اور کس حالت میں نہیں رہتا۔

خلاصہ بحث:

بہرحال اسلام کے اقتصادی نظام اور سوشلزم کے اقتصادی نظام کا مقصد اگرچہ ایک نظر آتا ہے، وہ یہ کہ عام انسانی افراد کی مالی تباہی، افلاس اور بدبختی کو دور کیا جائے اور ان کی بھاری اکثریت کی بدحالی کو ختم کیا جائے اور دونوں نے علاج بھی ایک ہی تجویز کیا ہے کہ مذموم سرمایہ داری کو ختم کیا جائے، یعنی "جمع دولت" اور اکتناز کو باقی نہ چھوڑا جائے لیکن طریقِ کار میں دونوں کے درمیان یہ دو بنیادی اختلاف ضرور

(۱) سورۃ الانعام (٦): ١٦٥

پائے جاتے ہیں کہ ایک معیشت کے اختلاف کو قبول کرتا اور انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اور دوسرا ان دونوں کا انکار کر کے ان کو فنا کرنا چاہتا ہے، اسلام نے حقِ معیشت کی مساوات کو تسلیم کیا اور سعی و ترقی کی راہیں سب کے لیے یکساں طور پر کھلی رکھیں اور اس نے احتکار کی وہ تمام رکاوٹیں ختم کر دیں جن کی بدولت خاص افراد یا گروہ نے کمزور افراد اور گروہ کی خوشحالی و ترقی میں قائم کر رکھی تھیں اس نے قانون سازی کے ذریعے زکوٰۃ اور وراثت اور بعض تجارتی اصولوں کو لازم قرار دے کر اور سود قمار اور اس قسم کے تمام کاروبار کو ناجائز بتا کر اکتناز و احتکار کو فنا کر دیا اور تمام ایسی بے اعتدالانہ راہوں کا سدباب کر دیا جو ظالمانہ سرمایہ داری کا موجب بنتی ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سوشلزم کے مسطورہ بالا ہر دو اصول دراصل اس نظام اور اس سوسائٹی بلکہ اس مذہبی گروہ کے مقابلہ میں انتقامانہ جذبات (Retaliative Passions) کے ماتحت اصول قرار پائے ہیں جن کے ظالمانہ ماحول سے متاثر ہو کر کارل مارکس اور ہیگل نے اپنے نظریوں کا اختراع کیا ورنہ یہ ہر دو اصول نہ عملی تجربہ کی خراد پر ٹھیک اترتے ہیں اور نہ عقلی دلائل کی روشنی میں صحیح نظر آتے ہیں اور اس لیے راہِ حق کے قطعاً خلاف اور اعتدال کے منافی ہیں۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا مختصر خاکہ:

اب ان تمام ایں و آں کے بعد اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی اور اصولی خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے:

❶ اکتناز (جمع دولت) اور احتکار (خاص افراد یا طبقات میں دولت کا محصور ہو جانا) ممنوع ہے یعنی سرمایہ داری کے مسطورۂ بالا طریقوں کو کسی حال میں وجود پذیر نہ ہونے دیا جائے اور اگر پہلے سے موجود ہوں تو اُن کو فوراً فنا کر دیا جائے اور اس نظریہ کو کامیاب بنانے کے لیے قانونی اور اخلاقی طور پر زکوٰۃ، وراثت، وقف، انفاق فی سبیل اللہ کو نافذ کیا جائے، سود اور اس کی تمام شکلوں، قمار اور اس کی تمام صورتوں کو ممنوع اور موجودہ تعلقہ داری کے جابرانہ سسٹم کو ختم کر دیا جائے۔

❷ معیشت میں اختلافِ مدارج کو تسلیم کرتے ہوئے حقِ معیشت میں مساوات کو ضروری اور فطری عقیدہ تسلیم کیا جائے تاکہ سرمایہ اور محنت میں صحیح توازن قائم رہ سکے اور سرمایہ کسی وقت بھی محنت کو اپنی خود غرضانہ ہوس کا آلۂ کار نہ بنا سکے اور عام خوشحالی پیدا ہو جائے اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے ان تمام قوانین کو ضروری قرار دیا جائے جو کانوں، کارخانوں اور فیکٹریوں اور امداد باہمی کے بارہ میں بیان کیے جا چکے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کو قوت پہنچانے والے تمام کاروبارِ تجارت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

❸ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایسی قیود اور پابندیاں عائد کی جائیں جن سے اس کا مفاد ''اجتماعی مفاد'' کے زیرِ اثر آجائے اور خود غرضانہ جراثیم کو کسی قسم کی مدد نہ ملنے پائے اور اس کو قائم کرنے کے لیے شخصی زمینوں، ذاتی کمپنیوں اور ذاتی تجارتوں سے متعلق بیان کردہ احکام کو نافذ کیا جائے۔

❹ ان اصولوں کو قائم کرنے کے لیے ایسے طرزِ حکومت کو رائج کیا جائے جو خدا کی مخلوق (پبلک) کے سامنے جواب دہ ہو، حاکمیت کی جگہ خدمت اس کا نصب العین ہو، رعایا کے ہر فرد کی معاش کا متکفل (Maintainer) ہو، عوام کا نمائندہ ہو اور عادلانہ نظام کے قوانین کی قوتِ نفاذ کے علاوہ تمام امور میں خلیفۂ عمالِ حکومت اور رعایا کے حقوق ''اس میں'' یکساں ہوں اور اس طرزِ حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے بیت المال، سرکاری وظائف، اعداد و شمار کی تکمیل اور اس قسم کے دوسرے بیان کردہ وسائل و ذرائع کو اختیار کیا جائے اور موجودہ تمام جابرانہ و سرمایہ دارانہ نظامہائے حکومت اور ریاستی سسٹم کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا جائے[1] اس اجمالی خاکہ کو مندرجہ

(۱) لطیفہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرماتے ہیں، یہ مکاشفہ ان کو اس وقت ہوا تھا جبکہ وہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر دربارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض سے مستفید ہو رہے تھے، فرماتے ہیں: ''مجھ پر نیند میں ایک کیفیت طاری ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں نظام عالم میں خدا کی مشیت کو پورا کرنے کے لیے ''امام'' بنا دیا گیا ہوں'' (اس کے بعد غلبۂ کفار اور مسلمانوں کی مغلوبیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں) اس غیظ و غضب کی حالت میں مسلمانوں نے مجھ سے دریافت کیا

ذیل اجمالی نقشہ کی شکل میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی نقشہ

اعلاء کلمۃ اللہ وخدمت خلق

❶ ہر شخص کی معاشی کفالت کے اصول پر شوروی حکومت کا قیام۔

❷ خلیفہ، عمالِ حکومت اور رعایا کے اقتصادی حقوق میں یکسانیت و مساوات کے اصول کا لزوم۔

❸ بیروزگاروں اور حاجت مندوں کی کفالت عام، عسکری نظام کی ضرورت اور اجتماعی خدمت کے پیشِ نظر اعداد و شمار کی ترتیب ووظائف کا قیام۔

❹ زکوٰۃ، میراث، وقف، انفاق کے قانونِ وجوب کے اصول پر ''اکتناز'' یعنی سرمایہ داری کا انسداد۔

❺ سود، قمار، منشیات کی بیع و شراء تجارتی و صنعتی بد عنوانیوں کی قانونی حرمت کے اصول پر ''احتکار'' سرمایہ داری کے دوسرے نقطہ کا انسداد۔

❻ کانوں، فیکٹریوں، کارخانوں، ملوں زمینوں، انفرادی حقوق کے مقابلہ میں اجتماعی حقوق کی ترجیح کا اعتراف وقیام اور اس کی عملی تشکیل۔

❼ انفرادی ملکیت کے لیے تجارت اور دیگر کاروبار میں شرکتِ نفع کے اصول پر سرمایہ و محنت کے عادلانہ توازن کا قیام۔

❽ آمدنی و ذرائع آمدنی میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے سرمایہ داری کے اصول کے انکار پر ان کی تحدید و تعیین۔

❾ مدارجِ معیشت کے اعتراف کے ساتھ طبقاتی، نسلی و جغرافیائی قسم کے

کہ اب اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟ ''ماذا حکم اللہ فی هذه الساعة''، میں نے جواب دیا ''فك كل نظام''، یعنی کسی عادلانہ نظام قائم کرنے سے پہلے سب سے اہم فرض یہ ہے کہ انقلاب پیدا کر کے موجودہ دنیا کے تمام نظامہائے حکومت کو درہم برہم کر دیا جائے۔ (فیوض الحرمین: ص ۸۹)

امتیازات کے انسداد کے اصول پر حقِ معیشت میں یکسانیت و مساوات کا قانونی قیام۔

⑩ ریاستی و تعلقہ داری سسٹم کا انسداد۔

⑪ امداد باہمی کے اصول پر غیر سودی انجمنوں کے قیام اور شرکتِ نفع کے صحیح اصول پر تجارتی کاروبار کا فروغ۔

⑫ غیر سرمایہ دارانہ اصول پر تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے لیے اسباب کی فراہمی کا لزوم و وجوب۔

⑬ عصبیت قومی کے انکار اور اخوتِ عام کے اصول پر غیر ترجیحی اور آزاد تجارت کی حمایت۔

⑭ کاروبار کے لیے سکہ و ٹکسال کا قیام اور عوام کو ٹکسال میں سکہ بنانے کی اجازت اور شرح مبادلہ میں عادلانہ اصول کا اجراء۔

⑮ رفاہِ عامہ، اجتماعی ضروریات، انفرادی حاجات اور حکومت کی ضروریات کی کفالت کے لیے بیت المال کا قیام۔

⑯ خلیفہ عمالِ حکومت اور تمام انسانوں میں عیش پسندی کے وسائل کو قانون و اخلاق کے ذریعہ مٹا کر سادہ زندگی کی شاہراہ پر قائم کرنا۔

پس جس اقتصادی نظام میں افراط و تفریط کا شائبہ نہ ہو، اس کی اساس و بنیاد ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر انتقامانہ جذبات پر قائم نہ ہو، وہ ایسے طرزِ حکومت کا حامی ہو جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کے لیے مساوی حقوق کا حکم دیا گیا ہو، وہ تمام انسانوں کی معاشی زندگی کا متکفل اور خوشحالی کا ضامن ہو، مخصوص افراد و طبقات میں جمع دولت اور حصر دولت (Concentration of Wealth) کے وجود کو فنا کرتا اور اکتناز و احتکار کی بنیادوں کو مٹاتا ہو، وہی اس قابل ہے کہ دنیا کی معاشی زندگی کا کارخانہ بہتر طریقہ پر چلا سکے اور سرمایہ و محنت کی کش مکش کا عمدہ طور پر حل کر سکے اور اس کا دائرہ عمل ہمہ گیر اور عالمگیر ہو اور وہی دنیا کی اقتصادی ساکھ کو بحال کر کے عام خوشحالی اور مسرور زندگی کا ضامن بنے، ایسے ہی نظام کا دوسرا نام "اسلام کا اقتصادی نظام" ہے

اور اسی کی سربلندی کی دعوت میری اس جنبشِ قلم کا مقصدِ عظمیٰ اور مثلِ اعلیٰ ہے۔
"واللّٰہ بصیر بالعباد" (اور اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے)

احساسِ فرض:

میری اس کدو کاوش کا مقصد علمی تفریح اور اسلامی لٹریچر میں اضافہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک صدائے قلب ہے جو صرف اس لیے تہ قلب سے نکل کر نوکِ قلم پر آئی ہے کہ تمنا اور آرزو یہ ہے کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے پھر اس بھولے ہوئے سبق کی یاد تازہ ہو جس نے تیس سالہ پاک حکومت کے دور میں ایران، فارس، سندھ و مکران، روم، مصر، شام، عراق اور سرزمین عرب کے گوشہ گوشہ میں امن و اطمینان، خوشحالی و خوشدلی پیدا کر دی تھی اور جس نے سرمایہ و محنت اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان عدل کی ترازو اس طرح قائم کی تھی کہ اس دور میں نہ طبقاتی جنگ کی ضرورت پیش آئی اور نہ موجودہ کشمکش ہی کا ہنگامہ برپا ہوا، کیونکہ وہاں نہ صرف سرمایہ داری کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ غریبوں کو اپنی اغراض پر قربان کر سکے اور نہ مزدور و محنت کش کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ غیر کی ملکیت پر قابض ہونے کے خواب دیکھے، بلکہ اس نظام میں تمام ملکوں، شہروں اور آبادیوں میں ایک ایسی درمیانی حالت قائم ہو گئی تھی کہ اختلافِ مدارج کے باوجود سب خوشحال تھے، چین و آرام ہر ایک کو میسر تھا، زکوٰۃ و خیرات دینے والے بہت تھے مگر لینے والا ایک بھی میسر نہ تھا۔ پس اگر فیسزم جرمنی و اٹلی پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اگر سوشلزم روس پر تسلط جما سکتا ہے تو اسلام کا اقتصادی نظام کیوں (پاکستان) ترکی، ایران، افغانستان، مصر یا حجاز و یمن پر نہیں چھا سکتا؟ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ ہماری آواز ان آزاد حکومتوں تک پہنچے اور کوئی ایک سلطنت ہی یورپین نظامہائے اقتصادی سے مرعوب ہوئے بغیر اسلام کے اقتصادی نظام کو بروئے کار لائے، دنیا کے سامنے نمونہ بن کر دکھلائے اور بتائے کہ محنت و سرمایہ کی کشمکش کے انسداد اور عام خوشحالی کی ضمانت کے لیے اس سے بہتر کوئی "نسخۂ کیمیا" نہیں

ہے یا پھر عام مسلمان خدا کا نام لے کر اٹھیں اور اپنا فرض ادا کریں۔ ''وما علینا الا البلاغ''

﴿وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿١٢٧﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور میں تم سے اس کا عوض نہیں چاہتا، میرا اجر تو خدا کے علاوہ اور کسی کے ذمہ نہیں ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہم نے ہمت کا قدم آگے بڑھایا تو خدا کی حمایت و نصرت ہمارے ساتھ ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُوا۟ وَلَا تَحْزَنُوا۟ وَأَنتُمُ ٱلْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾﴾ (۲)

ترجمہ: نہ پست ہمت بنو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی سربلند ہو گے اگر تم سچے مسلمان ہو۔

☆☆☆

(۱) سورۃ الشعراء (۲۶): ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴ اور ۱۸۰

(۲) سورۃ آل عمران (۳): ۱۳۹

باب ــــ ⑭

ہند میں معاشی مسئلہ کا حل

گذشتہ ابواب میں جن جذبات کے تحت ممالک اسلامی میں اپیل کی گئی اور ان کے سامنے اسلام کا اہم مطالبہ کیا گیا۔ اسلام ہم سے بھی اسی مطالبہ کا حق دار ہے۔

البتہ اداء فرض میں آزاد اسلامی ممالک اور ہمارے (محکوم ممالک کے مسلمان شہریوں کے) درمیان نمایاں فرق ہے کہ ان کے سامنے صرف طرز حکومت کے رخ بدل دینے کا سوال ہے اور ہم ابھی اپنی محکومیت کا شکار اور حکومت تسلطہ (اقتدار پر مسلط و قابض حکومت) کے زیر اقتدار ہیں اور محکومیت پر مزید یہ کہ بعض غیر مسلم ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں محکوم ہیں (ان) پورے ممالک میں مسلمان اور غیر مسلم اقوام (یا شہریوں کے درمیان) چولی دامن کا ساتھ ہے۔[1]

اس لیے اس سے قطع نظر کہ ہندوستان (جیسے ملک) کے آئندہ نظامِ حکومت کا خاکہ کیا ہونا چاہیے اور اس سلسلہ کے نظریاتی مباحث سے دامن کشاں ہو کر کتاب کے موضوع "اقتصادی نظام" کے پیشِ نظر ہمارے لیے ادائے فرض کی بہترین شکل یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں پر تحریر و تقریر سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ علمی و عملی دونوں پہلوؤں سے کائناتِ انسانی کے لیے امن و اطمینان اور فوز و فلاح

---

(۱) فاضل مؤلف رحمہ اللہ نے چونکہ یہ کتاب قیام پاکستان (یعنی ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء) سے پہلے تحریر فرمائی تھی اس لیے انہوں نے اس عنوان کو "ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل" تحریر کیا تھا۔ چونکہ مقصد ایک ایسی ریاست یا ملک میں اسلامی معاشی نظام کے مسائل کا حل تجویز کرنا تھا جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی اقلیت آباد ہو۔ لہذا ہندوستان ہی کو مخصوص کرنے کی بجائے عام غیر مسلم ممالک کو بھی لیا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں، پاکستان کی زمینوں کے مسائل پر بھی مصنف رحمہ اللہ کے نگارشات کی روشنی میں غور کیا جا سکتا ہے۔

صرف اسی صورت میں نصیب ہو سکتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے اصول و قوانینِ اساسی کو اپنا راہنما بنالیا جائے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری:

اگر ہندوستان جنت نشان میں کمیونزم، سوشلزم، نیشلزم، فیسزم اپنے اپنے نظامہائے معاشی کی تبلیغ و دعوت میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نظام معاشی کی دعوت و تبلیغ کے لیے میدان تنگ سمجھ کر ہم دست وپا بریدہ بن جائیں اور حرمان ویاس کو رفیقِ حیات بنالیں۔

کیونکہ اگر دنیوی نظامہائے اقتصادی کی مقبولیت کے لیے اس ملک کا دامن وسیع ہے تو روحانیت کی راہ سے آئے ہوئے معاشی نظام کے لیے اس کا دامن کیسے کوتاہ رہ سکتا ہے، البتہ یہ شرط ہے کہ اس نظام کی دعوت و تبلیغ کے لیے نفرت کی جگہ مودت، خشونت کی بجائے رقت و نرمی، تنگ نظری کے بدلے وسعتِ نظر اور عداوت و بداخلاقی کی جگہ مواسات و حسنِ اخلاق جیسے برتر اصولوں کو اسوہ بنایا جائے اور قرآن حکیم کے اس مقدس اصولِ دعوت کو معیارِ یقین کیا جائے۔

﴿ ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلْحِكْمَةِ وَٱلْمَوْعِظَةِ ٱلْحَسَنَةِ ۖ وَجَـٰدِلْهُم بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ ۚ ﴾ (۱)

ترجمہ: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) تم اپنے پروردگار کی جانب دعوت دو، دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مجادلہ (تبادلہ خیالات) کرو اس طریقہ پر جو بہت ہی خوب اور بہتر سے بہتر ہو۔

پس اگر ہم نے حسنِ اخلاق کے ساتھ روشن دلائل و براہین کے ہتھیاروں سے سج کر مسلم و غیر مسلم پر اسلام کے اقتصادی نظام کی برتری کو روشن کر دیا تو وہ وقت دور نہیں کہ مادیت کے انتہائی عروج اور روحانیت کے سخت انحطاط کے اس دور میں بھی

(۱) القرآن الکریم، سورۃ النحل (۱۶): ۱۲۵

جو سعید روحیں امنِ عالم اور کائناتِ انسانی کی اخوتِ عام اور فلاح دوام کے لیے حقیقی معنی میں بے چین و مضطرب ہیں ان کے ہاتھوں توپ و تفنگ اور مادی اسلحہ کی گرم بازاریوں کے بغیر ہی ایسا انقلاب برپا ہو جائے کہ سرزمینِ ہند کا ہر ایک طبقہ اور ہر ایک ملت و قوم اس مقدس نظام کی برتری کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اس طرح خدائے برتر کا پیغامِ حق اپنی پوری رعنائیوں اور دل نوازیوں کے ساتھ برضا و رغبت اس سرزمین میں عملی صورت اختیار کر لے اور آج کا یہ محکوم کل کو تمام کائنات کے لیے نمونۂ راہ اور راہنما ثابت ہو۔ "وما ذالك على الله بعزيز"

ہندوستان میں صحیح معاشی نظام اور اس کی مشکلات:

ہندوستان میں اگر صحیح معاشی نظام کو بروئے کار لایا جائے تو اس سلسلہ میں دو مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں، ایک "سود کا مسئلہ" اور دوسرا بڑی بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داریوں کا مسئلہ۔ اس لیے کہ ان دونوں ہی مسئلوں کے ساتھ باشندگانِ ہند کا بہت گہرا تعلق موجود ہے۔ خصوصاً مسئلہ سود تو اس درجہ خطرناک ہے کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر مسلم و غیر مسلم آبادی کی معاشی بدحالی و فاقہ مستی کا یہی واحد اجارہ دار ہے اور اس کے بعد ان بڑی بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داریوں کا درجہ ہے جن میں کاشتکار کو اسلام، اخلاق اور انصاف کے خلاف غلام سمجھا جاتا اور غلاموں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے اور جو عوام کی معاشی تباہی کے لیے جونک کا کام کر رہی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ شریعتِ اسلامی کے اہم قانونِ وراثت کے خلاف مجرمانہ جرأت کے ساتھ یہ زمین دار اور تعلقہ دار سرکاری عدالتوں میں یہ بیان دیتے چلے آتے ہیں کہ ہم اپنی اسٹیٹ اور اپنے تعلقہ کی وراثت کے مسئلہ میں اسلامی قانون پر رسم و رواج کو ترجیح دیتے ہیں اور تقسیمِ وراثت کا انکار کرتے ہوئے اسٹیٹ اور تعلقہ سے متعلق رسم و رواج کے قانون کو واجب العمل یقین کرتے ہیں۔

اس لیے یہ اعلان کرنا ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں نہ "سود" کے

لیے کوئی گنجائش ہے اور نہ ذاتی اسٹیٹ اور تعلقہ کے موجودہ سسٹم کے لیے کوئی گنجائش ہے۔

ان ہر دو مسائل میں سے ''سود'' تو ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی قباحت و شناعت واضح اور عام طور پر مسلم ہے اور معاشی نظام میں اس کی تباہ کاریاں روشن و ظاہر ہیں، البتہ بڑی بڑی زمینداریوں کے موجودہ سسٹم کی قباحت و شناعت (Condemnation) میں شخصی ملکیت کا مسئلہ حائل ہو جاتا ہے اور اس کے لیے اس کے خلاف اقتصادی نظام کا اقدام نہ صرف غیر مسلم کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے بلکہ خود مسلمانوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو احکام اسلامی سے ناواقفیت کی بنا پر اس اقدام کو غیر اسلامی سمجھتے اور کمیونزم یا سوشلزم کی کورانہ تقلید جانتے ہیں۔ اس لیے از بس ضروری ہے کہ اس مقام پر علمائے اسلام کے وہ چند فتاویٰ یا اسلامی فیصلے پیش کر دیئے جائیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اور عامہ مسلمین کی فلاح و بہبود کا تقاضا ہو تو امام اور امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفتوحہ ملک کی اراضی کو شخصی ملک بنانے کی بجائے بیت المال اور حکومت (خلافت) کی ملک قرار دے۔

اراضی ہند پر علماء اسلام کے فتاویٰ:

علمائے اسلام کے یہ فتاویٰ مغل بادشاہوں کے دور میں اور برٹش حکومت (British Government) کے ابتدائی دور میں اس سلسلہ میں زیر تحریر آئے ہیں کہ ''اراضی ہند'' اشخاص و افراد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ وقف للمسلمین کی حیثیت میں حکومت (بیت المال) کی ملکیت ہیں، اور ایسی زمین کو اسلام کے معاشی نظام کی اصطلاح میں ''ارض المملکۃ'' یا ''ارض الحوزہ'' (Domain) کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''ارضِ عراق'' کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا اور جمہور صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر کے آئندہ کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔

(الف) شیخ جلال الدین تھانیسری رحمہ اللہ کا فتویٰ:

چنانچہ شیخ جلال الدین تھانیسری رحمہ اللہ [1] نے ایک مستقل رسالہ "تحقیق اراضی ہند" کے نام سے اسی غرض سے تصنیف فرمایا کہ "اراضی ہند" شخصی ملک نہیں بلکہ "ارض مملکت" اور وقف للمسلمین ہو کر بیت المال کی ملکیت ہیں، شیخ فرماتے ہیں:

والحجة لعلمائنا فی تقریر أمیر المؤمنین عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه لسواد عراق بموافقة من الصحابة رضوان اللّٰہ علیهم اجمعین. فی الهدایة فی باب الغنائم. و إذا فتح الامام بلدة عنوة أی قهرا فهو بالخیار ان شاء قسمه ما بین المسلمین کما فعل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بخیبر، و إن شاء أقرّ أهله علیه ووضع علیهم الجزیة وعلی أراضیهم الخراج. کذلك فعل عمر لسواد العراق بموافقه من الصحابة رضوان اللّٰہ علیهم أجمعین ولم یحمد من مانعه وفی کل ذلك قدوة فیتخیّر. [2]

ترجمہ: اور تقریر [3] کے متعلق ہمارے علماء (احناف) کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ تقریر ہے جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی موافقت کے ساتھ سوادِ عراق کے متعلق ان سے عمل میں آئی، ہدایہ [4]

---

(۱) شیخ جلال الدین تھانیسری رحمہ اللہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے مرید، متبحر عالم اور شیخ کامل تھے۔ دہلی کے قریب پنجاب کے علاقہ تھانیسر وطن مالوف تھا اور وہیں پچانوے سال زندہ رہ کر ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ میں انتقال فرمایا اُن کا مذکورہ بالا یہ رسالہ مطبوعہ ہے مگر خود شیخ کے ہاتھ کا قلمی نسخہ برٹش میوزم لندن میں بتایا جاتا ہے۔

(۲) تھانیسری، جلال الدین رحمہ اللہ: تحقیق اراضی ہند: ص ۳

(۳) خلیفہ کا ملک کی زمین کو مسلمانوں کی انفرادی ملکیت بنانے کی بجائے مفتوح غیر مسلموں کے قبضہ میں باقی رکھنا اور اس کی ملکیت کو حکومت کی ملکیت قرار دینا "تقریر" کہلاتا ہے۔

(۴) امام برہان الدین علی بن ابوبکر مرغینانی رحمہ اللہ کی کتاب ہے جو فقہ حنفی میں درسی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

باب الغنائم میں ہے کہ اگر امام کسی شہر کو قہر و غلبہ کے ساتھ فتح کرے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اس کی اراضی کو مسلمانوں میں تقسیم کر دے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کے متعلق کیا اور چاہے تو مفتوح آبادی کے قبضہ میں اس کو رہنے دے اور اس پر جزیہ مقرر کر کے ان کی زمینوں پر خراج مقرر کر دے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی موافقت کے ساتھ کیا اور جس کسی نے مخالفت کی تو اس کو ناپسند سمجھا گیا بہرحال امام ان دونوں باتوں میں مختار ہے اور دونوں اس کی صوابدید کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔"

اور ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وفی نفی الملك عن الكفار فی صورة التقرير وجعلهم كالاكرة العاملة للمسلمين فوائد نيرة ومنافع كثيرة لأهل الإسلام المستحقين إذا الأرض والخرج بالمنع والعطاء للمستحقين۔[1]

ترجمہ: اور اراضئ ہند کے بارہ میں "تقریر کی شکل میں" یہ کہنا کہ یہاں کے غیر مسلم باشندوں کی ملکیت نہیں ہے اور ان کو کاشت کاروں اور اجارہ داروں کی طرح قرار دینا جو مسلمانوں کے (بیت المال) کے لیے عامل کی حیثیت میں ہیں مسلمانوں کے لیے روشن فوائد اور کثیر منافع کا باعث ہے اس لیے کہ زمین اور خراج کے دینے اور نہ دینے کا معاملہ دراصل مستحقین کے پیشِ نظر ہے۔

اور دوسری جگہ اراضی ہند کو مختلف انواع پر منقسم بتلاتے ہوئے

ثم إعلم أن أراضى ولاية الهند ليست على سنن واحد بل هى

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۱

على أنواع شتى.[1]

ترجمہ: پھر جاننا چاہیے کہ ہندوستان کی زمین کسی ایک قانون کی پابند نہیں، بلکہ اس کے استعمال کے لیے متنوع قوانین بنائے گئے ہیں۔

صرف ایک نوع میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:

منها ما أعطى الإمام بأوّل الفتح لبعض الغانمين أو بعض المستحقين.[2]

ترجمہ: منجملہ ایک صورت یہ ہے کہ امام نے جس وقت ملک ہندوستان کو فتح کیا تو اس فتح کی ابتدا ہی میں بعض زمینیں مجاہدین یا مستحقین کو عطا کر دیں۔

اور آخر میں اس بحث کا خلاصہ یہ نکالتے ہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر ہندوستان کی اکثر و بیشتر اراضی ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہے جو اس پر قابض ہیں سوچو اور سمجھو، پھر معلوم رہے کہ جب کہ ہندوستان کی اراضی ان انواعِ مختلفہ پر قائم ہے جن کا گذشتہ ذکر ہو چکا ہے تو اراضی ہند کے متعلق کسی شخص کی ملکیت و عدمِ ملکیت پر حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک یقین کے ساتھ حکم لگانے والے کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ذکر کردہ انواع میں سے کس نوع میں شامل ہے، پس جس زمین کے بارے میں جس نوع سے متعلق ہونے کا یقین ہو جائے اس کے مطابق حکم دینا چاہیے، لیکن اگر علمِ یقین حاصل نہ ہو تو فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اس لیے کہ فصل قضایا کی بحث میں اس طرح فتویٰ

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۱

(۲) حوالہ بالا: ص ۱۱

دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[1]

شیخ جلال الدین نور اللہ مرقدہ کے یہی فقہی ارشادات یا فیصلے اس زمانہ سے متعلق ہیں جب ہندوستان میں مسلم حکومت کا دور تھا، مغلِ اعظم کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ کی مفتاح سعید (Lucky Key) تھی۔

مولانا محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ کا فتویٰ:

اور ہندوستان کے مشہور محقّق عالم مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے بھی اپنے رسالہ میں اراضی ہند کے متعلق یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ فرد یا جماعت کی شخصی ملکیت نہیں ہیں بلکہ ارض مملکت اور ارضِ بیت المال ہیں۔

اور مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ ہیں، یعنی حکومت کے بیت المال کی ملکیت ہیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہیں۔[2]

مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کا فتویٰ:

شیخ جلال الدین اور محمد اعلیٰ رحمہما اللہ کے چند صدی بعد جب برٹش حکومت کا تسلط ہوا تو علمائے اسلام کے سامنے پھر یہ مسئلہ آیا کہ اراضی ہند شخصی ملکیت ہیں یا نہیں اور ان پر عشر یا خراج واجب ہے یا نہیں؟ تو محقّقِ عصر حضرت شاہ عبد العزیز نور اللہ مرقدہ نے اپنے مشہور فتاویٰ میں اس وقت بھی یہی فیصلہ دیا کہ اراضی ہند بیت المال کی ملکیت ہیں، شخصی مملوکہ نہیں ہیں اور یہاں زمیندار و تعلقہ دار مالک کی حیثیت میں نہیں، اس لیے اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی، فرماتے ہیں:

> وحضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز رسالہ در احکام اراضی ہند قلمی فرمودہ اند، دراں رسالہ ایں مذہب رابشواہد ودلائل بسیار ابطال

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۱، ۱۲

(۲) العرف الشذی (شرح جامع الترمذی)، ص ۲۸۶، تقریر درس رأس المحدثین حضرت الشیخ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہ

فرمودہ تحقیق فرمودہ اند کہ اراضی ہند بدستور اراضی سواد عراق موقوف بر ملک عامۂ مسلمین بے تخصیص است یعنی ملک در بیت المال است وزمینداران رابیش از قیم بودن دخلے نیست وقاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ نیز دریں باب رسالہ (۱) نوشتہ وہمیں مسلک راترجیح دادہ الخ۔

ترجمہ: اور حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکام کے بارہ میں لکھااور اس رسالہ میں انہوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں کی ملک ہے) بہت سے دلائل و شواہد سے باطل قرار دیاہے اور یہ ثابت کیاہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی بدستور سابق عراق کی اراضی کی طرح عامۂ مسلمین کے لیے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں کسی شخص و فرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت اور نہ زمینداروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے۔ اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ نے بھی اس بارہ میں ایک رسالہ تصنیف کیاہے اور انہوں نے اس میں شیخ جلال ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

مگر بنابر آنچہ حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سواد عراق کہ در عہدِ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مفتوح شدہ بود موقوف بر ملک بیت المال است و زمینداراں رابیش از تولیت و داروگگی تردد و فراہم آوردن مزارعین و اعانت و زراعت و حفظ دخلے نیست، چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشعار بآں میکند وتغیر وتبدل زمینداری وعزل ونصب زمینداری واخراج بعضے از آنہاواقرار بعضے وعطائے بعضی اراضی بافغاناں وبلوچاں وسادات و

(۱) یہ رسالہ برٹش میوزم لندن میں موجود ہے۔

فدوانیاں بصیغہ زمینداری دلالت صریحہ بریں مے کند۔[1]

ترجمہ: شاید اس مسلک کی بنیاد پر کہ حضرت شیخ جلال تھانیسری نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ابتداء فتح میں عراق کی طرح ہو (جو کہ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فتح ہوا تھا) بیت المال کی ملک پر ہی قائم ہے، اور زمینداروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی و داروغہ ہیں اور کاشت کاروں کو تلاش کر کے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور فکر میں رہنے کے اور کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔ چنانچہ لفظ زمیندار بھی اس کی خبر دیتا ہے اور زمینداری میں تغیر و تبدل اور عزل نصب اور بعض کا اخراج اور بعض کے لیے اثبات اور بعض کو داد و دہش، مثلاً افغاناں، بلوچ، سادات، مشائخ وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا اس دعوی کی صریح تائید کرتے ہیں۔

خلاصہ:

علماءِ اسلام کے ان فتاویٰ کے علاوہ مغل بادشاہوں نے اراضی ہند پر جو تصرفات قائم رکھے، نیز شاہ عالم نے سرطامس روکو دیوانی احکام سپرد کرتے ہوئے زمینداروں کے متعلق جو معاہدہ کیا اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالہ کرتے ہوئے بنگال کی زمینوں سے متعلق جو معاہدہ کیا وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت اراضی ہند کو زمیندار اور تعلقہ دار کی ذاتی و شخصی ملکیت نہیں سمجھتے اور حکومت کی ملک شمار کرتے ہوئے ان کو نگران اور "قیم" کی حیثیت دیتے تھے۔

پس جبکہ علمائے اسلام کے فتاویٰ سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کی زمین

---

(۱) فتاوی عزیزی: ج ۱، مطبوعہ مجتبائی، دھلی: ص ۴۳

حکومت کی ملکیت اور بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی رہی ہے اور انہوں نے اس فیصلہ میں عامۂ مسلمین کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر مخصوص طبقۂ زمینداران و تعلقہ داران کے نقصان کو قابلِ نظر انداز سمجھا اور اس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلۂ ”ارضِ عراق“ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا تو آئندہ کے لیے ہندوستان کے معاشی نظام میں اس قسم کے اقدام کو غیر اسلامی کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ البتہ یہ دیکھنا ازبس ضروری ہو گا کہ یہ اقدام عامۃ المسلمین کی معاشی فلاح کے لیے مفید ثابت ہو۔ (آمین)

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللّٰہ ط

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہ)

ضمیمہ ــــ ①

تذکرہ آئمہ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ

اس باب میں ان آئمہ حدیث اور محدثوں کا مختصر تعارف کرانا مقصود ہے، جن کی کتب احادیث سے اس کی تیاری میں احادیث نقل کی گئی ہیں۔ یہاں مصنفین صحاح ستہ (Six Authentic Books) اور دیگر محدثین مثلاً امام طبرانی، امام بیہقی، امام محمد، امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم کا اجمالی تعارف درج کیا جارہا ہے۔ آئیے آغاز حضرت امام بخاری رحمہ اللہ مؤلف صحیح بخاری سے کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ

ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرۃ بن بروزبۃ الجعفی البخاری رحمہ اللہ جعفی یمن کا ایک قبیلہ سے تعلق کی بناپر جعفی کہلائے اور بخاری اس لیے کہ آپ کے پردادا مغیرہ آتش پرستی سے حضرت یمان بخاری رحمہ اللہ کے دست مبارک پر دولت اسلام پاکر مسلمان ہوئے۔ لہذا بخاری نسبت والے بن گئے۔ آپ بروز جمعۃ المبارک ۱۳ شوال ۱۹۴ھ (مطابق ۸۱۰ء) بخارا میں پیدا ہوئے، صغر سنی میں یتامت کا مزا چکھ کر در یتیم بن گئے، والدہ رحمہا اللہ تعالیٰ نے تربیت کی۔

طلب علم میں بہت سے دیار و امصار کا سفر کیا مثلاً کوفہ، بصرہ، بغداد، بلخ، عسقلان، شام، حمص وغیرہا۔ اس دور کے کبار اساتذہ حدیث اور محدثین عظام رحمہم اللہ تعالیٰ سے احادیث کی سماعت اور تحریر دونوں کام کیے، جن میں مکی ابن ابراہیم بلخی، وکیع بن الجراح، عبد اللہ ابن مبارک، عبد اللہ بن عثمان مروزی، عبید اللہ بن موسیٰ عبسی، ابو نعیم فضل بن دکین، علی بن مدینی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین رحمہم اللہ

تعالیٰ جیسے اساطین علم و فضل شامل ہیں۔ آپ کی زندگی میں آپ سے نوے ہزار (۹۰۰۰۰) اہل علم نے بخاری شریف کی سماعت کی اور اسے آگے روایت کیا۔ ذہانت اور حافظہ کا یہ عالم کہ دس سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کی اور گیارہ سال کی عمر میں استاد پر اعتراض کرنے لگے۔ ہوا یوں کہ ان سے استاد رحمہ اللہ نے حدیث پڑھاتے ہوئے یوں سند بیان کی: "حدثنا سفیان عن ابی الزھیر عن ابراھیم" بخاری رحمہ اللہ نے استاد سے باادب عرض کیا کہ ابراہیم رحمہ اللہ نے ابوزہیر رحمہ اللہ سے کوئی روایت نہیں کی۔ استاد رحمہ اللہ نے لڑکا سمجھ کر ڈانٹا مگر گھر جا کر مسودات کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو نو عمر شاگرد رشید رحمہ اللہ کی خداداد ذہانت اور علمیت کے معترف ہو گئے اور برملا اپنی غلطی کا اعتراف اور شاگر رشید رحمہ اللہ کی ستائش کی۔ صرف ۱۶ سال کی عمر میں امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ اور امام وکیع بن الجراح رحمہ اللہ کی مسندات حفظ کر چکے تھے۔ پھر تعلیمی اسفار شروع کیے۔

آپ نے بہت سی مفید تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں الجامع الصحیح، ادب المفرد، کتاب بر الوالدین، تاریخ کبیر، صغیر اور اوسط، کتاب خلف افعال العباد، کتاب الضعفاء، جامع کبیر، مسند کبیر وغیرہا مشہور ہیں۔ مگر جس نے کتاب کے ذریعہ اللہ کریم نے آپ کو شہرت دوام بخشی وہ الجامع الصحیح یا صحیح البخاری ہے۔ آپ نے اس کتاب کی تصنیف پر ۱۶ (سولہ) سال محنت کی اور ہر حدیث نقل کرنے سے پہلے وضو کرتے، دو رکعات نفل ادا کرتے پھر حدیث نقل کرتے۔ آپ کے بے پناہ حافظہ اور ذہانت کے بے شمار قصص اور حکایات ہیں۔ قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے ایک واقعہ درج کرنے کی سعادت پا رہا ہوں۔

جب آپ بغداد تشریف لے گئے تو وہاں کے اصحابِ حدیث نے ان کا امتحان لینے کے لیے سو احادیث منتخب کیں اور دس اشخاص چن کر انہیں دس دس احادیث دیں کہ وہ انہیں امام بخاری رحمہ اللہ کے سامنے پیش کر کے دریافت کریں کہ وہ سند اور متن کے اعتبار سے کیسی ہیں؟ ان اصحاب حدیث نے یوں کہا کہ ان تمام سو

احادیث کے متون (Texts) اور اسناد (Chain of Transmitters) کو تبدیل کر دیا۔ پھر ایک ایک کر کے سب نے اپنی احادیث امام صاحب رحمہ اللہ کو سنائیں۔ آپ ہر ایک کی حدیث سن کر کہتے جاتے: مجھے معلوم نہیں۔ پھر آپ نے ان میں سے ہر ایک کی دس دس اور کل ملا کر سو احادیث کو صحیح متون اور اسناد کے ساتھ سنا کر سب کو حیران کر دیا۔

آپ توکل، اعتماد، ثابت قدمی اور استقلال کا کوہ گراں تھے اور ان کے کمالات والے شخص کو سنگ یا سلاخوں سے واسطہ نہ پڑے تو گویا ان کمالات کا حق ہی ادا نہیں ہوتا۔ دیگر اہل صدق و وفا کی طرح حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کو آخر عمر میں حکمرانوں اور حساد کی طرف ان کے کمالات کا آزمانے کا موقع ملا۔ تنگ آکر آپ بخارا کو الوداع کہہ کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ربذہ کی طرح خرتنگ ـــــ بخارا کے ایک گاؤں ـــــ میں جا کر دکھوں بھری زندگی گزارتے رہے اور شب عید الفطر ۲۵۶ھ (مطابق ۸۷۰ء) موت کا پل عبور کر کے اپنے پیاروں کے پاس چلے گئے ـــــ الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب اس وقت آپ کی عمر ۱۳ یوم کم ۶۲ سال تھی۔ (۱)

امام مسلم رحمہ اللہ

ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری النیشاپوری رحمہ اللہ ۲۰۴ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں طلب علم میں نکل پڑے اور اس عہد کے کبار اساتذہ کرام سے اکتساب فیض کیا، جن میں یحییٰ بن یحییٰ التمیمی، اسحاق بن راہویہ، قعنبی، سعید بن منصور، عون بن سلام، احمد بن یونس الیربوعی، داؤد ابن عمر الضبی، حرملۃ بن یحییٰ، قتیبہ بن سعید، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اور دیگر اساتذہ

---

(۱) برائے تفصیل دیکھیں: مظاهر حق، ج ٤، اسماء الرجال، ترجمه بخاری رحمه الله تعالیٰ ـــ ـــ ابو السنور محمد الاحمدی، رئیس وزیر الاوقاف المصریة، احادیث القدسیة، مطبوعه قاهرة، دیباچه

حدیث شامل ہیں۔ آپ نے ان اساتذہ کرام کی تلاش میں حجاز، عراق، مصر، شام وغیرہا کا سفر کیا۔ بغداد کئی بار گئے، آخری بار ۲۵۷ھ میں تشریف لے گئے۔ آپ سے بے شمار متلاشیان علم نے استفادہ کیا۔ آپ نے متعدد کتب تصنیف کیں مگر اللہ کریم نے جس شہرت و قبولیت سے ان کی "صحیح مسلم" کو نوازا وہ ان کی کسی دوسری تصنیف کے حصہ میں نہ آئی۔ فرمایا کرتے تھے: میں نے تین لاکھ احادیث میں سے اخذ کر کے یہ کتاب لکھی ہے۔ ایک رات تلاش حدیث میں رات بھر جاگتے رہے اور ساتھ ساتھ کھجوریں بھی تناول فرماتے رہے، حدیث مل گئی، کھجوروں کا مجموعہ بھی ختم ہو گیا۔ بیمار پڑ گئے رجب ۲۶۱ ھ کو وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ [1]

امام ابو داود رحمہ اللہ

ابو داود سلیمان بن اشعث بن اسحاق اسدی سجستانی رحمہ اللہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ طلب علم میں خراسان، مصر، عراق، شام وغیرہ کا سفر کیا۔ آپ نے علم حدیث امام بخاری اور امام مسلم رحمہا اللہ تعالیٰ کے شیوخ سے حاصل کیا۔ نمایاں اساتذہ کرام میں احمد بن حنبل، عثمان بن ابی شیبہ، قتیبہ بن سعید رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم ہیں۔ آپ کے تلامذہ راشدہ میں ان کے صاحبزادہ عبد اللہ، ابو عبد الرحمٰن النسائی، ابو علی اللؤلوی رحمہم اللہ تعالیٰ اور بہت سے دیگر اصحاب ہیں۔ آپ اپنی کتاب "سنن ابی داود" پانچ لاکھ احادیث کا مجموعہ لکھ کر اس سے پھر چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) احادیث منتخب کر کے تدوین کی۔ جس میں صرف احادیث صحیحہ کو اکٹھا کیا اور اس پر علماء امت نے اتفاق بھی کیا۔ آپ رحمہ اللہ اعلیٰ درجہ کے محدث، فقیہ، امام اور متقی انسان تھے۔ آپ نے بصرہ میں ۱۴/ شوال ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ [2]

---

(۱) برائے تفصیل دیکھیں: اسماء الرجال پر کتب

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن خلکان: وفیات الاعیان

امام ترمذی رحمہ اللہ

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی السلمی رحمہ اللہ آپ نے ۲۲۰ (دو سو) ہجری میں ترمذ ـــــ بلخ کے نزدیک دریائے جیجون سے متصل ـــــ میں ولادت پائی۔ اپنے زمانہ کے ممتاز محدثین اور اساتذہ حدیث سے اکتساب علم حدیث کی۔ مشہور اساتذہ کرام میں قیبہ بن سعید، محمد بن بشار، علامہ علی بن حجر رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم شامل ہیں۔ آپ نے حجاز، عراق اور خراسان کا تعلیمی اور علمی سفر اختیار کیا۔ آپ نے الجامع الترمذی، شمائل الترمذی تصنیف کیں جنہیں امت مسلمہ کے علماء اسلام نے سر آنکھوں پر لیا۔ جامع الترمذی صحاح ستہ میں شامل ہے بلکہ دینی مدارس کے نصاب میں ترجیحی بنیاد پر شامل ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نہایت عابد، متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ اللہ کریم کے خوف سے روتے روتے ان کی آنکھیں چلی گئیں۔ آپ نے ترمذ میں ہی دس رجب ۲۷۵ھ یا ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ [۱]

امام نسائی رحمہ اللہ

ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن بحر النسائی الخراسانی رحمہ اللہ ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے قتیبہ بن سعید، علی بن خشرم، اسحاق بن ابراہیم، محمد بن بشار، ابوداود سجستانی، ابن راہویہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کیا۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے حجاز، عراق، شام، خراسان اور جزیرہ کا سفر کیا۔ آخر میں مصر میں مقیم ہوگئے آپ کے طلبہ میں امام طبرانی رحمہ اللہ اور ابن رشیق رحمہ اللہ شامل ہیں۔ آخر عمر میں آپ حج کی غرض سے آپ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور یہیں ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔ صفا و مروہ کے درمیان آخری آرام گاہ پائی۔ [۲]

---

(۱) دیکھیے اسماء الرجال پر کتب: ابن خلکان: وفیات الاعیان

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: ولی الدین خطیب رحمہ اللہ تعالیٰ، مشکوۃ المصابیح کے ذیل میں الکمال فی اسماء الرجال، ابن خلکان وفیات الاعیان

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ

ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی رحمہ اللہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے بغداد عراق، شام، کوفہ، بصرہ، مصر وغیرہا کا سفر کر کے وہاں کے مشاہیر علماء حدیث و فقہ سے اکتساب علم کیا۔ نامور اساتذہ کرام میں محمد بن عبد اللہ بن نمیر، ابراہیم بن منذر، عبد اللہ بن معاویہ رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ آپ کی "سنن ابن ماجہ" صحاح ستہ میں شامل ہے، اس "سنن" میں ۳۲ کتب، ۱۵۰ ابواب اور چار ہزار (۴۰۰۰) احادیث ہیں۔ اس "سنن" کے علاوہ آپ نے قرآن کریم کی "تفسیر حافل" اور "تاریخ کامل" لکھیں۔ آپ کے طلبہ حدیث میں بڑے کبار علماء حدیث و فن شامل ہیں مثلاً ابن سیبویہ، محمد بن عیسیٰ الصغار، اسحاق بن محمد اور علی بن ابراہیم رحمہم اللہ تعالیٰ۔ آپ نے رمضان ۲۷۳ھ میں وفات پائی، اس وقت عمر ۶۴ سال تھی۔[1]

امام بیہقی رحمہ اللہ

احمد بن حسین بن علی ابو بکر البیہقی رحمہ اللہ پانچویں صدی ہجری کے کبار علماء امت میں سے نامور محدث، فقیہ اور مصنف گزرے ہیں آپ رحمہ اللہ نے بیہق (نزد نیشاپور) کے صدر مقام خسرو جرد میں ۳۸۴ھ میں ولادت پائی۔ بڑے ہو کر خراسان کے جید علماء حدیث سے اکتساب علم کیا، پھر بغداد، کوفہ اور دیگر کئی علمی مراکز میں جا کر علم حاصل کیا۔ مشہور اساتذہ کرام میں امام حاکم (صاحب مستدرک) ابن فورک، شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے حدیث، فضائل صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور مواعظ میں بہت عمدہ تصانیف کی ہیں، جن میں کتاب الاسماء والصفات (ذات و صفات باری تعالیٰ سے متعلق احادیث) کتاب السنن والاثار، کتاب جامع المصنف فی شعب الایمان، دلائل النبوۃ مشہور ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ: ۵۲/۱

مگر ان کی نیک نامی اور قابلیت کو ہمیشہ باقی رکھنے کے لیے "السنن الکبری" کا ہونا ہی کافی ہے یہ کتاب دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، حیدر آباد، ہند نے شائع کی تھی۔ آپ نے بیہق میں ہی ۱۰ جمادی الاول ۴۵۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر دنیا کو چھوڑ دیا۔ رحمہ اللہ [۱]

امام الطبرانی رحمہ اللہ

سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی الشامی رحمہ اللہ کا کبار علماء حدیث اور محدثین میں شمار ہوتا ہے، اصل میں شام کے علاقہ طبریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لہذا طبرانی کہلائے۔ آپ نے ۲۶۰ ھ میں ولادت پائی اور تیرہ (۱۳) برس کی عمر میں حصولِ علم حدیث میں لگ گئے۔ شام، حرمین شریفین، یمن، مصر، بغداد، کوفہ، بصرہ، اصفہان اور جزیرہ کا تعلیمی سفر کیا اور تقریباً تیرہ ہزار (۱۳۰۰۰) محدثین سے احادیث سنیں۔ نہایت ذہین اور اعلیٰ درجہ کا حافظہ رکھتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں المعجم الصغیر، تفسیر میں آپ کی کتب الاوائل، دلائل النبوۃ مشہور ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے اصفہان میں ایک سو سال دس ماہ کی عمر میں ۳۶۰ (تین سو ساٹھ) ہجری میں وفات پائی۔ [۲]

امام الدارمی رحمہ اللہ

عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن فضل بن بہرام التمیمی الدارمی السمرقندی رحمہ اللہ کبار علماء حدیث اور آئمہ محدثین میں سے ہیں۔ ۱۸۱ ھ میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچے تو طلب علم میں لگ گئے۔ امام نضر بن شمیل، ابو عاصم اور ابو نضر ہاشم رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کیا۔ آپ رحمہ اللہ سے احادیث کی سماعت کرنے والوں میں صحاح

---

(۱) برائے تفصیل دیکھیں: ولی الدین الخطیب: مشکاۃ کے اسماء الرجال میں البیہقی رحمہ اللہ —— ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۷۶،۱/۷۵ —— علامہ الزرکلی: الاعلام، ۱/۱۱۳

(۲) ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ: مشکاۃ المصابیح کا اسماء الرجال، تذکرہ الطبرانی رحمہ اللہ تعالیٰ —— ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۲/۲۹۷

ستہ کے مصنفین امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے اساطین علم و فضل شامل ہیں۔ نہایت متقی، عابد، زاہد عاقل تھے۔ آپ کو ایک مرتبہ سمرقند کا قاضی بنایا گیا۔ ایک روز عدالت میں گئے ایک فیصلہ سنایا اور استعفیٰ دے کر واپس گھر چلے گئے۔ آپ کی بیش قیمت تصنیفات میں تفسیر جامع اور مسند شامل ہیں، صحیح مسلم میں آپ سے ۱۷ (سترہ) احادیث مروی ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے ۲۵۵ھ یوم ترویہ کو وفات پائی۔ (۱)

الدار قطنی رحمہ اللہ

علی بن عمر بن احمد البغدادی الدارقطنی رحمہ اللہ بغداد کے مشہور محلہ دارقطن میں ۳۰۶ھ میں متولد ہوئے۔ جلیل القدر عظیم المرتبت محدث ہونے کے علاوہ فقیہ، قاری، مفسر اور شاعر تھے۔ آپ کے اساتذہ کرام میں امام ابن بہلول، ابن صادر اور ابن درید رحمہم اللہ تعالیٰ حدیث میں، علامہ ابو سعید الاصطغری شافعی فقہ میں اور قرأت میں محمد بن حسن النقاش، ابو سعید القراز اور محمد طبری رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ آپ کے تلامذہ میں امام حاکم، ابو نعیم اصفہانی، برقانی اور ابو حامد اسفرائنی رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے اکابر ائمہ شامل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں سے "سنن دارقطنی" اور "کتاب العلل" مشہور ہیں۔ آپ نے ذی القعدہ ۳۵۸ھ میں وفات پائی۔ (۲)

امام ابو یعلی رحمہ اللہ

احمد بن علی بن المثنی التمیمی الموصلی ابو یعلی رحمہ اللہ موصل میں ۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

---

(۱) دیکھئے: ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ: مشکوۃ المصابیح کا ذیل الکمال فی اسماء الرجال، تذکرہ الدارمی رحمہ اللہ تعالیٰ

(۲) دیکھئے: امام ذہبی: تذکرہ الحفاظ، تذکرہ الدار قطنی ـــــ الکمال فی اسماء الرجال از ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ ترجمہ الدارمی رحمہ اللہ تعالیٰ

بغداد پہنچ کر احمد بن حاتم الطویل، یحییٰ بن معین اور علی بن الجعد رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے فضلاء روزگار سے فیض حاصل کیا۔ آپ کی "المسند" پر جامعہ اسلامیہ المدینۃ المنورہ میں تحقیقی کام ہوا ہے۔ امید ہے اللہ کریم نے اشاعت کے وسائل مہیا فرما دیئے ہوں گے۔ آپ رحمہ اللہ نے ۳۰۷ھ میں وفات پائی۔ (۱)

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ

امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ العبسی الکوفی رحمہ اللہ ۱۵۹ ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپ عالم، حافظ حدیث اور مفسر تھے۔ آپ کی مفید کتب میں مشہور "المسند"، "المصنف" اور "التفسیر" ہیں۔ آپ کا شمار سات اقطاب حدیث (یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما، امام علقمہ، امام ابراہیم نخعی، منصور بن معتمر، امام سفیان ثوری، امام وکیع بن الجراح اور ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہم اللہ) میں ہوتا ہے۔ آپ نے امام یحییٰ قطان، امام وکیع بن الجراح، امام ابن عیینہ، ابوداود طیالسی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عفان الصغار، ابواحمد الزبیری، یزید بن ہارون اور یحییٰ بن آدم قرشی رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حدیث و فقہ کی تعلیم پائی۔ آپ کے شاگردان میں امام احمد بن حنبل، صحاح ستہ کے مصنفین (سوائے امام نسائی اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ) ابوزرعہ، ابو حاتم وغیرہم ایسے کبار علماء و محدثین اور فقہاء کرام شامل ہیں۔ ۲۳۵ھ میں وفات پائی۔ (۲)

امام الہیثمی رحمہ اللہ

امام علی بن ابی بکر بن سلیمان بن ابی بکر بن عمر بن صالح نورالدین ابوالحسن

---

(۱) دیکھئے: ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ ۱۱/۱۳۰، فؤاد سزکین: تاریخ التراث العربی (ترجمہ ذفھمی مجازی اور ذفھی ابو الفضل) مطبوعہ قاھرۃ ۱۹۷۷ھ، ۱/۲۷۱

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: دیباچہ المصنف ابن ابی شیبہ، تحقیق محمد عوامہ، تھذیب الکمال: ۱۶/۳۴ ـــــ ابن عدی: الکامل، ۱/۱۳۸. تھذیب التھذیب: ۹/۷۸

الہیثمی رحمہ اللہ نے رجب المرجب ۷۳۵ھ کو قاہرہ میں ایک دکاندار کے گھر ولادت پائی۔ آپ نے قرآن مجید پڑھ کر شیخ زین الدین عراقی رحمہ اللہ کی شاگردی اختیار کی، ان کے ساتھ قاہرہ، حرمین شریفین، بیت المقدس، دمشق، بعلبک، حلب، طرابلس اور حماۃ وغیرہ کا علمی اور سیاحتی سفر کیا۔ (آپ اپنے) استاد محترم شیخ زین الدین رحمہ اللہ کے معتمد، مؤدب اور محب تھے۔ استاد رحمہ اللہ نے اپنی فاضلہ بیٹی خدیجہ رحمۃ اللہ علیہا کا آپ رحمہ اللہ سے نکاح کر دیا۔ آپ کی اولادیں بھی ہوئیں۔ آپ نے اپنے استاد گرامی کی تمام کتابوں کو مدون کیا۔ اور انہیں اپنی مشہور کتاب "مجمع الزوائد و منبع الفوائد" میں جمع کیا۔ علماء حدیث کے مطابق "مجمع الزوائد و منبع الفوائد" طبرانی، مسند احمد، البزار، مسند ابی یعلی تمام کتب احادیث کا مجموعہ ہے۔ آپ نہایت قوی الحافظہ، حاضر جواب، متکلم، محدث اور فقیہ تھے۔ نہایت زاہد، عبادت گزار، متواضع، اہل علم (بالخصوص اپنے استاد محترم رحمہ اللہ) سے دیوانگی کی حد تک محبت کرنے والے تھے۔ منکرات پر خاموش نہیں رہتے تھے۔ آپ نے منگل کی رات (لیلۃ الثلاثاء) ۲۹ رمضان المبارک ۸۰۷ھ کو قاہرہ میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔ [1]

—☆☆☆—

(۱) برائے تفصیل دیکھیں: علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالٰی: تذکرۃ الحفاظ (ذیول) ترجمہ الهیثمی رحمہ اللہ تعالٰی ـــــ مجمع الزوائد منبع الفوائد ج ۱ ابتدایہ بعنوان: "کلمة عن حیات المؤلف". شذرات الذهب

ضمیمہ ــــــ ②

مختلف اموال زکاۃ کی شرح زکاۃ

سونے کی زکوٰۃ:

- نصاب: ۲۰ مثقال = ۸۵ گرام

(پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے اوزان میں ساڑھے سات تولہ)

- شرح: ۲½ فی صد

- شرط: سال کا پورا ہونا۔

چاندی کی زکوٰۃ:

- نصاب: ۲۰۰ درہم = ۵۹۵ گرام

(پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے اوزان میں ساڑھے باون تولہ)

- شرط: سال کا پورا ہونا

زرعی پیداوار کی زکوٰۃ (عشر):

- نصاب: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مطابق زمینی پیداوار کی ہر مقدار کم وبیش پر زکوٰۃ (عشر) واجب ہے۔

البتہ صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ) اور فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے مطابق زمینی پیداوار کی مقدار ۵ وسق ہو تو زکاۃ (عشر) واجب ہوگی۔ ۵ وسق = ۳۰۰ صاع = ۶۵۳ کیلو گرام۔

- شرح: ① عشر (۱۰٪ دس فیصد) بارش کے ذریعہ سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار میں۔

(۲) نصف عشر (۵٪ ۵ فیصد) آلات کے ذریعہ یا محنت کر کے اور خرچ برداشت کر کے آبپاشی کرنے کی صورت میں۔

- وجوب کا وقت: فصل کٹنے اور برداشت کرنے کے دن یا پھل وغیرہ توڑنے یا اکٹھا کرنے کے دن۔

سائمہ مواشی کی زکوٰۃ:

(۱) اونٹ:

- نصاب: ۵ اونٹ

- شرح: ۵ تا ۹ اونٹوں پر ایک بکری

۱۰ تا ۱۴ اونٹوں پر دو بکریاں

۱۵ تا ۱۹ اونٹوں پر تین بکریاں

۲۰ تا ۲۴ اونٹوں پر چار بکریاں

۲۵ تا ۳۴ اونٹوں پر ایک بنت مخاض (اونٹنی جو اپنی عمر کے دوسرے سال میں ہو)

۳۵ تا ۴۵ اونٹوں پر ایک بنت لبون (اونٹنی جو اپنی عمر کے تیسرے سال میں ہو)

۴۶ تا ۶۰ اونٹوں پر ایک حقہ (اونٹنی جو اپنی عمر کے چوتھے سال میں ہو)

۶۱ تا ۷۵ اونٹوں پر ایک جذعہ (اونٹنی جو اپنی عمر کے پانچویں سال میں ہو)

۷۶ تا ۹۰ اونٹوں پر دو بنت لبون

۹۱ تا ۱۲۰ اونٹوں پر دو حقہ

۱۲۱ تا ۱۴۴ اونٹوں پر بحساب ہر ۵ اونٹ پر ایک بکری ۱۲۰ اونٹوں کے بعد

۱۴۵ تا ۱۴۹ اونٹوں پر دو حقہ اور ایک بنت مخاض

۱۵۰ اونٹوں پر تین حقہ

۱۵۱ تا ۱۷۴ اونٹوں پر تین حقہ ایک بکری (بحساب ہر ۵ ویں اونٹ پر ۱۵۰ اونٹوں کے بعد)

۱۷۵ تا ۱۸۵ اونٹوں پر تین حقہ اور ایک بنت لبون۔

۱۸۶ تا ۲۰۰ اونٹوں پر چار حقہ یا اگر صاحب مال چاہے تو وہ پانچ (۵) بنت لبون بھی دے سکتا ہے۔

(۲) بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ:

بھیڑ بکری دونوں کو زکوٰۃ کے مسئلہ میں ایک ہی جنس تسلیم کیا گیا ہے۔ لہٰذا دونوں مل کر بھی ایک نصاب بن سکتی ہیں۔ شرح کی مقدار یوں ہوگی۔

۳۹ بکریوں بھیڑوں پر زکاۃ نہیں ہوگی۔

۴۰ تا ۱۲۰ بکریوں (بھیڑوں) پر ایک بکری، بھیڑ بطور زکوٰۃ۔

۱۲۱ تا ۲۰۰ بکریوں (بھیڑوں) پر دو بکریاں، بھیڑیں۔

۲۰۱ تا ۳۳۹ بکریوں (بھیڑوں) پر تین بکریاں، بھیڑیں۔

۴۰۰ تا ۴۹۹ بکریوں (بھیڑوں) پر چار بکریاں، بھیڑیں۔

۵۰۰ تا ۵۹۹ بکریوں (بھیڑوں) پر پانچ بکریاں، بھیڑیں۔

۶۰۰ ـــــ بکریوں پر چھ بکریاں، بھیڑیں۔

(۳) گائے کی زکاۃ:

- نصاب: ۳۰ گائیں (مشہور قول کے مطابق)
- شرح: ۳۰ تا ۳۹ گایوں پر ایک سالہ بچھڑا یا بچھڑی۔

۴۰ تا ۵۹ گایوں پر دو سالہ بچھڑا یا بچھڑی۔

۶۰ تا ۶۹ گایوں پر ایک سالہ دو بچھڑے۔

۷۰ تا ۷۹ گایوں پر ایک سالہ بچھڑا اور ایک دو سالہ بچھڑا۔

۸۰ تا ۸۹ گایوں پر دو بچھڑے دو سالہ۔

۹۰ تا ۹۹ گایوں پر تین بچھڑے ایک سالہ۔

۱۰۰ ـــــ گایوں پر ایک دو سالہ اور دو ایک سالہ بچھڑے۔

- شرط: تمام قسم کے مواشی کی ملکیت پر ایک سال کا پورا ہونا۔

اموالِ تجارت کی زکوٰۃ:

- نصاب: مال کی اتنی مقدار جس کی قیمت نقدی کے نصاب کے بقدر ہو۔
- شرح: ۲½ فی صد
- شرط: سال کا پورا ہونا

زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ: سال مکمل ہو جانے پر اموال تجارت کی قیمت بازار کے تھوک بھاؤ سے لگائی جائے اور اس میں نقد سرمایہ اور متوقع وصول طلب قرضوں کی رقم شامل کر دی جائے اس مجموعی رقم میں سے واجب الادا قرضوں کی رقم وضع کرنے کے بعد جو رقم بچ جائے اس پر ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

صدقۂ فطر کی مقدار:

ایک صاع = ۲۱۷۶ گرام (۲ کیلو ایک سو چھہتر گرام)

———☆☆☆———

ضمیمہ ——— (۳)

اسلامی اوزان و پیمانے

(Islamic Weights & Measures)

اوزان	پیمانے
درہم	۲٫۹۷۵ گرام
دینار	ایک مثقال = ۴٫۲۵ گرام
مثقال	۴٫۲۵ گرام
۲۰ مثقال	۸۵ گرام (۷½ تولہ پاک، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے وزن کے مط
اوقیہ	۴۰ درہم = ۱۱۹ گرام
مد	۱½ رطل
مدی	۱۴۰ ارطال
رطل	۱۲ اوقیہ ۹۰ مثقال
قسط	۸ ارطال (جمع رطل) = ½ صاع = ۱٫۸۸ کیلو گرام
صاع	۲٫۱۷۶ کیلو گرام
ارداب (مصری)	۲۴ صاع = ۵۲٫۲۲۴ کیلو گرام
وسق	۶۰ صاع = ۱۳۰٫۵۶۰ کیلو گرام
۵ وسق	۳۰۰ صاع = ۶۵۳ کیلو گرام
جریب	۴ قفیز = ۵۲٫۲۲۴ کیلو گرام

قفیز	۶ صاع = ۱۳۰۵۶ء۱۳ کیلو گرام
کیلاجا	غیلون (Gallon) = ۱½ صاع = ۲۸۲ء۲ کیلو گرام
ذراع (مکی)	۱۸۷ء۵۸ سینٹی میٹر
ذراع (دمشقی)	۲۰۳ء۲۱ سم تقریباً (ذراع دمشقی مدینہ منورہ کا پیمانہ تھا)

شرح اور ان کا اختلاف:

(الف) مذکورہ بالا شرعی اوزان کے متبادل تقریباً متفق علیہا ہیں مگر بعض مُحقّقین مختلف متبادل بھی لاتے ہیں مثلاً:

مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف (King Fahd Complex for the prenting of the Holy Quran) سے شائع شدہ قرآن کریم کی انگریزی ترجمہ (The Holy Quran) کی مسرد (Glossory) میں ان شرعی اور ان کی شرح تبادلہ (Rate of Exchange) مختلف ہے مثلاً:

❶ درہم = ۱/۱۲ اوقیہ = ۲۴۸ء۸ گرام (تقریباً)

❷ وسق ۶۰ صاع = ۱۳۵ کیلو گرام (تقریباً)

❸ صاع = ۴ مد = ۳ کیلو گرام (تقریباً)

(ب) اسی قرآن مجید کی مسرد (Glossory) کے مطابق چند مزید اوزان کی شرح تبادلہ:

❶ قیراط = ½ دانق = ۲۴۹ء گرام (تقریباً)

❷ دانق = ۱/۶ درہم = ۴۹۹ء گرام (تقریباً)

(ج) علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق چند اوزان کی شرح تبادلہ:

❶ جریب = ۲۵ سیر

❷ اردب (مصری) = ۲ من (۸۰ سیر)

(ملاحظہ ہو "الفاروق" عنوان: بیت المال کا خیال)

(د) ایک اور تحقیق کے مطابق اوزان کی شرح تبادلہ:

❶ ۲۰ مثقال یا ۷½ تولہ = ۸۷ء۴۷۹ گرام (سونے کا نصاب)

❷ ۲۰۰ درہم یا ۵۲½ تولہ = ۶۱۲ء۳۵ گرام (چاندی کا نصاب)

❸ ۵ اَوسق = ۶۷۳ء۵ کیلو گرام

(ضرب مومن، زکوٰۃ و عشر کے مسائل، مطبوعہ دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد، کراچی ۱۴۲۵ھ)

نوٹ: پہلی جدول میں دی گئی شرح تبادلہ اور اس جدول میں مذکور شرح تبادلہ کا فرق معمولی ہے زیادہ پریشانی کا معاملہ نہیں، البتہ علم کے لیے ان کا تذکرہ ضروری تھا۔

مصادر و مراجع

نوٹ: ❶ ''اسلام کا اقتصادی'' کی تیاری میں جن ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ وہ دو حصوں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں ایک وہ جنہیں فاضل مصنف رحمہ اللہ نے دوران تدوین کتاب زیر مطالعہ رکھا، دوسرے وہ جنہیں احقر مرتب نے ضروری اضافوں کے لیے پڑھا اور ان سے مدد لی۔ اس طرح کتاب کے مصادر و مراجع کی ایک طویل فہرست ہے، جو اس قسم کی علمی و تحقیقی کتاب کے لیے ضروری بھی تھی۔

❷ احقر نے قارئین کرام کی آسانی کے لیے ان مصادر کتاب کو مختلف مضامین کی وجہ سے الگ الگ عنوانات کے تحت لکھ دیا ہے، البتہ مصنفین کتب کے اسماء گرامی میں حروف تہجی کی رعایت نہیں رکھی گئی، اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

❸ یہ فہرست تقریبا ان ماخذوں کی ہے، جن کے حوالہ جات اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

(الف) تفسیر قرآن کریم و متعلقات تفسیر

- ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر رحمہ اللہ (۷۰۱ھ - ۷۷۴ھ): تفسیر القرآن العظیم مشہور بہ تفسیر ابن کثیر۔
- ابن حبان، محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حبان اندلسی غرناطی رحمہ اللہ: البحر المحیط
- آلوسی، علامہ محمود شکری آلوسی رحمہ اللہ: روح المعانی
- آزاد، مولانا احمد ابوالکلام رحمہ اللہ: ترجمان القرآن، لاہور
- زمخشری، قاسم بن محمود بن عمر جار اللہ زمخشری خوارزمی رحمہ اللہ: الکشاف، مطبوعہ مصر ۱۳۵۴ھ
- الشوکانی، محمد بن علی بن محمد الشوکانی رحمہ اللہ: فتح القدیر
- مولانا تھانوی، محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ: بیان القرآن

- طبری رحمہ اللہ، علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن مشہور بہ تفسیر طبری
- علامہ رشید رضا رحمہ اللہ: تفسیر المنار، مطبوعہ بیروت
- قرطبی، عبد اللہ محمد بن احمد رحمہ اللہ: الجامع لاحکام القرآن
- امام جصاص، ابوبکر احمد ابن علی الجصاص الرازی رحمہ اللہ: احکام القرآن
- صارم، مولانا عبد الصمد صارم الازہری رحمہ اللہ: تاریخ التفسیر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۹ء

(ب) حدیث و متعلقات حدیث

- بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ: الجامع الصحیح، صحیح بخاری
- مسلم، ابو الحسن مسلم بن حجاج القشیری نیشاپوری رحمہ اللہ: صحیح مسلم
- ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ترمذی رحمہ اللہ: جامع ترمذی
- ابوداود، سلیمان بن اشعث سجستانی رحمہ اللہ: سنن ابی داود
- نسائی، قاضی احمد بن شعیب بن علی نسائی رحمہ اللہ: سنن نسائی
- ابن ماجہ، علامہ ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی رحمہ اللہ: سنن ابن ماجہ
- مالک، امام مالک بن انس بن مالک اصبحی رحمہ اللہ: موطا
- ابن حنبل، ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی رحمہ اللہ: مسند احمد، تحقیق احمد شاکر ۱۵ اجزاء مطبوعہ قاہرۃ، ۱۹۵۹ء
- نووی، امام ابوبکر یحییٰ بن اشرف النووی رحمہ اللہ: ریاض الصالحین
- البیہقی، ابوبکر احمد بن حسین البیہقی رحمہ اللہ: السنن الکبری
- بغوی و تبریزی، علامہ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی رحمہ اللہ، شیخ ولی الدین محمد خطیب تبریزی رحمہ اللہ، مشکوۃ المصابیح
- ابن قیم، علامہ شمس الدین بن قیم جوزیہ رحمہ اللہ: زاد المعاد
- ابن قیم جوزیہ: اعلام المعوقین عن رب العالمین
- برہان پوری، علامہ علاؤ الدین علی المتقی بن حسام الدین برہان پوری رحمہ اللہ: کنز العمال
- حاکم، ابو عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ: المستدرک

- امام محمد، محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ: موطا، مع التعلیق المجد از مولانا عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ، مطبع مجتبائی، لاہور، پاکستان
- ابن حجر، علامہ حافظ احمد بن علی محمد ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: فتح الباری، مطبوعہ قاہرۃ ۱۹۵۹ء
- ـــــــ نخبۃ الفکر فی اصول الحدیث
- علامہ عینی، بدر الدین ابو محمود بن احمد العینی رحمہ اللہ: عمدۃ القاری (شرح صحیح بخاری)
- الہیثمی، نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی رحمہ اللہ: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، مطبوعہ مکتبہ القدسی، قاہرۃ، ۱۳۵۲ء
- ابو یعلی، احمد بن علی ابو یعلی التمیمی رحمہ اللہ: مسند (از الجامع الصغیر) مکتبہ شہید علی باشا رحمہ اللہ شمارہ ۵۶۴، استنبول، ترکی (مخطوطہ)
- طبرانی رحمہ اللہ: المعجم الاوسط، مکتبہ قرۃ جلبی زادہ، شمارہ ۷۲، ۷۳ مخطوطہ، استنبول، ترکی
- علامہ خطابی رحمہ اللہ: احمد بن محمد بن ابراھیم بن خطاب ابو سلیمان: معالم السنن (شرح سنن ابی داود) ۸ اجزاء، تحقیق محمد حامد فقی، مطبوعہ قاہرۃ، ۱۹۴۸، ۱۹۴۹
- علامہ کشمیری، سید محمد انور شاہ مولانا کشمیری رحمہ اللہ: العرف الشذی شرح جامع الترمذی
- ابن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) مصنف، مکتبہ مدینہ شمارہ نمبر ۳۳۳، ۳۳۴ استنبول، ترکی
- الدارقطنی، حافظ علی بن عمر الدارقطنی رحمہ اللہ: السنن، مطبع انصاری، دہلی
- الاعظمی، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، مطبوعہ ریاض، سعودی عرب
- ناشف، شیخ منصور علی ناشف رحمہ اللہ: التاج الجامع الاصول
- الجزری، فخر الدین ابن الاثیر الجزری رحمہ اللہ: النہایۃ فی غریب الحدیث، مطبوعہ مصر، ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء
- اصبہانی، علامہ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی رحمہ اللہ (م ۴۳۰ھ) حلیۃ الاولیاء فی الحدیث

- السباعی، استاذ مصطفی السباعی رحمہ اللہ: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، قاہرۃ، ۱۳۸۰ھ

فقہ و متعلقات فقہ

- مرغینانی، برہان الدین مرغینانی رحمہ اللہ: الہدایۃ شرح بدایۃ المبتدی، مطبع خیریہ، قاہرۃ ۱۳۲۶ھ، ۱۳۲۷ھ
- سرخسی، ابوبکر محمد ابن شمس الدین ابی سہل شمس الائمۃ رحمہ اللہ: المبسوط شرح الکافی، مطبوعہ مصر ۱۳۳۱ھ
- الکاسانی، علاؤ الدین الکاسانی رحمہ اللہ: بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مصر ۱۳۲۷ھ، ۱۳۲۸ھ
- الحصکفی، محمد علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: الدر المختار شرح تنویر الابصار، مطبوعہ مصر
- نسفی، حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ ابن احمد ابن محمود النسفی رحمہ اللہ: کنز الدقائق
- ابن عابدین، محمد امین ابن عابدین ابن عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ: رد المختار، دار السعادۃ، قاہرۃ، ۱۳۲۴ھ
- ابن نجیم، زین العابدین ابن نجیم رحمہ اللہ: بحر الرائق شرح کنز الدقائق، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۴ھ
- قاضی خان، علامہ فخر الدین حسن بن محمود اوز جندی رحمہ اللہ: فتاویٰ قاضی خان، کلکتہ ۱۳۴۳ھ برحاشیہ فتاویٰ عالمگیری
- عالمگیر، محی الدین اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ: فتاویٰ عالمگیریہ، فتاویٰ ہندیۃ
- حنفی، سید علی زادہ حنفی رحمہ اللہ: شرح شرعۃ الاسلام
- فتاویٰ عزیزی، مطبع مجتبائی، دہلی
- امام مالک بن انس رحمہ اللہ: المدونۃ الکبریٰ (بروایت سحنون رحمہ اللہ) مطبع السعادۃ، قاہرۃ، ۱۳۲۳ھ
- ابن رشد الحفید رحمہ اللہ: کتاب المقدمات والمہدات علی المدونۃ الکبریٰ
- ـــــ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد (المقتصد) مطبوعہ قاہرہ
- امام شافعی، امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ: کتاب الام، بولاق، قاہرۃ، ۱۳۲۵ھ

- ابن قدامہ، موفق الدین ابن قدامہ رحمہ اللہ: کتاب المغنی، مطبع المنار، طبع دوم
- ابن حزم، محمد بن علی ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ: المحلی
- الشوکانی، محمد بن علی بن محمد الشوکانی رحمہ اللہ: نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، مطبع حلبی، قاہرۃ ۱۳۴۸ھ
- الجزیری، عبد الرحمٰن الجزیری رحمہ اللہ: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ
- خضری، علامہ محمد خضری بے: تاریخ التشریع الاسلامی، مطبعۃ دار احیاء الکتب العربیۃ، قاہرۃ، ۱۹۳۶ء
- محمصانی، ڈاکٹر صبحی رجب محمصانی رحمہ اللہ: فلسفۃ التشریع فی الاسلام، مطبوعہ بیروت، دار العلم للملایین، ۱۹۶۱ء
- شیخ الہند، مولانا محمود الحسن شیخ الہند رحمہ اللہ: ایضاح الادلۃ، مطبوعہ ایچ، ایم، سعید کمپنی، کراچی ۱۴۰۷ھ

اسلامی معاشیات و عام معاشیات و متعلقات

- ابو یوسف، امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری رحمہ اللہ: کتاب الخراج، مکتبہ العلمیہ، لیک روڈ، لاہور
- القرشی، امام یحییٰ ابن آدم القرشی رحمہ اللہ: کتاب الخراج، مطبوعہ لیدن ۱۹۵۸ء
- ابو عبید، ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ: کتاب الاموال، تحقیق محمد حامد فقی، مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ
- ابن زنجویۃ، حمید ابن زنجویہ رحمہ اللہ: کتاب الاموال، مطبوعہ مرکز الملک فیصل للدراسات الاسلامیہ، ریاض
- ڈاکٹر محمد یوسف الدین رحمہ اللہ: اسلام کے معاشی نظریے، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد (ہند)، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء
- ڈاکٹر غفاری، نور محمد: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــــ اسلام کا معاشی نظام، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی

- ـــــ اسلام کا نظام تکافل اجتماعی، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــ اسلام کا قانون تجارت، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــ اسلام کا قانون محاصل، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کمزوروں اور غریبوں کے وکیل، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- البغدادی، محمد بن حبیب البغدادی رحمہ اللہ: المحبر، مطبوعہ حیدر آباد (ہند)، ۱۳۶۱ھ
- تھانیسری، مولانا جلال الدین رحمہ اللہ: تحقیق آراضی ہند
- قریشی، ڈاکٹر انور اقبال قریشی رحمہ اللہ: اسلام اور سود، مکتبہ الہانیہ، لاہور کینٹ، لاہور
- مقریزی، علامہ تقی الدین ابو محمد مقریزی رحمہ اللہ: النقود الاسلامیۃ المسمی شذوز العقود فی ذکر النقود، مطبوعہ نجف، عراق
- نقشبندی، نصیر الدین محمود نقشبندی رحمہ اللہ: الدینار الاسلامی فی المتحف العراقی، مطبوعہ بغداد، عراق
- ذاکر حسین، ڈاکٹر (سابق صدر جمہوریہ ہند): معاشیات، مقصد و منہاج
- اصطخری، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی رحمہ اللہ: مسالک الممالک، مطبوعہ لیدن، ۱۸۷۰ء

معیشت و سیاست و اجتماع

- جوزیہ، علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ: الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشریعۃ، مطبوعہ مصر، ۱۳۱۷ھ
- ابن قتیبہ، ابو محمد عبد اللہ بن مسلم دینوری: الامامۃ والسیاسۃ، مطبوعہ مصر
- الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد ابن حبیب الماوردی رحمہ اللہ: الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ، مطبع محمودیہ، قاہرۃ، ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء
- کرد، محمد علی کرد رحمہ اللہ: الاسلام والحضارۃ العربیۃ، مطبوعہ قاہرہ
- ابن تیمیہ، تقی الدین ابو العباس احمد ابن تیمیہ رحمہ اللہ: السیاسۃ الشریعۃ، مطبوعہ مصر
- الحسبۃ فی الاسلام مطبوعہ، ریاض ۱۹۸۰ء
- حمید اللہ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ: الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی، مطبوعہ لجنۃ التالیف

والترجمۃ، قاہرہ، ۱۹۴۱ء

- علامہ طنطاوی: نظام العالم والامم
- کتانی، عبدالحئ کتانی: التراتیب الاداریۃ، اردو ترجمہ از رضی الدین فخری، دارالقرآن، کراچی ۱۹۹۱ء
- الفراء، قاضی ابویعلی الفراء: الاحکام السلطانیۃ، مطبوعہ بیروت، ۱۹۴۷ء
- ابو حامد غزالی: التبر المسبوک، مطبوعہ قاہرۃ
- ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام: قواعد الاحکام فی مصالح الانام، مطبوعہ قاہرۃ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و تاریخ اسلام و تاریخ عالم

- ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابو الفدا اسماعیل بن عمر ابن کثیر رحمہ اللہ: الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موسسۃ علوم القرآن، دمشق، بیروت، دارالقلم، دمشق بیروت ۱۳۹۹ھ، ۱۴۰۰ھ
- البدایۃ والنہایۃ، ۱۴اجزاء مطبوعہ قاہرۃ ۱۹۳۲ء
- ابن سعد، محمد ابن سعد کاتب الواقدی رحمہ اللہ: الطبقات الکبری، مطبوعہ بیروت، دار صادر ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء
- ابن جریر، علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ: تاریخ الامم والملوک معروف بہ تاریخ طبری، مطبوعہ لیدن،
- ابن ہشام، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ہشام رحمہ اللہ: السیرۃ النبویۃ، مطبوعہ مصر
- جزری، امام فخرالدین بن اثیر جزری رحمہ اللہ: الکامل فی التاریخ، دارالکتاب، بیروت ۱۹۸۳ء
- ابن اثیر، علامہ عزالدین ابوالحسن علی بن محمد جزری ابن اثیر رحمہ اللہ: اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ
- ابن حجر، علامہ احمد بن علی بن محمد المعروف بابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: اصابۃ فی تمیز الصحابۃ رحمہ اللہ تعالیٰ
- ابن عبدالبر، علامہ حافظ ابن عبدالبر المالکی الاندلسی رحمہ اللہ: الاستیعاب فی اسماء الاصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم، مطبعۃ نہضۃ، قاہرۃ

- بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری رحمہ اللہ: فتوح البلدان، مطبوعہ قاہرۃ، ۱۹۵۶ء
- ـــــ کتاب الاشراف، تحقیق محمد حمید اللہ قاہرۃ، ۱۹۵۹ء
- ابن جوزی، علامہ شمس الدین بن علی بن محمد الجوزی رحمہ اللہ: صفۃ الصفوۃ
- یاقوت حموی، امام شہاب الدین ابو عبد اللہ یاقوت حموی رحمہ اللہ: معجم الادباء، مطبع رافع، قاہرۃ
- ...... معجم البلدان
- سیوطی، علامہ جلال الدین محمد بن احمد سیوطی رحمہ اللہ: حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرۃ، مطبوعہ قاہرۃ
- ـــــ تاریخ الخلفاء
- محب طبری: الریاض النضرۃ فی فضائل العشرۃ، مکتبہ ندوۃ العلماء، لکھنو، ہند
- ابن عبد الحکم، ابو محمد عبد اللہ ابن عبد الحکم رحمہ اللہ: سیرۃ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ، قاہرۃ ۱۹۷۲ء، دمشق ۱۹۶۶ء
- محمد ابن طولون: اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین، مطبع القدسی، دمشق، شام
- ندوی، ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ: الرسول الاعظم صلی اللہ علیہ وسلم، لکھنو، ہند ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۷۵ء
- شبلی نعمانی: الفاروق، مطبوعہ ملتان، پاکستان
- ہیکل، محمد حسین ہیکل رحمہ اللہ: الفاروق عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مطبوعہ قاہرہ
- ابن الوری، زین العابدین عمر ابن الوری رحمہ اللہ: تتمۃ المختصر فی اخبار البشر، مطبوعہ مصر
- مقریزی، علامہ تاج الدین احمد بن علی مقریزی رحمہ اللہ: الخطط والآثار
- یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب بن واضح الکاتب یعقوبی رحمہ اللہ: تاریخ، مطبوعہ نجف، عراق ۱۹۶۴ء
- ـــــ کتاب البلدان، مطبوعہ لیدن ۱۸۹۱ء
- ابن جوزی، جمال الدین ابن جوزی رحمہ اللہ: سیرۃ العمرین، مطبع رحمانیہ، قاہرہ
- ـــــ مناقب امام احمد بن حنبل، مطبوعہ قاہرۃ، ۱۳۹۴ھ

- السہمی، حمزہ بن یوسف السہمی رحمہ اللہ: تاریخ جرجان، مطبوعہ حیدر آباد، ہند، ۱۳۶۹ھ
- ابن ندیم: الفہرست، تحقیق فلوجل لیبزج، ۱۸۷۱ء
- الزرکلی، خیر الدین: الأعلام، مطبوعہ مکتبہ عربیۃ، دمشق
- ابن خلکان، احمد بن محمد بن ابوبکر خلکان رحمہ اللہ (م ۶۸۱ھ) وفیات الاعیان، تحقیق احسان عباس، دار الثقافۃ، بیروت
- اصبہانی، ابو نعیم احمد بن عبد اللہ بن احمد اصبہانی رحمہ اللہ (م ۴۳۰ھ): حلیۃ الاولیاء
- فواد سزکین: تاریخ التراث العربی (عربی ترجمہ از فہمی حجازی اور فہمی ابو الفضل)، مطبوعہ الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، قاہرۃ، ۱۹۷۷ء
- حاجی خلیفہ (ملا کاتب جلبی) مولی مصطفی بن عبد اللہ قسطنطنی رومی حنفی رحمہ اللہ: کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۲ء
- محمد بن یحییٰ بن ابی بکر رحمہ اللہ: التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رحمہ اللہ، بیروت ۱۹۶۴ء
- ذہبی، علامہ حافظ شمس الدین ابو عبد اللہ الذہبی رحمہ اللہ: تاریخ الاسلام، مطبوعہ، مکتبۃ القدسی، قاہرۃ، ۱۳۶۸ء
- ـــــ تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد، (ہند)
- .... کتاب دول الاسلام فی التاریخ، حیدر آباد، ہند
- .... سیر اعلام النبلاء، دار الکتب الظاہریۃ، دمشق
- الفسوی، یعقوب بن سفیان الفسوی رحمہ اللہ: تاریخ، مکتبہ روان کشک، رقم ۱۵۵۴
- المزی، علامہ یوسف بن الزکی عبد الرحمٰن المزی رحمہ اللہ: تہذیب الکمال، دار الکتب المصریۃ، قاہرۃ
- ارشد، عبد الرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ، لاہور
- ابن حزم رحمہ اللہ: طوق الحمامۃ، مطبوعہ مصر
- ابو زہرۃ، شیخ محمد ابو زہرۃ رحمہ اللہ: حیاۃ ابن حزم رحمہ اللہ، مطبوعہ مصر
- البعلبکی، منیر بعلبکی: المورد (انگلیزی عربی) جز معجم الاعلام
- شہرستانی رحمہ اللہ: الملل والنحل، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۷ھ، ۱۳۴۸ھ

- رضوی، سید محبوب: مکتوبات نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)، مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۵ء
- احمد شوقی، اشعر الشعراء، الھمزیۃ النبویۃ، مطبوعہ مصر و لاہور

مختلف علوم پر جامع کتب

- امام غزالی، امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی رحمہ اللہ: احیاء علوم الدین: مطبع عثمانیہ، مصر ۱۹۳۳ء
- شاہ ولی اللہ، شیخ الاسلام احمد ولی اللہ بن عبد الرحیم الدہلوی رحمہ اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ مصر
- ابن قتیبہ، ابو محمد عبداللہ بن مسلم دینوری رحمہ اللہ: کتاب المعارف، مطبع اسلامیہ، مصر، ۱۹۳۴م
- مصری، علی پاشا مصری رحمہ اللہ: خواطر فی القضاء والاقتصاد والاجتماع، مطبوعہ مصر
- وجدی، استاد محمد فرید وجدی رحمہ اللہ: دائرۃ المعارف القرن العشرین
- زبیدی، سید مرتضیٰ زبیدی رحمہ اللہ: اتحاف السادۃ المتقین (شرح احیاء علوم الدین)
- سید قطب: العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، مطبوعہ مصر
- بستانی، معلم بطرس بستانی: دائرۃ المعارف، مطبوعہ ایران
- القرضاوی، الاستاذ محمد یوسف القرضاوی: الحلال والحرام فی الاسلام
- ـــــــ فقہ الزکاۃ

علمی مجلات و رسائل

- البلاغ (ماہوار)، دار العلوم کراچی، شمارہ نومبر ۱۹۸۸ء
- بحث ونظر (سہ ماہی)، پھلواری شریف، پٹنہ، ہند، شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۹۰ء
- بینات (ماہوار)، جامعۃ اسلامیۃ بنوریۃ، بنوری ٹاؤن، کراچی، شمارہ ۳، جلد ۱۸ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ / مئی ۱۹۷۱ء
- رسالہ، جامع دہلی، شمارہ فروری ۱۹۳۹م
- ترجمان القرآن، جماعت اسلامی، اچھرہ لاہور، شمارہ و جلد ۳۳، تعداد ۱، ۲، ۳ ماہ اکتوبر ۱۹۴۹ء

- معارف فیچر سروس، اسلامک ریسرچ اکادمی، فیڈرل بی ایریا، کراچی
- منہاج (سہ ماہی) اسلامی معیشت نمبر شعبہ تحقیق، دیال سنگھ لائبریری، لاہور جلد ۱۰، ۱۹۹۲ء

دیگر مذاہب کی کتب

- انجیل، مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، لاہور ۱۹۵۶ء (British & Foreign Bible Society, Lahore, 1956)
- توراۃ، مطبوعہ، مذکورہ بالا سوسائٹی
- حنا، ڈاکٹر یوسف حنا نصر اللہ: الکنز المرصود فی قواعد التلمود
- سرسوتی، دیانند سرسوتی: منوشاستر
- آتوبا آشور آتوبا: ہندوستانی تمدن

BIBLIOGRAPHY

- Bosworth Smith, Mohammad and Mohammadanism, London, 1976.
- Cambridge History of Islam, Cambridge, 1970.
- Ghifari, Dr Noor Muhammad, Book an Finance (English Translation of Abu Ubdaid,s Kitab al – Amwal), National Hijrah Council, Islamabad, 1991.
- Encyclopaedia of Religion and Ethics, 1939.
- Hamidullah, Dr. Muhammad, Introduction to Islam, Dawah Academy, International Islamic University, Islamabad.
- Imran Ahsan Khan Nyazee, Islamic Jurisprudence, International Institute of Islamic Thought, Islamabad, 2000.
- Muir, Sir William, Annals of the Early Caliphate, London, 1882.
- Philp k. Hitti Dr; A Short History of the Arabs, London, 1965.
- Siddiqi, S. A. Public Finance In Islam, Lahore, 1968.
- The Federal Shariat Court, Pakistan, Select Judgements, 1992.
- Dr. S.M. Hasan- uz- Zaman, The Economic Functions of the Early Islamic State, International Islamic Publications, Nazimabad, Karachi, 1981.

مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی کراچی

۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی (صدارتی ایوارڈ یافتہ)
مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

۲) اسلام کا معاشی نظام — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

۳) موجودہ نظام انشورنس اور اسلام کا نظام تکافل — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

۴) تجارت کے اسلامی اصول وضوابط — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

۵) حضرت ابوذر غفاریؓ — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مظلوم صحابہؓ — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

۷) نیک اعمال کے فضائل، فوائد، ثمرات، برکات — حافظ ضیاء الدین المقدسی
ترجمہ وفوائد پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

۸) شہادت حضرت حسینؓ — امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

۹) بکھرے موتی — مولانا محمد یونس پالنپوری

اِدارۃُ الانور
دوکان نمبر 2 انور مینشن
بالمقابل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵
فون: ۴۹۱۴۵۹۶_۴۹۱۹۶۷۳